متھلا، مدھوبنی اور قصبہ 'یکھتہ'

متھلا کی مختصر تاریخ

ہمالیہ کی گود میں آباد ایک بڑے علاقے کو متھلا کہا جاتا ہے، جو پورب میں کوسی، پچھم میں گنڈک، شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں گنگا تک پھیلا ہوا ہے، یہ اپنی قدیم تاریخ، زبان، ادب، تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے پورے ملک میں منفرد حیثیت رکھتا ہے، اس کی تاریخ بہت پرانی ہے، متھلا کو ترہت بھی کہا جاتا ہے، قدیم دور میں تیر بھگت کے نام سے بھی یہ علاقہ جانا جاتا تھا، مؤرخین کی تحقیق کے مطابق متھلا کا وجود ۳۰۰۰ قبل مسیح ہوا، منشی بہاری لال فطرت نے ہندوؤں کی مذہبی کتاب بشن پران کے حوالہ سے لکھا ہے کہ راجہ نیمی مہاراج اکچھواک سورج بنسی کے بڑے بیٹے تھے، جو ترہت کے حکمراں تھے، ان کے فرزند راجہ متھی کے نام پر یہ علاقہ متھلا کہلایا، (آئینۂ ترہت، ص:۸، حیات مجاہد، ص:۳۲) یہ راجہ جنک کی راجدھانی رہی ہے، اس بادشاہ کے حوالہ سے اس علاقہ کو بڑی شہرت ملی، راجہ جنک کا زمانہ قبل مسیح کا ہے، یہ ویدک علم اور ویدک ثقافت کا مرکز سمجھا جاتا تھا، یہاں ویدک علم کے بہت سے نامور اہل علم گزرے ہیں، ودیاپیٹھ جو میتھلی کے شہرہ آفاق شاعر گزرے ہیں، اسی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

پروفیسر آغا عماد الدین احمد متھلا کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> متھلا قدیم ہندوستان کا ایک شہر اور قرون وسطی کی ایک سلطنت تھا، آٹھویں اور ساتویں صدی قبل مسیح کا دور اس شہر (غالباً جنک پور) کے عروج کا دور تھا، متھلا سلطنت ویدیہا کا پایۂ تخت تھا، یہ سلطنت شمالی بہار اور جنوبی نیپال پر محیط تھی، اس کے شمال میں کوہ ہمالیہ، جنوب میں دریائے گنگا، مغرب میں دریائے گنڈک اور مشرق میں دریائے کوسی واقع ہے۔

> رامائن کی مرکزی خاتون کردار، راج کماری سیتا، متھلا کے راجہ جنک کی بیٹی تھی، اس وقت کے متھلا شہر کی تعمیر اعلیٰ منصوبہ بندی کے تحت عمل میں لائی گئی تھی، یہ اپنے زمانے کا وسیع اور کشادہ شہر تھا، جس کو اپنے حسین باغات اور دلکش عمارات پر بجا طور پر فخر تھا۔ (وادی بالان ص:۱۲)

یہاں الگ الگ وقتوں میں الگ الگ متعدد خاندانوں کی حکومت رہی ہے، جن میں راجہ جنک خاندان کے علاوہ منرین خاندان، سوریہ خاندان، گپت خاندان، تارشاہ خاندان، پالا خاندان قابل ذکر ہیں، ڈاکٹر منظر سلیمان (دربھنگہ) نے متھلا کی تاریخ پر تفصیلی مقالہ لکھا ہے، جس میں متھلا کے حکمراں اور راجاؤں کا عہد بہ عہد تذکرہ کیا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق ۱۰۸۹ء میں نانديو کرناٹک سے یہاں آئے اور ایک مضبوط حکومت قائم کی، انہوں نے سمراوھ گڑھ (نیپال) کو اپنی پایہ تخت قرار دیا، ۱۱۴۷ء میں گنگادیو بادشاہ ہوئے، انہوں نے دربھنگہ کو اپنی راجدھانی بنائی، ۱۱۸۷ء میں نرسنگھ باشاہت کی کرسی پر متمکن ہوئے، انہی کے دور میں عظیم سپہ سالار محمد بن بختیار خلجی نے اس علاقہ پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی، اس طرح مختلف بادشاہوں نے اس علاقہ پر حکمرانی کی، انگریزی دور حکومت میں بھی یہاں راج دربھنگہ کی باشاہت قائم رہی، ۱۸۱۵ء میں برطانوی حکومت نے چھتر سنگھ کو مہاراج کا خطاب دیا، ان کے بعد کئی مہاراجہ یہاں کی گدی نشیں ہوئے، آخری مہاراجہ کامیشور سنگھ ہوئے، جو مہاراج دھیراج کہلائے، ۱۹۶۲ء میں ان کی موت کے ساتھ دربھنگہ راج کا خاتمہ ہو گیا۔

(متھلا کا گوروی اتہاس (ہندی) از: ڈاکٹر منظر سلیمان، سوونیر ٹینس بال کرکٹ ایسوسی ایشن، دربھنگہ)

ڈاکٹر امام اعظم صاحب (مدیر سہ ماہی تمثیل نو، دربھنگہ) یہاں کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> جغرافیائی خاکہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو متھلا کی سرزمین پر پہاڑی سلسلے تو نظر نہیں آئیں گے، یہ ہمالیہ کی ترائی میں بسا ہوا ایک ایسا علاقہ ہے جسے میدانی علاقہ کہا جاتا ہے، اس میدانی علاقہ میں باغ اور کھیتوں کے دراز سلسلے نظر

آئیں گے، اس کے علاوہ ندیوں کے بھی سلسلے یہاں موجود ہیں، کم محنت میں کاشتکاری، باغبانی یہاں کے لوگ کرتے رہے ہیں، قدیم زمانہ ہی سے دیہی علاقوں میں پختہ مکانات بنانے کا سلسلہ نہیں رہا ہے، کیونکہ یہ علاقہ عموماً سیلاب کی زد میں رہتا ہے، ندیاں اپنے راستے بھی بدل دیتی ہیں، یہ علاقہ کافی زرخیز ہے، یہاں کے لوگ نرم اور میٹھی زبان بولتے ہیں، جسے میتھلی کہا جاتا ہے، یہ علاقہ روحانی مرکز رہا ہے، یہاں بڑی تعداد میں خانقاہیں اور مٹھ موجود ہیں، سنسکرت کے مہا کاویوں میں اس علاقہ کی نشاندہی کی گئی ہے، سیتا کا سوئمبر بھی اسی علاقہ میں رچا گیا تھا، یہاں کے لوگ عام طور پر پکا ہوا کھانا عموما پسند نہیں کرتے، چورا اور دہی ان کی مرغوب غذا ہے، برہمن عام طور پر مانس اور مچھلی نہیں کھاتے لیکن بنگال سے ملحق ہونے کے سبب یہاں کے سوتری اور میتھلی برہمن بنگال کے اثر سے مچھلی کھانا پسند کرتے ہیں، اور سادہ زندگی گزارتے ہیں، پاگ، پان، مچھلی اور مکھانا کے لئے بھی یہ علاقہ مشہور ہے، یہاں کے آم بھی شہرت کے حامل ہیں، یہاں کے قدیم علوم وفنون میں زائچہ بنانا، علم نجوم میں دلچسپی رکھنا اور سنسکرت کو اوڑھنا بچھونا بنانا عام ہے، برہمن کلچر حاوی ہونے کے سبب یہاں ''ورن ویوستھا'' ذات پات پر سماج کا ڈھانچہ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، متھلا کا قلب جو پنڈول کے گرد و نواح کا علاقہ مانا جاتا ہے، وہاں ''اُگنا'' نام کا ایک شخص بے حد مشہور ہوا جسے شیو کا اوتار مانا جاتا ہے، اور اس کی شاعری میں گہرے تشبیہی امکانات اور نقوش کے پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں، ودیا پتی کے نام سے موسوم اس شخص نے ایک ادبی تحریک کو جنم دیا جو اس علاقہ کی علاقائی زبان کے لئے ایک ایسا نمونہ ہے جس سے بعد میں آنے والی نسل بھی فیضیاب ہوتی رہی، یہ علاقہ اپنی پینٹنگس کی وجہ سے بھی دنیا بھر میں مشہور ہے، اور 'متھلا پنٹنگس' کے نام سے

معروف ہے، پنٹنگ کی دنیا میں اسے اہم مقام حاصل ہے، یہاں کی خواتین گھر کی دیواروں پر اس کا نمونہ بناتی ہیں، یہ علاقہ کثیر آبادی کا علاقہ ہے، یہ بہار کے شمال میں ہے، لیکن جنوبی بہار کے مقابلہ میں یہاں آبادی زیادہ گھنی ہے، یہاں برسوں سے برہمنوں کی بالادستی رہی ہے، اس علاقہ میں یونانیوں کا بھی اثر رہا، مغل بھی آئے، راجے مہاراجے بھی رہے، زمینداروں کا بھی دور دورہ رہا، لیکن جنوبی بہار کے مقابلہ میں یہاں غربت ہونے کے باوجود اس طرح کی بےچینی اور تشدد کا ماحول اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کی کوئی لہر تیز نہیں رہی، آج بھی کچھ نکسلی تنظیمیں یہاں سرگرم ہیں، مگر نیپال کی طرح ماؤوادیوں کی طرز پر کوئی تحریک نہیں ابھری، کثیر آبادی و غربت کے باوجود مغلوں اور فرنگیوں کے آنے کے بعد بھی یہاں امن وشانتی برقرار رہی اور آج بھی برقرار ہے۔ (سہ ماہی تمثیل نو، دربھنگہ، ص:۳)

مختلف زمانے میں متھلا کے مختلف شہروں کو تاریخی حیثیت حاصل رہی، بہت سے علاقے اپنی گوناں گوں خصوصیات کے لحاظ سے مشہور ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ جملہ ''بلدہ بہار مجمع علماء بود'' (انفاس العارفین ص:۶۲، بحوالہ محی الملۃ والدین، مقدمہ:۲۲) صوبہ بہار کے لئے باعث افتخار ہے اور اس کے علمی مقام ومرتبہ کو سند اعتبار بخشتا ہے، وہیں دربھنگہ کی علمی حیثیت کے لئے ابوالفضل فیضی کا اک جملہ بھی قابل فخر اور باعث ناز ہے، اکبر کے وزیر باتدبیر ابوالفضل فیضی نے آئین اکبری میں دربھنگہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'دیرگاہ بن گاہ مرکز دانش ہند' (آئین اکبری ج۲، ص:۶۷)

مدھوبنی۔ تاریخ اور ثقافت

بہار کے شمال مشرق میں پہلے دو بڑے اضلاع تھے، دربھنگہ اور مظفرپور، بعد میں ان دونوں سے کئی اضلاع وجود میں آئے، مثلاً مدھوبنی، سیتامڑھی، سمستی پور، وغیرہ۔

مدھوبنی، دربھنگہ کے شمال میں نیپال سرحد سے متصل علاقہ ہے، ۱۹۵۶ء میں یہ سب

ڈویژن کی حیثیت سے وجود میں آیا، اور ۱۹۷۲ء میں ضلع کا درجہ ملا، اس کا کل رقبہ ۳۵۰۱ مربع کیلومیٹر ہے، اس ضلع کے شمال میں نیپال، مغرب میں سیتا مڑھی، مشرق میں سوپول وسہرسہ اور جنوب میں دربھنگہ آباد ہے۔

مدھوبنی کا نام مدھوبنی کیوں پڑا؟ اس کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں کوسی ندی بہتی ہے، جس کا پرانا نام مدھوشروانا تھا، اسی کی طرف نسبت ہے، اسے ہندو خواتین کے ایک تہوار مدھوشراونی سے بھی وابستہ قرار دیا جاتا ہے، جسے نوعروسی دلہن شادی کا پہلا سال مناتی ہے، اس میں برہمن اور کائستھ گھرانے کی خواتین دلچسپی لیتی ہیں، چند مؤرخین اسے راجا مادھوسنگھ کے نام پر آباد علاقہ بتاتے ہیں، جن کے وارثین کی کوٹھیاں آج بھی شہر مدھوبنی کے قریب واقع ہیں، ایسا مانا جاتا ہے کہ یہاں میٹھے پھل اور مدھو (شہد) کے بن (جنگلات) رہے ہوں گے، جب یہ علاقہ آباد ہوا تو اسی مناسبت سے اس کو مدھوبنی پکارا جانے لگا، جس کے معنی ہیں شہد کے جنگلات، متاخر الذکر تسمیہ پر بیشتر مؤرخین کا اتفاق ہے۔

(تمثیل نو، ص:۸۳، مضمون: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد)

دربھنگہ کی طرح مدھوبنی کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے، علم وادب اور خصوصاً ہندو مذہبی علم سے اس کا رشتہ بہت پرانا ہے، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد یہاں کے علم وادب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مدھوبنی زمانہ قدیم سے گہوارۂ علم وادب رہا ہے، تہذیبی وثقافتی اعتبار سے یہ خطہ متھلا کا نمائندہ شمار کیا جاتا ہے، مابعد ویدک عہد میں یہاں کے مفکروں اور رشیوں نے اپنی تصانیف سے ملک گیر پیمانہ پر اہل علم کو متاثر کیا، یاگیہ، ولکیہ، گوتم اور کپل منی کے اسمائے گرامی اس ضمن میں لئے جاسکتے ہیں، یہاں سنسکرت زبان وادب کی تعلیم کا عمدہ انتظام زمانہ قدیم سے تھا، اس وقت جب گروکل آشرم کا رواج تھا، ملک بھر سے کافی تعداد میں طلبہ اپنی تشنگی علم کی سیرابی کے لئے یہاں آتے تھے، ان کا قیام اپنے استاد (گرو) کے آستانے

> پر ہوا کرتا تھا، تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب وثقافت کی بقا اور کردار کی پختگی کا درس یہاں کی خصوصیات میں شامل تھا، یہاں کے فارغین قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ہندو مذہبی عقیدے کے مطابق وشوامتر کا گروکل اسی خطہ میں آباد تھا، جہاں رام کو تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا گیا، اس عہد میں مذہبی علوم کے ساتھ قواعد، یوگ، جیوتش، فلسفہ وغیرہ تعلیم کے اہم موضوعات تھے، مدھوبنی کے اجیٹھ میں اس طرح کا ایک اسکول تھا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہاں کالی داس معلم تھے، آج بھی اس جگہ کو کالی داس کی چوپاتی (کالی داسک چوپاتی) سے موسوم کیا جاتا ہے، عہد وسطی میں مدھوبنی کے بسفی بلاک گاؤں میں میتھلی زبان کے معروف شاعر ودیاپتی نے اپنے گیت سے اس خطہ ارض کو ملک گیر پیمانہ پر شہرت سے ہم کنار کیا، سنسکرت زبان وادب کی ترقی میں یہاں کے عالموں کا نام سرفہرست لیا جاتا ہے، اپاچی مشر، شنکر مشر، واچسپتی مشر وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، مدھوبنی ایک شاندار ماضی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ (تمثیل نو، ص:۸۳)

متھلا جس پنٹنگ کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت رکھتا ہے اس کی نمائندگی یہی شہر مدھوبنی کرتا ہے، یہ صرف مصوری ہی نہیں ہے بلکہ متھلا کی تہذیب وثقافت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرنے والا آرٹ ہے، یہ آرٹ نسل درنسل خواتین کے ذریعہ میتھلی معاشرہ میں منتقل ہوتا رہا ہے، اس میں فنکار بغیر کسی اسکیچ کے محض اپنی انگلی یا بانس کی کھپچی سے مختلف رنگوں سے تصاویر بناتے ہیں، ان تصاویر میں علامت سے بھی کام لیا جاتا ہے، جس میں یہاں کی عام زندگی بھرپور طور پر نمایاں ہوتی ہے، کوہور، جئے مالا اور دیوی دیوتاؤں کی مصوری عام طور سے کی جاتی ہے، اول الذکر کے اندر مرد وعورت کے جنسی معاملات کی تشبیہ ملتی ہے، اس مصوری میں علامتوں کا کمال بھی ملتا ہے، مثلاً پیلا رنگ زمین، لال رنگ آگ، سیاہ رنگ ہوا کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، سیتا دیوی، شانتی دیوی، باؤ دیوی متھلا مصوری کے لئے بین الاقوامی سطح

پر بڑے نام ہیں،ان سب کا تعلق مدھوبنی سے ہے،مدھوبنی پینٹنگ کی نمائش جاپان،امریکہ، فرانس،روس وغیرہ میں ہوتی رہتی ہے،مدھوبنی اس مصوری کی آماج گاہ ہے،اس کے مراکز مدھوبنی کے علاوہ بھوانی پور،لہیر یا گنج،رانٹی،راج نگر وغیرہ ہیں،دربھنگہ اور مدھوبنی ریلوے اسٹیشن اور بہار بھون میں اس کے عمدہ نمونے نصب ہیں۔(تمثیل نو،ص:۸۵)

ہندو مذاہب کے متعدد مقدس مقامات اس علاقے میں موجود ہیں،جن کی وجہ سے پورے ملک کے ہندو متھلا اور بالخصوص مدھوبنی کو تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں،کپلیشو راستھان فلسفی کپل منی کے نام پر آباد ہے،جو شیو مندر کے لئے معروف ہے،مشہور فلسفی گنگیشیا سے منسوب منگرونی بھی مذہبی مقامات میں اہمیت کا حامل ہے،یہاں کئی قدیم منادر موجود ہیں، یہیں سے تانبے کا پلیٹ کتبہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے،اجیٹھ کو کالی داس کے پاٹھ شالہ کے لئے تہذیبی اور ثقافتی طور پر مانا جاتا ہے،بسول اور پھلہر رام اور سیتا کے تعلق سے آباد ہے،پھلہر (پھول لوربن) سیتا کے ذریعہ پھول چننے کی جگہ سے مشہور ہے،نیم تاریخی اور ہندو میتھالوجی کی وجہ سے اس کی عقیدت بڑھ جاتی ہے،بسول میں وشومتر جو رام اور لکشمن کے استاد تھے،کا گروکل آشرم تھا،بسفی کا نام عالمی شہرت یافتہ شاعر ودیا پتی کی وابستگی کی وجہ سے ضلع کے لئے باعث افتخار ہے،پنڈول،منگرونی،شکری،نرہیا،سریسو وغیرہ اپنی تہذیب اور ثقافتی سرگرمیوں کے لئے متھلا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔(تمثیل نو،ص:۸۵)

مدھوبنی کے مسلم قصبات اور شخصیات

یہ تاریخ کا ایک پہلو ہے،مسلم ثقافت،دینی تعلیم،مذہبی وسماجی سیاسی شخصیات اور اردو زبان وادب کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ جہتیں بھی روشن نظر آتی ہیں،بحیثیت ضلع مدھوبنی کا وجود بعد میں ہوا ہے،اس لئے اس علاقہ کی شخصیات اور اداروں کا شمار بھی عموماً دربھنگہ کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔

یوں تو اس کی بیشتر آبادی دیہات اور قصبات پر مشتمل ہے،جہاں ہندو مسلم ملی جلی آبادی ہے،البتہ بہت سے مسلم اکثریتی قصبات بھی ہیں اور بعض قصبے ایسے بھی ہیں جہاں مسلم

تہذیب وثقافت کی رنگارنگی خوب نظر آتی ہے،اور جو اپنی تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہیں،ان میں یکہتہ وململ اور اس کے مضافاتی بستیوں کے علاوہ بھوارہ،شکری،بسفی، مدھے پور،سنگرام،نرہیا،پچھی،پرسونی،بانکا،اونسی،چندسین پور،رہیکا،سنولی،بنی پٹی وغیرہ کا نام خاص طور پر لیا جائے گا۔

اس علاقہ میں بھی ہر دور میں دینی،تعلیمی اور سیاسی وسماجی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں، بطور خاص یکہتہ کی طرح ململ کی سرزمین بھی ہر دور میں بڑی زرخیز رہی ہے،اور جس کثرت کے ساتھ ان دو قصبات میں شخصیات کا ذکر ملتا ہے،وہ ایک مثال ہے،مولانا نورالہدی نور (رفیق کار مولانا ابوالکلام آزادؒ) مولانا عبدالحفیظ حافظؔ،عقیل عاقلؔ،حکیم ظہور،رفیق بابو، صدیق نیرنگؔ وکیل،ماسٹر آفاق پریشاںؔ،شبیر احمد،عبدالمسعود برقؔ،ڈاکٹر حفظ الرحمٰن شبنمؔ،مطیع الرحمٰن احقر،ضیاء الرحمٰن ہاشم اور مولانا عبدالباقیؒ ماضی میں سرزمین ململ کے روشن ستارے تھے تو حال میں مولانا قمرالہدی قمر (امیر جماعت اسلامی بہار) مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری (عمید کلیۃ اللغۃ دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا وصی احمد صدیقی (مہتمم مدرسہ چشمۂ فیض) وسیم الرحمٰن (صفا گرلس ہائی اسکول) اور اکرام الرحمٰن فلاحی (الہلال اسلامک بینک دبئی) جیسی شخصیات سے اس کے بام ودر روشن ہیں،ان کے علاوہ مریٹھ کے ہارون رشید (آئی پی ایس) دوست پور کے جلیل احمد اور مظہر حسین (ایڈیشنل چیف انجینئر)،بھلنی کے ظفر امام رضا،ڈاکٹر عین الحق،سجاد حسن (آئی اے ایس) اور محمد موسیٰ عرف بھولی بابو علاقہ میں اپنی شناخت رکھنے والوں میں سے ہیں۔

ان کے علاوہ دینی وتعلیمی خدمات اور سماجی سرگرمیوں کے لحاظ سے جو شخصیات تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں،ان میں مولانا سعید قاسمیؒ (چندسین پور) جو علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد اور مدرسہ بشارت العلوم کھرائن کے بانی تھے،معروف بزرگ شخصیت مولانا محمد شفیع صاحبؒ اور آپ کے فرزند مولانا محمد یعقوبؒ (بیجل پور،بلائن)،حافظ فرمود علی رحمانی (رام کھتاری) جو امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے بڑی قربت رکھتے تھے،الحاج نور محمدؒ اور مولانا عبید

الرحمٰنؒ (رام کھتاری) جنہوں نے علاقہ میں مدارس کا جال بچھایا، مولانا عتیق الرحمٰن قاسمیؒ، چندسین پور (سابق مہتمم بشارۃ العلوم کھرائن) مولانا صابر حسین قاسمی مدنیؒ، چندسین پور (سابق مہتمم مدرسہ اشرف العلوم کنہواں) مولانا عبدالظاہر سلفیؒ (بھوارہ) مولانا شریف قاسمیؒ (نپٹولیا، پنڈول) مولانا عبدالسمیع سلفیؒ (رہیکا) مولانا عبدالرحیمؒ (انہاربن) مولانا عبدالرحیمؒ (لوہی) کے اسماء گرامی کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔

رفتگان کے ساتھ اگر قائمان پر نظر ڈالیں تو مولانا قیصر حسین ندوی، لوہی (استاذ تفسیر و ادبِ عربی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) مولانا زبیر احمد قاسمی (مہتمم مدرسہ اشرف العلوم کنہواں سشمی و رکن اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی) مولانا زبیر احمد قاسمی پوکھرونی (سابق پرنسپل مدرسہ نورالہدیٰ، قضیاہی) مولانا ہارون قاسمی (تیسی) مولانا داؤد رحمانی (سابق صدر مدرس مدرسہ اتحادالمسلمین باگھا) مولانا یسین رحمانی (سابق پرنسپل مدرسہ اتحادالمسلمین باگھا) مولانا ابراراحمد قاسمی (صدر جمعیۃ علماء، مدھوبنی، ارشد مدنی گروپ) مولانا قاضی حبیب اللہ قاسمی (قاضی شریعت دارالقضاء مدھوبنی) استاذ محترم مولانا مفتی ابوذر قاسمی (استاذ فلاح المسلمین و صدر جمعیۃ علماء مدھوبنی، محمود مدنی گروپ) مفتی اعجاز قاسمی (قاضی شریعت و پرنسپل مدرسہ محمود العلوم، دملہ) مولانا ضیاء الدین قاسمی (سنولی، بنی پٹی) مولانا عزیز الرب فیضی (راگھونگر، بھوارہ) مولانا عبدالرحمٰن (رام کھتاری) مولانا عزیز الرحمٰن (ہرپور) جیسی شخصیات نظر آتی ہیں جن کی خدمات جگ ظاہر ہیں۔

جناب عبدالشکور صاحب کا نام سیاسی وسماجی شخصیات میں سرفہرست ہے جو بہار اسمبلی کے اسپیکر تھے، آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر شکیل احمد صوبائی بلکہ ملکی سطح پر شہرت رکھتے ہیں، نرہیا کے شکراللہ میاں کے صاحبزادے اور ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ جناب عبدالحی پیامی جو میرے علم کے مطابق ایک بار رکن اسمبلی بھی رہ چکے ہیں، اور علاقہ میں اپنی شناخت رکھتے ہیں، انہاربن کے حاجی عین الحقؒ اپنے دور کی بڑی بااثر شخصیت گزری ہے، باگھا کسمار کے ایوب ظفر کا نام بھی اس حوالہ سے زندہ رہے گا، تازہ دم واردین سیاست میں

ڈاکٹر فیاض احمد جو تعلیمی سرگرمیوں کے لئے معروف تھے، اب سیاست سے بھی وابستہ ہیں اور رکن اسمبلی ہیں اور ڈاکٹر مختار احمد (کریوت) جولوکہا ہائی اسکول کے پرنسپل ہیں اور سیاست میں بھی سرگرم ہیں، ان دونوں سے مسلمانوں کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں، اس فہرست میں دو نئے نام کا اضافہ ہوا ہے، ایکململ کے ظہیر مململی اور دوسرے ماسٹر تجمل حسین (خوشحال پٹی) یہ دونوں بھی تازہ دم ہیں، اور سیاسی سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں۔

یادش بخیر! جناب ڈاکٹر منظور عالم صاحب کا تعلق اسی سرزمین سے ہے، جو ملکی سطح پر نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، انسٹیٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز (دہلی) کے چیرمین اور آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں، آپ اپنی ہمہ جہت خدمات کے لئے معروف ہیں، آپ کی سرگرمیوں کا مرکز دہلی ہے، اس لئے علاقہ میں زیادہ معروف نہیں ہیں۔

دینی تعلیمی اداروں میں مدرسہ احمدیہ مدھوبنی، مدرسہ رحمانیہ یکہتہ، مدرسہ چشمۂ فیضململ، مدرسہ محمودالعلوم دملہ، مدرسہ فلاح المسلمین، بھوارہ، مدرسہ اسلامیہ راگھونگر، نرہیا کا مدرسہ، مدرسہ فیضیہ عربی کالج جمیلا، مدرسہ نوریہ پچھی، مدرسہ قدرتیہ شکری، مدرسہ اسلامیہ اندھراٹھاڑھی، مدرسہ نورالہدیٰ قضیاہی، مدرسہ عائشہ نورچک، بسفی، مدرسہ سراج العلوم سنگرام، وغیرہ یہاں کے قابل ذکر ادارے ہیں، جن میں اکثر کی عمریں سو سال سے کم نہیں ہے، متعدد ادارے ایسے ہیں جو ایک زمانہ تک اپنی شاندار تعلیم کی وجہ سے طلبہ کا مرجع بنی رہی ہیں، بعد میں بھی اور بھی ادارے وجود میں آئے، جن میں مدرسہ صفا گرلس ہائی اسکول، جامعہ فاطمۃ الزہراءململ، اور بعض دوسرے اداروں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

یہاں مسلم آبادی اٹھارہ فیصد ہے، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع میں مسلمانوں کی آبادی ۶۴۱۵۷۹ ہے۔

یکہتہ --- ایک دورافتادہ مگر مردم خیز قصبہ

یکہتہ ایک بڑا مسلم اکثریتی قصبہ ہے، اس کے مضافات میں چند اور بستیاں ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، یہ سب ایک برادری کے افراد ہیں، یہ شیخ برادری (شیخ

صدیقی) کہلاتے ہیں،ان سب کی تہذیب وثقافت ایک ہے،تعلیم اورتہذیب وثقافت کے حوالے سے جب 'یکہتہ' بولا جاتا ہے تو عموماًاس سے علاقہ کی پوری برادری یعنی یکہتہ مع مضافاتی گاؤں مرادلیا جاتا ہے۔

مدھوبنی کے قصبات میں 'یکہتہ' نہ صرف ضلع بلکہ صوبہ میں ممتاز اورنمایاں حیثیت رکھتا ہےاورمسلم اکثریت کے ساتھ اپنی تعلیمی،تہذیبی اورثقافی سرگرمیوں کے لئےمشہور ہے،بطورخاص دینی تعلیم اور یہاں پیدا ہونے والی شخصیات نے اس قصبہ کوشہرت عام اور بقائے دوام بخشا ہے،یہاں متعددایسی نابغہ روزگارشخصیات پیداہوئیں جنہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی،اور جنہوں نے اپنی دینی وملی اورعلمی خدمات کے ذریعہ اس قصبہ کا نام روشن کیا۔

یہ قصبہ مدھوبنی شہر سے تقریباً پچاس کیلومیٹر کے فاصلہ پر بھوتہی بلان کے دامن میں آباد ہے، بہار کی مشہور ندی کملااس کے مغرب میں رواں ہے،جبکہ یہاں سے نیپال کی مسافت صرف ۱۰ کیلومیٹر ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس کی تعیین مشکل ہے کہ اس علاقہ میں مسلمان کب سے آباد ہیں؟ یہاں کے مسلمان کہیں اور سے آکرآباد ہوئے یا یہیں کے اصل باشندے ہیں؟لیکن حالات و قرائن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ قدیم ہے،اور یہ سرزمین بڑی زرخیز رہی ہے، اوراپنی زرخیزی کی بناء پر ہمیشہ ایسے پھول اگاتی رہی جس کی خوشبو متھلا کی فضاء علم وادب، تہذیب وثقافت کومعطر کرتی رہی ہے۔

یہ قصبہ اوراس سے متصل علاقہ اپنی علمی،اورتہذیبی شعوروآگہی کے باوجود چونکہ شہر سے دور ہے،اس لئے سرکاری گزٹ اوردوسری تاریخی دستاویز میں اس کا ذکر نہیں ملتا، علاقہ کی تاریخ سے جو بوڑھے پرانے لوگ زیادہ واقف تھے اب وہ بھی نہیں رہے،جس کی وجہ سے زبانی روایات بھی ان کے سینوں میں دفن ہوگئیں،ململ میں یہ روایت نقل ہوتی چلی آرہی ہے کہ ان کے جدامجد کوئی ململی خان تھے جو اکبر کے زمانہ میں سپہ سالار تھے،شہنشاہ اکبر نے خوش ہوکر یہ علاقہ ان کو بخش دیا تھا،انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی،عین ممکن ہے ان کے ساتھ

اور بھی افراد ہوں گے،یالشکر بھی رہا ہوگا،انہی لوگوں سے اس علاقہ میں آبادی ہوئی،مگر اس روایت کے پیچھے بھی کوئی تاریخی حوالہ نہیں ہے،اوراب تک یہ بات تشنہ تحقیق ہے۔

اس سلسلہ میں جب میں نے موجودہ لوگوں سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہاں متعدد خاندان آباد ہیں،ان میں سے بعض کا دوسری جگہ سے آنا معروف ہے،لیکن اکثر لوگوں کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ یہیں کے تھے،یاباہر سے آئے،اس تحقیق سے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ اس طرح ہیں:

۱۔رحمٰن بخش صاحب کے اجداد گھورن مہوا(سوپول) سے آکر یہاں آباد ہوئے،یہ دوسوسال سے پہلے کی بات ہے،کیونکہ ان کے خاندان میں اب پانچ نسلیں یہاں گزر چکی ہیں، اور یہ بات معروف ہے کہ جب یہ لوگ یہاں آئے تھے تو اس وقت یہاں مسلم آبادی تھی،گویا دوسوسال سے زیادہ عرصہ سے یہاں مسلم آبادی ہے۔

۲۔موجودہ لوگوں میں سے اکثر کو اپنے چاریاپانچ پشتوں کے نام یاد ہیں،اس سے آگے کسی کو یاد نہیں،اگر پانچ پشت مان لیں تو بھی اوسطاً دوسوسال سے تین سوسال کا عرصہ ہوتا ہے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ چوتھی یاپانچویں پشت سے آگے جو نام ملتے ہیں ان میں اکثر نام قریب قریب ہندوؤں کے نام سے ملتے جلتے ہیں،اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ پانچ پشت سے پہلے کے افراد ابھی دولت ایمان سے مشرف ہی ہوئے تھے،یا یہ اسلام سے قریبی زمانہ تھا۔

۳۔متعددایسے خاندان ہیں جو یقینی طور پر ململ اوراس کے مضافاتی گاؤں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں،اور یہ منتقلی دوسری یا تیسری پشت سے ہوئی ہے۔

۴۔قصبہ میں سب سے پرانے آدمی کا نام غلام علی ادھیکاری متعارف ہے،یہ ادھیکاری خاندان کے جدامجد تھے،یہ نام پانچویں یا چھٹی پشت میں ملتا ہے،یہی سب سے قدیم خاندان ہے،حافظ بشیرالدین صاحب بتاتے ہیں کہ غلام علی ادھیکاری ہرپور سے آئے تھے۔

۵۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ قاضی ٹولہ ہرپور سے آئے تھے،اور قاضی ٹولہ والے ہرسنگھ پور سے آئے تھے۔

۶۔ جناب محبّ اللہ صاحب گاؤں کی تاریخ کی اچھی معلومات رکھتے تھے،ان کی روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ دھمسائن (دربھنگہ) سے آئے ہیں،وہ اس کے شواہد بھی بیان کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں یہ علاقہ سرسبز وشاداب اور زرخیز رہا ہو،جس کی وجہ سے مختلف علاقوں کے مسلمانوں نے یہاں سکونت اختیار کئے ہوں،یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ پہلے جنگل تھا،جنگل کاٹ کاٹ کر لوگ آباد ہونے شروع ہوئے اور دھیرے دھیرے آبادی بڑھنے لگی،پھر یہ آبادی بھی آج کی طرح ایک جگہ نہیں رہی ہوگی،ایک ایک دو دو گھر کہیں کہیں پر آباد ہوں گے،ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد محلّہ اور گاؤں کی شکل بنی ہوگی، اس طرح صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد موجودہ شکل وجود میں آئی۔

قدیم تاریخ کے چند نقوش،کچھ دھندلی تصویریں

یہ بات تقریباً طے ہے کہ یہ آبادی دوتین سوسال پرانی ہے،لیکن اس وقت جو کچھ معلومات مل رہی ہیں وہ سب سوسال کے اندر کی ہیں،اس سے پہلے زمانہ کے صرف چند نام ملتے ہیں،یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فلاں فلاں نام کے افراد اس زمانہ میں مشہور تھے۔

البتہ میں نے اس کتاب میں سوسال پہلے کی چند چیزوں کا بھی تذکرہ کیا ہے،جن کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا اور اس کے زمانہ کی تعیین کرنا مشکل ہے۔

مزار اور کنواں سے متعلق چند زبانی باتیں

یکہتہ کے جنوب میں شہر خموشاں قبرستان واقع ہے،قبرستان کے شمال میں جامن کا ایک پیڑ ہے،اسی کے قریب دو پرانی قبریں اور ایک کنواں تھا،ان دونوں کے آثار پچاس سال پہلے تک موجود تھے،کنواں اور قبر کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں،مثلاً یہ کہ مزار کے پاس رات میں روشنی ہوتی تھی،لوگوں کو نظر آتا تھا کہ وہاں روشنی جل رہی ہے،لوگ آرہے ہیں،جارہے ہیں،چونکہ یہ ویران جگہ تھی اس لئے کوئی بھی رات میں اس کے قریب نہیں جاتے تھے،صرف ایک مجذوب جس کو لوگ ’رام کے منتی‘ کہتے تھے،ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ وہاں رات میں جاتے تھے،یہ مزار لوگوں کی عقیدت کا مرکز تھا،عوام بھی بڑی تعداد میں وہاں آتی تھی۔

مزار کے قریب ایک کنواں بھی تھا،چند سال پہلے تک اس کے آثار موجود تھے،کنواں میں جو اینٹیں استعمال ہوئی تھیں اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قدیم کنواں تھا،اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اس کے پانی میں شفا ہے،جو مریض اس کو استعمال کرلے وہ صحت مند ہو جاتا ہے،اس شہرت کی وجہ سے لوگ اس کا پانی بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

حاجی عبدالحق صاحب کے زمانہ میں (یہ شاید ۵۰ء،۵۱ء کی بات ہوگی) رشید خلیفہ نے اس کنویں کی صفائی کی تھی،اس صفائی کا واقعہ بڑا مشہور رہا ہے۔

یہ مزار کن کا ہے،یہاں کون بزرگ آسودہ خاک ہیں؟اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی،ایک رائے یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان میں سے ایک عبداللہ بلخی کا مزار ہے،جو حضرت مخدوم شاہ کے خلیفہ تھے،ان کے ایک بھائی کی قبر تاج پور میں ہے،اور آج بھی مرجع خلائق ہے،عبداللہ بلخی کا زمانہ سات سوسال پہلے کا سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے،اس سلسلہ میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے،ہاں اتنی بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کسی بزرگ کی قبر تھی،ممکن ہے اس علاقہ کے لوگ ان کے دست مبارک پر ایمان لائے ہوں،یا پھر یہاں کا دینی رجحان ان کی محنت اور جدوجہد کا نتیجہ ہو،اور انہی کی کوششوں سے اس علاقہ میں دینی شعور عام ہوا ہو۔

یکہتہ کی وجہ تسمیہ اور اس کا املا

کبھی کوئی نام کسی خاص وجہ سے رکھا جاتا ہے،اور اس کی کوئی مناسبت ہوتی ہے،اور کبھی اس کی کوئی خاص وجہ یا مناسبت نہیں ہوتی،یہی حال اس قصبہ کے نام کا بھی ہے،جب یہاں کی آبادی کی کوئی متعین تاریخ نہیں ملتی،تو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے،کس بنیاد پر اس آبادی کا نام یکہتہ پڑا؟

بعض لوگ اس کی کچھ مناسبتیں بیان کرتے ہیں،مگر یہ دور کی کوڑی لانے کے مثل ہے،مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نئی آبادی تھی جس کی وجہ سے اس کا نام نیا گاؤں پڑا،یہی لفظ یکہتہ بنا،مگر یہ بات بھی بلا دلیل ہے،دوسری رائے یہ ہے کہ کسی زمانہ میں اس جگہ دو بادشاہوں

کے درمیان صلح ہوئی تھی،اس مناسبت سے اس علاقہ کا نام ایکتا یعنی اتحاد رکھا گیا،بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ نامانوس ہے،عموماً نئی آبادی کے نام آس پاس کے گاؤں کے نام سے ملتے جلتے رکھے جاتے ہیں،مگر یہ لفظ بالکل الگ ہے،میرے خیال میں یکہتہ تو بعد کا لفظ ہے،ایکتا یا اختا نام رہا ہوگا،پہلا لفظ ہندی اور دوسرا فارسی انداز پر ہے،یہی لفظ بدلتے بدلتے یکہتہ ہوا۔

لفظ''یکہتہ'' کا املا بھی مختلف زمانوں میں الگ الگ رہا ہے،کہا جاتا ہے کہ پہلے اختا لکھا جاتا تھا،قصبہ کے مشہور شاعر مضمحل صاحب اپنی تحریروں میں ایکتا لکھتے تھے،پرانے خطوط میں ''یکتا''اور''ایکتا'' دونوں طرح کا املا ملتا ہے،جناب شبیر احمد زخمی صاحب بیان کرتے ہیں کہ ماسٹر ادریس صاحب (مدھے پور) نے پہلی مرتبہ''یکہتہ'' لکھا تھا،اس کے بعد یہ املا رائج ہوا، عجیب بات یہ ہے کہ عام بولی میں اس کا جو تلفظ استعمال ہوتا ہے ہندی اور انگریزی میں بعینہ وہی املا استعمال کیا جاتا ہے،یعنی''اکھتا''،'وادی بالان' میں شفیع صاحب کے وطن کا نام اسی تلفظ کے ساتھ'یعنی' اکھتا'' لکھا گیا ہے۔

چند قدیم اور معروف خانوادے

یہاں ننانوے فیصد افراد شیخ صدیقی ہیں،ان میں ذیلی طور پر دو برادریاں یا دو بڑے خاندان ہیں،ایک کو بارہ گھریا اور دوسرے کو تیرہ گھریا کہا جاتا ہے،رحمان بخش کا خاندان بارہ گھریا اور ان کے علاوہ کے لوگ تیرہ گھریا کہلاتے ہیں،یہ تقسیم کس بنیاد پر ہے،اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟اس کے بارے میں کوئی متعین بات معلوم نہیں ہوسکی،کہا جاتا ہے کہ اس برادری کے لوگ تیرہ گاؤں میں آباد ہیں،اس لئے انہیں' تیرہ گھریا' کہا جانے لگا،اس حد تک تو بات معقول لگتی ہے۔

پھر تیرہ گھریا سے بارہ گھریا کیسے بنا؟اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں جب دونوں برادریوں کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے،یہاں کے قدیم باشندوں کے بعض افراد نے خود کو'تیرہ گھریا' کہنا شروع کیا،اور اسی مناسبت سے دوسرے خاندان کے افراد جو گھورن مہوا سے آئے تھے،وہ'بارہ گھریا' ٹھہرے،ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس کی کوئی خاص

وجہ نہیں ہے،یہ بات یونہی بعض لوگوں نے پھیلائی جو مشہور ہوگئی۔

یہاں کے قدیم باشندوں میں سب سے نمایاں نام غلام علی ادھیکاری کا ملتا ہے،یہ نام اوپر کی پانچویں پشت میں ہے،ان کے نام سے جو خاندان وجود میں آیا وہ ادھیکاری خاندان کہلاتا ہے،حافظ بشیر الدین صاحب بتاتے ہیں کہ غلام علی کو مہاراج دربھنگہ کی طرف سے ادھیکار ملا ہوا تھا،اسی وجہ سے وہ ادھیکاری کے نام سے مشہور ہوئے،یہ بہت بڑا خاندان ہے، جو اب شاخ در شاخ متعدد ذیلی خاندانوں میں تقسیم ہو چکا ہے،ادھیکاری کے نام سے قصبہ میں آج بھی کئی تالاب منسوب ہیں،جو اس خاندان کے جد امجد جناب غلام علی ادھیکاری کا کھدوایا ہوا ہے،اسی خاندان کے ذیلی شاخ کے طور پر روشن علی،بخش علی،شمشیر علی،محبوب علی، اشرف علی،حاجی منیر الدین،محی الدین مسہرو بابو،سمیع الدین بابو،حلیم دفعدار وغیرہ کے خانوادے مشہور ہیں۔

دوسرا بڑا اور معروف خاندان گھورن مہوا سے آنے والے افراد پر مشتمل ہے،اس کے جد امجد دراصل دو بھائی امید علی اور محمد علی تھے،جو گھورن مہوا سوپول سے آئے تھے،یہ تقریباً دو سو سال سے زائد عرصہ پہلے کی بات ہے،یہاں ان لوگوں نے تجارت شروع کی،زمینیں حاصل کیں،اور پھر دھیرے دھیرے ترقی کر کے نہ صرف قصبہ بلکہ اس پورے علاقہ کے تحصیل دار اور زمیندار کہلائے،خدا بخش،رحمان بخش،فقیر محمد،حاجی عبد الحق،محمد شفیع بیرسٹر،عبد الغفار بابو،شاہ عقیل احمد صاحب،ڈاکٹر منظور احمد شمسی وغیرہ اس خانوادہ کی مشہور شخصیات ہیں،یہ خانوادہ عصری تعلیم اور سماجی خدمات کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔

تیسرا خاندان لٹیہارا خاندان کہلاتا ہے،ان کے جد امجد قاسم علی یا پیغمبر بخش تھے،اس خاندان میں قاری یعقوب،حافظ عبد الرزاق وغیرہ مشہور افراد تھے،حضرت مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب کا تعلق بھی اسی خانوادہ سے ہے۔

شیخ برادری کے علاوہ یہاں انصاری برادری سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی آباد ہیں، اس برادری میں حافظ عبد العزیز انصاری وعبد الرشید انصاری کا خاندان معروف رہا ہے،محمد

ہارون انصاری مدرسہ کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی رہے ہیں۔

ان کے علاوہ اکبری خاندان، مالک ابو کا خاندان اور دوسرے بہت سے خاندان معروف رہے ہیں، قدیم خانوادوں میں انہی کے نام ملتے ہیں، بعد میں ان سے ہی بہت سے نئے خاندان وجود میں آئے، اور مشہور ہوئے، ان کا تذکرہ یہاں مقصود نہیں ہے۔

طوفانپور میں الٰہی بخش اور حسینی بخش کا خاندان جس کے جدامجد حاجی اکبر تھے، سب سے قدیم ہے، اس خاندان میں الٰہی بخش کے بعد نظام الدین اور اس کے بعد کاری بابو حفیظ بابو بہت مشہور ہوئے، یہ لوگ سماجی کاموں میں معروف تھے، ان کے علاوہ عبدالرحیم مینیجر، ظاہر حسین، اقبال، محمد سلیم، رفیع الدین وغیرہ مشہور لوگوں میں تھے، صاحب ثروت تھے، ان لوگوں کا خاندان یہاں معروف رہا ہے۔

طوفانپور میں بھی شیوخ کے علاوہ انصاری اور دیگر برادریوں کے بہت سے گھر ہیں، ان میں تعلیم کی طرف توجہ بہت کم ہے، انصاری برادری میں متعدد حفاظ اور چند عالم بھی ہوئے ہیں۔

بشنپور میں عبدالجلیل اور عبدالعزیز جن کی بڑی تجارت تھی، اور اقبال اور جمال بھی معروف لوگوں میں سے تھے، ان دونوں کا خاندان بھی معروف تھا۔

مہراجپور میں معین الدین کا خاندان معروف تھا، ان کے تین صاحبزادے عبدالرشید، عبداللطیف اور عبدالعزیز بعد میں نئے خاندان کی بنیاد بنے۔

یہ قدیم خانوادوں کا مختصر تذکرہ تھا، بعد میں ان ہی کی بعض شاخیں اور دوسرے بہت سے نئے خانوادے معروف ہوئے۔

یکہتہ کے مضافاتی گاؤں

یکہتہ ایک قصبہ ہے، اس کے گرد متعدد گاؤں آباد ہیں، جن میں شیخ برادری کی آبادی ہے، ان تمام بستیوں میں ایک بولی، ایک ثقافت، اور شادی بیاہ کا ایک طریقہ رائج ہے، چونکہ یکہتہ کو مرکزیت حاصل رہی ہے، اس لئے عموماً صرف یہی نام استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح

گاؤں کے باہر تعارف میں بھی اسی قصبہ کا نام لیا جاتا ہے۔

یکہتہ ایک کثیر آبادی والا قصبہ ہے، جو ایک درجن کے قریب محلوں پر مشتمل ہے، اکثر محلوں کا اپنا مستقل نام بھی ہے، یہ اس وقت ایک مکمل پنچایت ہے، بلکہ شاید پنچایت سے زائد آبادی ہے، اس میں کچھ غیر مسلموں کی آبادی بھی ہے، ان کا بھی ایک محلّہ ہے، مدرسہ رحمانیہ، مڈل اسکول، شفیع اردو لائبریری، پرائمری ہیلتھ سنٹر، عیدگاہ اور پرشکوہ جامع مسجد کے ساتھ ایک درجن کے قریب مساجد یہاں ہیں۔

اس کے شمال میں دو گاؤں ہیں، ایک طوفانپور اور دوسرا بشنپور، طوفانپور بھی کثیر آبادی والا گاؤں ہے، اس کا قدیم نام محمد پور تھا، ۱۸۹۵ء سے پہلے کے دستاویز میں یہی نام ملتا ہے، اس کے بعد کے سروے میں جو ۱۹۰۲ء میں مکمل ہوا، اس گاؤں کا نام طوفانپور لکھا ہوا ہے، نام کی تبدیلی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی طوفانی میاں تھے، جن کے نام پر طوفانپور رکھا گیا، اس کی آبادی یکہتہ سے کم ہے، یہ بھی کئی محلوں پر مشتمل ہے، آبادی کے وسط میں مدرسہ اسلامیہ اور اس سے متصل مسجد اور پچھم محلّہ میں پرائمری اسکول یہاں کے ادارے ہیں، یہاں غیر مسلموں کی آبادی نہیں ہے، موجودہ تقسیم میں یہ جھانجھ پٹی (آشا) پنچایت کا حصہ ہے۔

طوفان پور کے مشرق میں ایک چھوٹی آبادی بشنپور ہے، بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہی گاؤں اس علاقہ میں سب سے پہلے آباد ہوا تھا، پہلے یہ ایک کثیر آبادی والا گاؤں ہوا کرتا تھا، بھتہی بالان کی ستم رانیوں کی وجہ سے اس کے باشندوں کو متعدد بار اپنی رہائش بدلنی پڑی، جس کی وجہ سے بہت لوگ مضافات کے مختلف گاؤں میں آباد ہو گئے، ندی کے کنارے باندھ بننے کے بعد گاؤں والوں نے راحت کی سانس لی، اس وجہ سے اس کی آبادی سمٹ کر رہ گئی، یہ بھی جھانجھ پٹی پنچایت کا حصہ ہے، اس میں پرائمری اسکول، مسجد اور مکتب قائم ہے، مدرسہ فیض العلوم کے نام سے مدرسہ کا قیام ہوا تھا، جس نے قیام کے چند سال بعد ہی دم توڑ دیا، اب اس کی تجدید ہو رہی ہے، یہاں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم آبادی بھی ہے۔

یکہتہ کے مشرق میں راجپور گاؤں آباد ہے، یہ ایک چھوٹی سی آبادی ہے، ندی کے کنارے ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ ہمیشہ سیلاب کے نشانہ پر رہتے ہیں، آبادی کے بالکل قریب سے ندی کا رخ شمال سے مشرق کی جانب مڑتا ہے، ندی کے قریب باندھ موجود ہے، مگر سیلاب کی طغیانی کی وجہ سے خطرہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے، یہاں بھی ایک پرائمری اسکول، مکتب اور مسجد ہے۔

راجپور سے متصل قدرے جنوب مشرق میں مہراج پور گاؤں آباد ہے، اس کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے، یہاں بھی صرف مسلم آبادی ہے، یہاں ایک مدرسہ دارالعلوم معینیہ اور مسجد ہے، یہ اور راجپور دونوں گاؤں پرساہی پنچایت کا حصہ ہیں۔

یہ پانچوں گاؤں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اس طرح آباد ہیں کہ یکہتہ سے بشنپور اور طوفانپور بالکل ملی آبادی ہے، جبکہ راجپور اور مہراج پور ایک ساتھ ہے، ان سب سے الگ تھلگ ایک گاؤں کسمار ہے، یہ یکہتہ کے مغرب میں تقریبا تین چار کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، یہ کثیر آبادی والا گاؤں ہے، البتہ اس میں شیخ برادری کی تعداد کم ہے، یہاں ریاض العلوم کے نام سے ایک مدرسہ، دو پرائمری اسکول اور دو مساجد ہیں، یہ گاؤں باگھا کسمار پنچایت میں شامل ہے، یکہتہ اور اس کے متصل دیگر گاؤں کی بنسبت اس کا محل زیادہ اچھا ہے، یہ صوبائی سڑک (پھلپراس۔کھٹونہ سڑک) کے کنارے واقع ہے۔

ماضی کی دینی، تعلیمی، سماجی اور معاشی صورت حال

اس مختصر تعارف کے بعد اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ماضی میں اس علاقہ کی دینی، تعلیمی، سماجی اور معاشی صورت حال کیا تھی؟ پچاس سال اور سو سال پہلے یہاں کی حالت کیا تھی، اور کس طرح اس آبادی نے ارتقائی منازل طے کئے ہیں؟ اس جائزہ کے بعد ہی ماضی کا صحیح نقشہ سامنے آسکے گا۔

ماضی کی صورتحال کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں ماضی کو کئی حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا، اس لئے کہ ہمارا ماضی یکساں نہیں ہے، وہ ارتقاء کے کئی مراحل سے گزرا ہے، لہذا ذیل کی

سطروں میں ہم ماضی کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے صورت حال کو پیش کریں گے، مثلا ۱۹۰۰ء سے پہلے کی صورت حال، ۱۹۰۰ء کے بعد کے پہلے پچاس سال، اور آزادی کے بعد سے ۲۰۰۰ء تک اور اس کے بعد سے اب تک کی صورت حال۔

دینی صورت حال

سو سال پہلے اس معاشرے میں دینی رجحان کا زیادہ پتہ نہیں چلتا ہے، ہاں اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ یہاں کے باشندوں میں دینی شعور تھا، اور شاید قریب کے دوسرے علاقوں سے زیادہ تھا، اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس زمانہ کے متعدد لوگوں کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے پیدل حج کئے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ نہ حج کرنے کی پوزیشن میں تھے بلکہ فریضہ حج کی اہمیت سے واقف بھی تھے، اور اپنے دینی جذبہ کی بنیاد پر اس کی ادائیگی کے لئے مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار تھے، دینی رجحان کے حوالہ سے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ملتی ہے، البتہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جہالت کی وجہ سے بدعات کی بڑی کثرت تھی، اسی طرح ہندوانہ رسم ورواج اور تصورات بھی مسلم معاشرہ میں رائج تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں یعنی ۱۹۰۰ء کے بعد دینی بیداری میں بڑا اضافہ ہوا، اس کی ایک بڑی وجہ بزرگوں کی آمد ہے، اس زمانہ میں متعدد بزرگان دین اور علماء کرام تشریف لائے، ان نفوس قدسیہ کی وجہ سے اس علاقہ کو بڑا فائدہ پہونچا، ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مونگیری تشریف لائے، ان کے علاوہ دوسرے علماء اور صلحاء کی آمد ہوتی رہی، ان سب کا تذکرہ آئندہ کے صفحات میں دیکھیں گے، اس کے علاوہ اس زمانہ میں مختلف فصلوں میں باہر سے علماء آتے، بڑے کاشتکاروں کے دروازوں پر جلسے اور مجلسیں ہوتیں تھیں، شبیر احمد زخمی صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا عبدالشکور صاحبؒ دھان کے فصل کے موقعہ پر آتے، اور ان کی مجلسیں ہوتیں تھی۔

اس زمانہ میں جہاں عام لوگوں کی دینی حالت بہتر ہورہی تھی وہیں جہالت کی وجہ سے جو بدعات مسلم معاشرہ میں رائج ہوچکی تھیں، مثلاً میلاد میں قیام، صلوۃ وسلام، اور دیگر ہندوانہ رسم ورواج وغیرہ، ان کو ختم کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں، مولانا ظفر شبیرؒ اور دوسرے حضرات نے

اس سلسلہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، انہی حضرات کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ اس معاشرہ سے یہ چیزیں اس طرح معدوم ہوئیں کہ اب یہ اصطلاحات بھی ختم سی ہوگئیں۔

اس دور میں دینی تعلیم کی طرف توجہ بڑھی، جس کے نتیجہ میں بھی دینی حالت میں بہتری پیدا ہوئی، اس زمانہ میں حاجی بہت سے لوگوں کے نام کا جزء نظر آتا ہے۔

آزادی کے بعد یہاں کی دینی صورتحال میں نمایاں فرق آچکا تھا، دین کا عمومی مزاج بن چکا تھا، معاشرہ میں دینی تصور کا غلبہ تھا، اسی دور میں تبلیغی جماعت کی محنت بھی شروع ہوئی، جس کی وجہ سے دینی حالت میں انقلاب سا آگیا، جماعت اسلامی فکر کے آثار بھی اس دور میں ملتے ہیں، اس کے علاوہ قصبہ کی سطح پر متعدد تحریکیں وجود میں آئیں جن کی وجہ سے اصلاح معاشرہ کی فکر آگے بڑھی، اس کے بعد کی صورت حال ماضی نہیں حال کا حصہ ہے، جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

تعلیمی صورت حال

تعلیمی ارتقاء کی تاریخ تقریباً وہی ہے جو دینی ارتقاء کی ہے، یہ دونوں بڑی حد تک لازم ملزوم ہیں، تعلیم کے نتیجہ میں دینداری پیدا ہوتی ہے، اور دینی شعور کے نتیجہ میں تعلیم کی طرف رجحان عام ہوتا ہے، اس لئے دینی رجحان کے ساتھ ہی تعلیم کا رجحان بھی نظر آتا ہے، تعلیم کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، عام اندازہ یہ ہے کہ مختلف اہل علم کے پاس طلبہ تعلیم کے لئے بیٹھتے ہوں گے، استاد کا گھر یا دروازہ ہی درسگاہ ہوتا ہوگا، اس کے بعد مختلف دروازوں پر تعلیم دینے کا سلسلہ شروع ہوا، تعلیم کی باضابطہ کوشش مدرسہ رحمانیہ کے قیام کی صورت میں نظر آتی ہے، ابتدائی دور کے بعد تعلیم کے میدان میں سب سے مؤثر شخصیت مولانا زین الدین صاحب کی ملتی ہے، یہ ۱۹۰۰ء سے پہلے اور اس کے متصل بعد کا زمانہ تھا۔

۱۹۰۰ء کے بعد مدرسہ رحمانیہ میں ابتدائی تعلیم کا باضابطہ انتظام شروع ہو چکا تھا، ابتدائی دور میں ایک یا دو اساتذہ ہوا کرتے تھے، پھر فارسی اور اس کے بعد عربی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی، ۱۹۲۷ء میں طوفانپور میں مکتب کا قیام عمل میں آیا، پھر ۱۹۳۴ء میں مڈل اسکول قائم ہوا،

اس طرح بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں تعلیم کا رجحان خوب عام ہو چکا تھا، اس دور میں دینی اور عصری دونوں تعلیم کے لئے کوششیں ہوئیں، اور بڑی حد تک دونوں ادارے اسی دور میں مستحکم ہو چکے تھے، ۱۹۵۰ء کے بعد مدرسہ رحمانیہ کی دوسری نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے، جس کا سلسلہ ۸۰ء، ۸۵ء تک جاری رہا۔

پہلے ابتدائی تعلیم کو منظّم کیا گیا، یعنی انفرادی تعلیم اور استاد کے پاس جا کر پڑھنے کے بدلے اجتماعی تعلیم کے لئے مکتب شروع ہوا، اس کے بعد ملک کے تعلیمی رواج کے مطابق فارسی کی تعلیم پر توجہ شروع ہوئی، فارسی کے متعدد اہم اساتذہ اسی دور میں گزرے ہیں، مولانا زین الدین صاحب بڑے فارسی داں تھے، ان کے پاس دور دور سے طلبہ فارسی پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اس کے بعد عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، عربی تعلیم کی طرف توجہ یعنی درس نظامیہ کی طرف رجحان آزادی کے بعد کے دور میں شروع ہوتا ہے، اب گاؤں کی تعلیم کے بعد طلبہ بیرونی مدارس کا رخ کرنے لگے، اس سے پہلے بہار شریف کا مدرسہ عزیزیہ، استھاواں کا مدرسہ احمدیہ اور مونگیر وغیرہ اس علاقہ کے طلبہ کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، اب مدرسہ رحمانیہ مرکز توجہ بنا۔

اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ شروع ہوئی، ابتداءً گھریلو تعلیم تھی، اس کے بعد اس سلسلہ کی اور بھی کوششیں ملتی ہیں، جن میں حافظ نور صاحب کا قائم کردہ اسکول کے علاوہ محترمہ ام الفاطمہ کی کوششیں اور بزم حسنات شامل ہیں۔

۱۹۵۰ء کے بعد کا دور تعلیمی اعتبار سے زریں دور کہلانے کا مستحق ہے، اسی زمانہ میں مدرسہ رحمانیہ اپنے عروج پر پہونچا، جس کی وجہ سے گاؤں میں بڑی تعداد میں اہل علم پیدا ہوئے، دینی اور عصری دونوں طرح کی تعلیم خوب خوب پھیلی، گاؤں کے علاوہ اطراف کے طلبہ نے بھی بڑی تعداد میں ان اداروں سے کسب فیض کیا، آج کی مشہور شخصیات سب اسی دور کی پروردہ ہیں۔

اسی زمانہ میں درس نظامیہ کی طرف بھی توجہ بڑھی، اب طلبہ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرف رخ کرنے لگے، اور دھیرے

ڈھیرے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، اس طرح چند دہائیوں میں یہاں حفاظ اور علماء کی بڑی تعداد تیار ہوگئی، جس کی وجہ سے یہ علاقہ علماء اور حفاظ کا مرکز شمار ہونے لگا۔

پہلے دور کے حفاظ اور علماء استھاواں اور مدرسہ عزیزیہ کے فیض یافتہ تھے، تو بعد والے زیادہ تر مدرسہ رحمانیہ کے خوشہ چیں، درس نظامی کی طرف توجہ کے بعد دیوبند، مظاہر اور ندوہ طلبہ کے لئے باعث کشش ٹھہرا اور اب تک یہی ادارے اس علاقہ کے طلبہ کے لئے مرکز علم و فن بنے ہوئے ہیں، مولانا ممتاز علی مظاہری اس علاقہ کے پہلے مظاہری ہیں جبکہ، مولانا صابر قاسمیؒ اس قصبہ کے پہلے فاضل دیوبند اور مولانا امتیاز احمد ندوی پہلے ندوی فاضل ہیں، ان کے بعد ان مرکزی اداروں کے فارغ التحصیل کی تعداد مستقل بڑھتی رہی، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

عصری تعلیم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ۱۹۰۷ء میں اسی سرزمین کے ایک سپوت محمد شفیع صاحب کا اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جانے کی تاریخ ملتی ہے، مگر یہ اس علاقہ کی عام صورت حال نہیں تھی، ۱۹۳۴ء میں یہاں مڈل اسکول قائم ہوا، اس سے پہلے عصری تعلیم کے لئے باضابطہ کسی ادارہ کی خبر نہیں ملتی ہے، مکتب اور اس سے پہلے مختلف دروازوں پر دینی تعلیم کے ساتھ ابتدائی عصری تعلیم بھی ہوتی ہوگی، اس کے بعد کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں تھا، بعض لوگ دوسرے گاؤں کے اسکول میں جاکر مڈل کا امتحان دیتے تھے، یہی اس وقت تعلیم کا معراج تھا، اور اس بنیاد پر سرکاری ملازمت بھی ملتی تھی، قصبہ میں مڈل اسکول قائم ہونے کے بعد عام لوگوں میں عصری تعلیم کا رجحان عام ہوا، البتہ بعض خاندانوں میں اس سے پہلے سے عصری تعلیم کی طرف توجہ تھی، رحمٰن بخش اپنے بچوں کو دربھنگہ میں رکھ کر تعلیم دلاتے تھے، اور وہیں سے شفیع صاحب کے لئے لندن جانے کی راہ ہموار ہوئی۔

مڈل اسکول کے قیام کے بعد جو طلبہ مڈل پاس کر لیتے اور اس کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے وہ عموماً مسلم ہائی اسکول دربھنگہ کا رخ کرتے، اور یہاں سے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرتے، ہائی اسکول بھی اس زمانہ میں بہت اہم ڈگری شمار کی جاتی تھی، اک زمانہ تک یہی سلسلہ جاری رہا، مسلم ہائی اسکول دربھنگہ سے تعلیم پانے والوں میں ڈاکٹر منظور احمد شمسی، ڈاکٹر

محمد فاروق، نیاز احمد صاحب وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ پھلپراس اور گھوگھرڈیا کے ہائی اسکول وکالج، بہار یونیورسیٹی مظفر پور بھی یہاں کے طلبہ کا مرکز رہا، ایک زمانہ میں مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ جانے کا رجحان بڑھا، متعدد افراد نے اس دانش کدہ سے فیض حاصل کی اور اپنی تعلیم کی تکمیل کی، یہاں کے فیض یافتگان میں جناب ریاض احمد علامہ، بدرالدین صاحب، توصیف احمد ابن حبیب احمد، رزیق احمد، شاہد علی اور حشمت علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بعد کے دور میں دربھنگہ کے کالجز، پٹنہ یونیورسیٹی، متھلا یونیورسیٹی دربھنگہ عصری تعلیم کے لئے یہاں کے طلبہ کا مرکز توجہ بنا، دوسری طرف مدارس سے یونیورسیٹی کا رخ کرنے والے طلبہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، اور جواہر لعل نہرو یونیورسیٹی دہلی کو اپنا مطمح نظر بنایا، گذشتہ سالوں میں مدرسہ کے دو فارغین عزیزی علی اختر ندوی اور عزیزی طارق انور ندوی نے جے آر ایف (J.R.F) اسکالرشپ کا اہلیتی امتحان پاس کرکے اپنا اور علاقہ کا نام روشن کیا ہے، یہ اسکول بیک گراؤنڈ والے طلبہ کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

مضافاتی گاؤں بشنپور میں مدرسہ فیض العلوم کا قیام ۱۹۸۱ء میں اور مہراج پور میں مدرسہ معینیہ کا قیام ۸۲ء میں عمل میں آیا، ان دونوں اداروں کو شاید مخلص اور بے لوث کارکن نہیں مل سکے، جس کی وجہ سے ضرورت کے باجود اس کی نشو ونما نہیں ہوسکی، اور یہ اپنی نافعیت ثابت نہ کرسکے، کاش نئی نسل سے کوئی مردمجاہد ان اداروں کو زندہ کرنے کے لئے کمربستہ ہوتا!

اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے باضابطہ ادارے قائم ہوئے، مدرسہ رحمانیہ میں بنات سیکشن اسی دور کی یادگار ہے، جبکہ مدرسہ اصلاحیہ نسواں اور معہد البنات یعقوبیہ کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اصلاحیہ اب خود محتاج اصلاح وترقی ہے، اور یعقوبیہ کو نئے خون کی ضرورت ہے، جو اس کے حقیقی مقاصد کی تکمیل کرسکے۔

لڑکیوں کی عصری تعلیم کے لئے ۱۹۴۵ء میں گورمنٹ گرلس اسکول قائم ہوا، مگر یہ پرائمری کی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکا، قصبہ کی بچیاں عموماً مڈل اسکول میں پڑھتی ہیں، جہاں مخلوط نظام

ہے، جولوگ مختلف شہروں میں رہتے ہیں ان میں بچیوں کو پڑھانے کا رجحان زیادہ ہے، مگران کو بھی مخلوط نظام تعلیم سے مفرنہیں ہے، ڈاکٹر فاروق صاحبؒ نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بڑی کوشش کی، مگران کی محنت ثمر آور نہیں ہوسکی۔

اصلاح معاشرہ کمیٹی کا ایک بنیادی مقصد بھی لڑکیوں کے لئے ادارہ کا قیام تھا، مگر یہ کمیٹی خود ہی چند دنوں کی مہمان ثابت ہوئی، گذشتہ دنوں وزیر اعلیٰ نتیش کمار کی آمد پر اس خاکسار نے اپنی حدتک کوشش کی کہ گرلس اسکول کی مانگ بھی ان کے سامنے رکھی جائے، مگر ہماری یہ خواہش مطالبہ لسٹ میں بھی جگہ نہ پاسکی، غرض اب تک قصبہ میں گرلس اسکول کے لئے کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں ہوسکی ہے، حالانکہ یہ بھی اہم ترین ضرورت ہے۔

سماجی صورت حال

سوسال پہلے جب یہاں جہالت کا غلبہ تھا اس دور کی سماجی حالت کے بارے میں کوئی تفصیلات نہیں ملتی ہیں، یہاں کی سب سے پہلی سماجی شخصیت غلام علی ادھیکاری کی صورت میں نظر آتی ہے، جس کے نام سے ادھیکاری خاندان وجود میں آیا، اوپر پانچویں یا چھٹی پشت میں یہ نام ملتا ہے، ان کی طرف منسوب قصبہ میں دو بڑے تالاب آج بھی موجود ہیں، ظاہر ہے ان کی اور بھی سماجی ورفاہی خدمات ہوں گی، مگر بعد زمانہ کی وجہ سے اب کوئی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔

اسی دور میں یا اس کے بعد کوسی کی تباہی سے پریشان ہوکر گھورن مہواسوپول سے ایک قافلہ یہاں خیمہ زن ہوا، ان لوگوں نے تجارت شروع کی، یہاں کی زمینیں مال گزاری پر حاصل کیں، اور دھیرے دھیرے سماج میں بلند مقام حاصل کرلیا، یہ لوگ سماجی کاموں کے بھی معروف رہے ہیں۔

اس دور میں یہاں کے قدیم باشندوں میں غلام علی ادھیکاری کے فرزندان روشن علی اور بخش علی، اوران کے بعد شمشیر علی کا نام سماجی کارکنان میں سرفہرست نظر آتا ہے، مسماۃ حسن بانو اور مسماۃ زیب النساء (زبین) سماجی وفلاحی کاموں میں مردوں کے قدم بہ قدم بلکہ بعض جہتوں سے ان سے بھی آگے تھیں، ان حضرات کے علاوہ کچھ بڑے اور زیادہ تر اوسط درجہ کے کاشتکار تھے۔

الغرض غلام علی ادھیکاری کے بعد خدا بخش کے خانوادے کی سماجی حیثیت قائم رہی، یہی لوگ پوری قوم کے حاکم یا رہنما تھے، گاؤں گھر کے مسائل حل کرنا، پنچایت کرنا، گاؤں کی نمائندگی کرنا یہی اس زمانہ کے سماجی کام تھے، اوران کاموں میں یہی لوگ پیش پیش تھے۔

۱۹۰۰ء کے قریب اوراس کے بعد یہ سماجی رشتہ اور مضبوط شکل میں نظر آتا ہے، جب فقیر محمد اوران کے صاحبزادے کا اقبال بلند ہوا، یہ اقبال مند شخصیت جناب حاجی عبدالحق صاحب کی تھی، جن کی حیثیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دور دراز علاقوں سے لوگ بڑے معاملات فیصل کرانے ان کے پاس آتے تھے، ان کی حیثیت بلند مرتبہ سردار کی تھی، علاقہ میں ان کی طوطی بولتی تھی، قصبہ کے سارے مسائل ان کے پاس ہی حل ہوتے تھے، سماجی ترقی سے متعلق سارے اقدامات ان کے ذریعہ ہی ہوتے تھے۔

حاجی عبدالحق صاحب کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ قصبہ کے سارے ذی شعور افراد ان کے مصاحب تھے، عموماً بڑے اور نازک مسائل میں ان سب کے مشورہ کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد کا زمانہ سماجی اعتبار سے انتشار کا زمانہ ہے، یہ حاجی عبدالحق صاحب کا آخری دور تھا، اس دور میں برسر اقتدار خانوادہ کے خلاف آواز اٹھنے لگی، جس کے نتیجہ میں اس خانوادہ اور یہاں کے قدیم باشندوں میں خلیج حائل ہوگئی، دراصل یہاں کے قدیم باشندوں کو اب یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے ساتھ امتیاز برتا جارہا ہے، دونوں برادری کے درمیان بہت سے معاملات میں تفریق کی جاتی ہے، اور یہ چنگاری اس وقت بھڑک اٹھی جب حاجی عبدالحق صاحب کے خلاف مکھیا میں محی الدین عرف مسہرو بابو کھڑے ہوئے، اور معاملہ پھر یہیں پر نہیں رکا بلکہ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی، یہ آویزش اور کشمکش تقریباً ۷۰ء، ۷۵ءتک جاری رہی۔

مجھے ان دونوں میں سے کسی کا نہ دفاع کرنا ہے نہ وکالت اور نہ ہی صحیح اور غلط کا فیصلہ، البتہ اس وقت کے سماجی منظرنامہ کو سمجھنے کے لئے چند امور کی وضاحت ضروری ہے:

الف: اب تک تعلیم بڑی حد تک اسی خانوادے میں محدود تھی، پھر زمینداری کا تسلسل بھی یہیں تھا، ان کے بالمقابل دوسرے لوگوں میں تعلیم بھی کم تھی، اور معاشی لحاظ سے بھی زیادہ مستحکم نہیں تھے، بعض بڑے کاشتکار ضرور تھے مگر اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو محنت ومزدوری کر کے گھر چلاتے تھے۔

ب: مدرسہ رحمانیہ اور مڈل اسکول کے ذریعہ جب علم کی روشنی پھیلی تو سب کو تعلیم کے یکساں مواقع ملے، چنانچہ اس دوسرے طبقہ میں بھی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی، اور ان میں بھی شعور پروان چڑھنے لگا، اسی طرح ان کی معاشی حالت نے بھی ترقی کی، اور پہلے کے مقابلہ میں خوشحالی بڑھی۔

یہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے سماجی وحدت اور ہم آہنگی کے باوجود تفریق کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا، عام لوگ شاید اس بات کا احساس نہ کر سکے ہوں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت کے ذی شعور طبقہ کے ذہنوں میں یہ بات تھی، ممکن ہے بعض حساس طبیعت کے لوگوں نے اس کو ہوا دی ہو، اور اس احساس کو سڑک پر لے آئے ہوں، مگر اس چنگاری کے وجود سے انکار شاید مشکل ہے، اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ محکوم طبقہ میں حاکم کے خلاف ذہنیت پیدا ہونا عام سی بات ہے۔

حاجی عبدالحق صاحب کے بعد جناب انیس احمد صاحب سماجی سربراہ کے طور پر سامنے آئے، وہ مکھیا بنے اور تقریباً پندرہ سالوں تک مکھیا رہے، ان کے زمانہ میں مذکورہ تحریک نے نئے بال و پر نکالے، متعدد معاملات میں مداخلت شروع ہوئی، اور دھیرے دھیرے آویزش کی شکل اختیار کر گئی، اس دور میں بارہ گھریا اور تیرہ گھریا کے درمیان دوری بہت زیادہ بڑھ گئی، اور بعض ناخوشگوار واقعات بھی سامنے آئے۔

١٩٧٨ء میں ایک نئی تبدیلی یہ سامنے آئی کہ اب مکھیا کے الیکشن میں جناب حبیب احمد جو نتھو خلیفہ کے چشم وچراغ تھے، کامیاب ہوئے، یہ تیرہ گھریا کے پہلے فرد تھے جنہیں زمانہ کے بعد مکھیا بننے اور سماجی سربراہی کا موقع ملا اور اس طرح سماجی قیادت ان کے ہاتھ میں آئی، جناب حبیب احمد صاحب بھی مذکورہ تحریک کے سرگرم رکن تھے، ایک طویل زمانہ تک سماجی

قیادت ان کے ہاتھوں میں رہی، مگر ایسا لگتا ہے کہ شاید وہ بھی ان مقاصد کو پورا کرنے سے قاصر رہے جن کے لئے مذکورہ تحریک وجود میں آئی تھی۔

اس کے علاوہ اب پرانا سماجی نظام کمزور ہو چکا تھا، مختلف اسباب کی بناء پر اب ذہن کسی بندش یا پابندی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، اسی طرح سماجی روایات اور قدریں بھی اب دم توڑنے لگیں، جو کبھی یہاں کا امتیاز تھیں، گویا یوں کہہ سکتے ہیں کہ سماجی اعتبار سے یہ آزادی اور انتشار کا دور تھا، اور اب تک یہی صورتحال ہے۔

ان مختلف ادوار میں ظاہر ہے بہت سے واقعات ایسے بھی پیش آئے ہوں گے جہاں انصاف کے تقاضہ پورے نہیں ہوئے، اسی طرح بعض معاملات ایسے بھی ہوئے ہوں گے جہاں انگلی رکھی جا سکتی ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ قوم کے سربرآوردہ شخصیات کا ہر رویہ عوام کے لئے اطمینان بخش نہیں ہوتا، سماجی شخصیات میں شامل بعض افراد ایسے بھی گزرے ہوں گے جو اپنے منفی مزاج اور حاکمانہ رویہ کی وجہ سے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے، لیکن ان جزوی واقعات اور بعض خاص افراد کے مزاج کو سماج کا عمومی مزاج نہیں کہہ سکتے ہیں، پھر اب ان شخصیات کے بارے میں منفی باتوں کے بجائے مثبت باتیں ہی سامنے رکھنی چاہیے۔

سماجی روایات کے حوالے سے ہندو مسلم بھائی چارہ اور یگانگت کا ذکر ضروری ہے، یہاں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھائی بھی رہتے ہیں، اور دونوں ہمیشہ مل جل کر رہتے ہیں، ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوتے ہیں، یہ سلسلہ شروع سے اب تک جاری ہے، بابری مسجد کی شہادت کے بعد بابری مسجد کی اینٹ لے جانے کے معاملے کے علاوہ اب تک انتشار کی کوئی بات سامنے نہیں آئی، اور وہ واقعہ بھی اللہ کے فضل سے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی حل ہو گیا اس طرح ہندو مسلم ہم آہنگی اب تک بے داغ ہے۔

یہاں کی غیر مسلم آبادی میں لوہار، سنار، بنیا، تیلی، اور پاسوان برادری کے افراد ہیں، ان سب کو کسی زمانہ میں باضابطہ بسایا گیا تھا، یہ ان سماجی شخصیات کی دوراندیشی کی ایک مثال ہے، پہلے ان کی تعداد کم تھی اب یہ تعداد کافی بڑھ چکی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ آبادی کا تقریبا پندرہ فیصد ہیں۔

ان کے یہاں بھی تعلیم کا فروغ ہورہا ہے، بلکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ اوراس کے لئے کوشاں ہیں، جس کے نتیجہ میں بہت سے لوگوں نے سرکاری ملازمتیں حاصل کیں ہیں، بعض لوگوں نے اعلی تعلیم بھی پائی ہے، اس قوم کا ایک فرد فرید بیلٹ پاسوان بھنگم تعلیم، شاعری اور سیاست کے میدانوں میں خوب شہرت ونا موری حاصل کر چکے ہیں، وہ اس علاقہ کے پہلے پدم شری ہیں، درجن بھر کتابوں کے مصنف اور میتھلی زبان کے معروف شاعر ہیں۔

معاشی صورت حال

سماجی صورت حال کی طرح معاشی اعتبار سے بھی یہاں متعدد مراحل نظر آتے ہیں، ابتدائی صورت حال کی کوئی تفصیل محفوظ نہیں ہے جو سماجی، اقتصادی اور تعلیمی کسی بھی صورت حال کی وضاحت کر سکے۔

جب یہ بات طے ہو چکی ہے کہ یہاں کی آبادی قدیم ہے، تو اس سے یہ بات خود ہی ظاہر ہوتی ہے کہ قدیم زمانہ کے باشندوں کا کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش رہا ہوگا، یہ ذریعہ معاش کیا تھا، کاشتکاری، جانور پالنا، محنت ومزدوری کرنا وغیرہ، اس کے علاوہ اور کسی ذریعہ کا علم نہیں ہوتا ہے۔

سماجی تبدیلی کے ساتھ معاشی تبدیلی بھی آتی ہے، لہذا جس طرح سماجی تبدیلی آئی اسی طرح معاشی تبدیلی بھی آئی ہوگی، ہمارے دادا مرحوم بتایا کرتے تھے کہ ان کے بچپن میں قحط سالی بہت ہوتی تھی، فاقہ کشی عام تھا، اگر کسی کو تینوں وقت کھانا میسر ہوتا تو وہ محلّہ کا خوش حال آدمی سمجھا جاتا تھا۔

بعض لوگ بڑے کاشتکار تھے، ایک دو زمیندار بھی تھے، اکثر لوگ انہی لوگوں کے کھیتوں میں محنت مزدوری کرتے تھے، ہل جوتتے، فصل تیار کرتے، فصل کاٹتے، چمڑا اور کپڑے وغیرہ کی تجارت بھی تھی، گڑ سے چینی تیار کی جاتی تھی، بعض لوگوں کے پاس دوکانیں تھی، دودھ سے بالائی نکالنے کی مشین کا تذکرہ بھی ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دودھ اور بالائی کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔

ان کے علاوہ ایک ذریعہ معاش اور بھی تھا، اور وہ تھا چٹائی بننا، اور اسے بیچنا، اکثر گھروں

میں زیادہ تر عورتیں اور کہیں کہیں مرد بھی اس کام کو انجام دیتے تھے، یہی اس زمانہ کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش تھا، چٹائی پٹیر سے تیار کی جاتی تھی، پٹیر کاٹنے کے لئے کوسی کے کنارے دور دور تک جاتے تھے، اور یہ سفر بھی عموما پیدل یا بیل گاڑیوں پر ہوا کرتا تھا، بیل گاڑیوں پر پٹیر لایا جاتا، پھر اس سے چٹائی تیار کی جاتی تھی، ہمارے بچپن میں بھی بعض گھروں میں یہ سلسلہ موجود تھا۔

اس زمانہ میں زیادہ تر کاشتکاری پر انحصار کیا جاتا تھا، امیر غریب سبھوں کی زندگی کا دارو مدار اسی پر تھا، یہاں کی زمینیں بڑی زرخیز ہیں، مگر کبھی بارش کی کثرت، کبھی سیلاب کی قہر سامانی، اور کبھی خشک سالی ان مسائل سے ہمیشہ یہاں کے کسان دوچار رہتے، پھر ستم بالائے ستم انگریزوں کا ظلم وجور بھی، اگنے والے غلہ پر بھاری لگان، لگان نہ ادا کرنے پر زمین کی نیلامی اور زبردستی نیل کی کھیتی کروانا بھی معاشی عدم استحکام کے اسباب تھے۔

یہ حالت ظاہر ہے بہت دنوں تک رہی ہوگی، پھر دھیرے دھیرے تبدیلی آئی، لوگ مزدوری کے لئے اپنے علاقہ سے باہر جانے لگے، ایک زمانہ میں پورنیہ، بنگال وغیرہ کا رخ ہوا، اس کے بعد باہر نکلنے کے رجحان میں تیزی آئی، پنجاب اور آسام وغیرہ کے دروازے کھلے اور کثرت سے لوگ باہر جانے لگے، جانے والوں میں زیادہ تر بغیر پڑھے لکھے لوگ ہوتے، یہ لوگ سامان ڈھونے اور محنت ومزدوری کے دوسرے کام کرتے تھے، ان کو دیکھ کر بعض پڑھے لکھے لوگوں نے بھی باہر قدم نکالنے شروع کئے، اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تلاش رزق کی کوشش جاری رکھی۔

باہر جانے کی وجہ سے معاشی حالت میں بڑی تبدیلی آئی، اب لوگوں کی حالت اچھی ہونے لگی، ادھر گاؤں میں رہنے والوں کی حالت بھی پہلے سے اچھی ہوئی۔

۱۹۰۰ء سے پہلے اس علاقے میں گنتی کے چند بڑے کاشتکار نظر آتے ہیں، مگر ۱۹۰۰ء بعد بڑے کاشتکاروں کی فہرست میں بہت سے نام ملتے ہیں، ان کے علاوہ زمیندار، تحصیل دار اور اسیسر وغیرہ کے نام بھی ملتے ہیں، کپڑے اور چمڑے کی تجارت اور چینی مل کا بھی پتہ چلتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بتدریج معاشی ترقی ہورہی تھی، اور عام لوگوں کی اقتصادی حالت

میں پہلے کے مقابلہ میں بہتری آتی رہی۔

بیسویں صدی کے نصف میں آزادی سے پہلے اور اس کے بعد جب یہاں تعلیم کا فروغ ہوا تو اس کے نتیجہ میں اقتصادی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوئی، تعلیم کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے کھل گئے، اکثر لوگوں نے سرکاری مدارس اور اسکولوں میں تدریس کی ملازمت حاصل کی، کچھ لوگوں کو دوسری ملازمتیں بھی ملیں، بعض اچھے عہدوں پر بھی فائز ہوئے، اور جو پڑھنے سے محروم رہے یا سرکاری ملازمت نہیں پا سکے، انہوں نے دلی، بمبئی، کلکتہ، سورت اور دوسرے تجارتی شہروں کو اپنی محنت سے آباد کیا، اس طرح بتدریج اس علاقہ نے معاشی ترقی کرتے ہوئے بڑی حد تک گویا معاشی استحکام حاصل کرلیا۔

اب یہ علاقہ اور بطور خاص قصبہ یکہتہ معاشی اعتبار سے مضبوط سمجھا جاتا ہے، مختلف سرکاری وغیر سرکاری شعبوں میں ملازمت کے علاوہ، تجارت اور کاشتکاری یہاں کا اہم ذریعہ معاش ہے، معاشی ترقی کی وجہ سے تعلیم کے علاوہ دینی ورفاہی کاموں میں خرچ کا مزاج ہمیشہ سے رہا ہے، ادھر کی دہائیوں میں دین کے راستوں میں خرچ کا گراف بھی خوب بڑھا ہے، البتہ مختلف شہروں سے سرمایہ کے ساتھ وہاں کی ثقافت یعنی شہری گندگی بھی اب دیہاتوں میں منتقل ہورہی ہے، پرانی روایتیں اور اخلاقی قدریں دم توڑتی جارہی ہیں، یہ چیزیں اہل علم ودانش کے لئے لمحہ فکریہ ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور دیگر مشاہیر علم کی آمد

تعلیم کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کا شعور ہمیشہ بیدار رہا، دینی رجحان اور پھر تعلیم کی روشنی نے یہاں کے لوگوں کو اس زمانہ کے مشاہیر علماء اور بزرگان دین سے قریب کیا، جس کے نتیجہ میں یہاں ہمیشہ اہل علم اور اصحاب فضل وکمال کی آمد ہوتی رہی ہے۔

دینی شعور پیدا کرنے میں بھی علاقہ کے علماء اور باکمال شخصیات کی کوششیں شامل ہوں گی، مگر ان باکمالوں کے نام تاریخ میں محفوظ نہیں ہیں، سب سے پہلے ہمیں جس قد آور شخصیت کی آمد کا پتہ چلتا ہے وہ شیخ وقت اور پیر طریقت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی ذات گرامی ہے، آپ

نے مسماۃ حسن بانو کی دعوت پر ۱۹۲۰ء میں اس سرزمین کو زینت بخشی، آپؒ کی آمد کی خبر سن کر نیپال تک سے مسلمانوں کی بڑی تعداد امنڈ پڑی، کہا جاتا ہے کہ آپ کے عقیدت مندوں کی تعداد اتنی تھی کہ روزانہ کئی جانور ان کی ضیافت کے لئے ذبح ہوتے تھے، آپ جب تک رہے ذکر الٰہی سے یہاں کا ماحول گویا بقعہ نور بنا رہا، آپ کے ذریعہ نہ معلوم کتنے دلوں میں محبت الٰہی کی آگ بھڑک اٹھی، کتنے نفوس ذکر کی لذت سے سرشار ہوئے، ان کے گرم نفوس اور آتش محبت سے ماحول پر کیا اثر پڑا ہوگا اس کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

مسماۃ حسن بانو کو بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی، وہ بیعت تو مولانا مونگیری سے تھیں، مگر اپنے زمانہ کے متعدد بزرگوں سے اچھے مراسم رکھتی تھیں، یہ حضرات ان کی دعوت پر یہاں تشریف لایا کرتے تھے، ان حضرات میں مولانا سلیمان پھلواریؒ، مولانا حشمت اللہ رحمانیؒ، مولانا محمد عابد چندیپوریؒ (بنگال) مولانا فصیح عالمؒ کے اسماء گرامی معروف ہیں، ان کے علاوہ اعظم گڑھ اور دیوبند کے علماء کا یہاں آنا بھی معروف ہے، مسماۃ صاحبہ ان بزرگوں اور صوفیاء کرام کی خوب خوب خدمت کرتیں اور ان کی خاطر ومدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں، ان حضرات سے ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، اپنے وقت کی ان شخصیات کی آمد اسی مرحومہ کی رہین منت ہے، مولانا مونگیری کے بہت سے مریدین اور متوسلین اس علاقہ میں ہیں۔

مولانا مونگیری کے بعد جس شخصیت کا فیض یہاں زیادہ جاری ہوا وہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی ذات گرامی ہے، یہ علاقہ آپ کی آمد سے شرف یاب تو نہیں ہوسکا، البتہ یہاں کے بہت سے لوگ آپ کی صحبت فیض رسا سے مستفید ہوئے، متعدد حضرات نے مراسلت کے ذریعہ آپ سے راہ سلوک کی منزلیں طے کیں، آپ کے مریدین ومستفیدین کی تعداد بھی خاصی ہے، جن میں مولانا ممتاز علی مظاہری کی ذات گرامی بھی شامل ہے۔

محمد شفیع بیرسٹرؒ کی دعوت پر ان کے ہمراہ مولانا مقبول احمدؒ یہاں تشریف لائے، ان کے علاوہ دربھنگہ اور پٹنہ کے دیگر علماء کو محمد شفیع صاحب اپنے ساتھ یہاں لاتے اور ان کا وعظ کرواتے تھے، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب کے بقول مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے والد صاحب

شفیع صاحب کے ہمعصر تھے، شفیع صاحب کی دعوت پر وہ بھی یہاں تشریف لائے تھے۔

مشہور بزرگ حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ سے یہاں کے لوگوں کو بڑی عقیدت تھی، متعدد افراد آپ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت تھوشاہؒ اور شاہ عقیل صاحبؒ قابل ذکر ہیں، مولانا گڑھولویؒ سے تعلق وقربت کی وجہ سے اس سلسلہ کے بزرگوں کی آمد ورفت بھی رہی ہوگی۔

قاری ذوالفقار صاحب بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد محترم جناب امام حسین حضرت گڑھولویؒ کے مرید تھے، ان کی دعوت پر حضرت اپنے رفقاء کے ساتھ یہاں تشریف لائے تھے، اس خبر کی تصدیق نہیں ہوسکی، انہی کے بقول ایک موقعہ پر متعدد صوفیاء کرام جن میں بزرگ بشیر احمد دیوانہ، شاہ وزارت حسین، بابا امرت داس، بابا کملی داس وغیرہ شامل تھے، اس سرزمین کو زینت بخش چکے ہیں۔ (یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں، ص:١٦)

خانقاہ رحمانی کے ساتھ خانقاہ سلیمانی پھلواری شریف کے بزرگوں سے بھی یہاں کے پرانے باشندوں کو خاص عقیدت تھی، اس سلسلہ کے متعدد بزرگان دین یہاں تشریف لائے۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے مجاز حضرت مولانا عارف حسین ہرسنگھ پوری صاحب یہاں تشریف لاتے تھے، ان کا قیام حکیم زین الدین صاحب کے یہاں ہوتا تھا۔

مولانا مونگیری کے فرزند ارجمند امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کو یہاں کے لوگوں نے بار بار دیکھنے کی سعادت حاصل کی، آپ مدرسہ رحمانیہ کے گویا سرپرست تھے، اور آپ کے مشورہ سے ہی اہم تعلیمی امور انجام دیئے جاتے تھے، آپ کی آمد مدرسہ کے سالانہ جلسوں کے موقعوں پر ہوتی تھی۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ حضرت مولانا منور حسین صاحبؒ ١٩٨٢ء میں مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے، اوران کے دست مبارک سے ہی رحمانیہ کے دار جدید کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

مولانا عثمان صاحب، مولانا قریش صاحب مفسر قرآن کلکتہ، مولانا شمس الہدی صاحب

رحمانیہ سوپول مدرسہ رحمانیہ کے سالانہ جلسہ میں یہاں تشریف لائے۔

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا اس سرزمین سے بڑا گہرا تعلق تھا، آپ کئی بار یہاں تشریف لائے، یہاں دارالقضاء کے قیام کا مشورہ آپ نے ہی دیا تھا۔

موجودہ شخصیات میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے فرزند حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب، امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب، نائب امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب، امارت شرعیہ کے دیگر ذمہ داران کی آمد سے یہاں کے لوگ مستفید ہوچکے ہیں، ان حضرات کی آمد سالانہ جلسوں میں ہوئی ہے۔

مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری کا اس قصبہ اور مولانا ممتاز علی صاحب مظاہری سے بڑا گہرا تعلق ہے، آپ اکثر یہاں تشریف لایا کرتے ہیں، اور یہاں کے لوگوں کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔

سیاسی شخصیات میں موجودہ وزیراعلی جناب نتیش کمار صاحب، سابق وزیراعلی جناب جگن ناتھ مشرا، سابق وزیراعلی لالو پرساد یادو، سابق وزیراعلی اتر دیش ملائم سنگھ یادو، دھنک لال منڈل، مولانا عبیداللہ خاں اعظمی، ڈاکٹر شکیل احمد، جناب اشرف علی فاطمی، منگنی لال منڈل، سلمان خورشید اور دیگر لیڈران الیکشن اور دوسرے پروگرام میں یہاں آچکے ہیں، دیوندر پرساد یادو (ایم پی) اس سرزمین سے گھر جیسا تعلق رکھتے ہیں۔

ان سب کے علاوہ مدرسہ بورڈ کے ذمہ داران کی آمد بھی ہوتی رہی ہے، اس فہرست میں بھی متعدد اہم شخصیات شامل ہیں۔

یکہتہ کا جزء لاینفک 'ململ'

یکہتہ سے تقریباً پچاس کیلومیٹر دور مغرب میں قصبہ 'ململ' آباد ہے، جو یکہتہ ہی کی طرح اپنی تہذیب وثقافت اور تعلیمی وادبی شعور کے لئے مشہور ہے، ان دونوں قصبوں میں زبان (بولی) رہن سہن، معاشرت اور تہذیب کے لحاظ سے بڑی یگانگت پائی جاتی ہے، یہاں شادی بیاہ کے نہ صرف طریقے یکساں ہیں بلکہ ذہنی شعور میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے، اس قربت

اور یکسانیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں قصبات کے درمیان زمانہ قدیم سے نقطہ اتحاد کچھ نہ کچھ ضرور ہے، قرین قیاس یہ ہے کہ دونوں کے جدامجد ایک ہی تھے، یہ دو آبادیاں ایک ہی نسل کی بڑھتی اور پھلتی ہوئی شاخیں ہیں۔

ململ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اکبر یا بابر کے زمانہ میں مململی خان نام کے کوئی سپہ سالار تھے، بادشاہ وقت نے ان کو یہ علاقہ جاگیر میں دی تھی، انہی کی نسل سے یہ آبادی ہے، تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن اگر اس بات کو مان لیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ململ کی آبادی یکہتہ سے قدیم ہے، پہلے ململ میں آبادی ہوئی، پھر یہیں سے کچھ لوگ دوسرے علاقوں میں منتقل ہوئے، جن میں ایک آبادی یکہتہ بھی ہے۔

ان دو قصبات اور اس کے گرد مضافاتی گاؤں کے علاوہ اس علاقہ میں جو دوسرے مسلم گاؤں ہیں، وہاں کی ثقافت بالکل الگ ہے، چند قصبات میں صرف کچھ چیزوں میں مماثلت پائی جاتی ہے، ورنہ مکمل ہم آہنگی اور یک رنگی صرف ان ہی دو قصبوں اور اس کے مضافاتی بستیوں میں پائی جاتی ہیں۔

ان دو قصبوں اور اس کے مضافاتی گاؤں کے افراد ایک برادری کے سمجھے جاتے ہیں، یہ برادری شیخ صدیقی کے نام سے معروف ہیں، اہم بات یہ ہے کہ اس علاقہ میں شیخ کے نام سے اور بھی خاندان ہیں، مگر ان کی ثقافت یہاں سے الگ ہے۔

اس برادری کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں شادی بیاہ اسی برادری میں ہوتی ہے، یعنی انہی تیرہ گاؤں میں شادی ہوتی ہے، برادری کے باہر شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے، ادھر چند برسوں سے برادری کے باہر شادی کرنے کی خبریں آنے لگی ہیں۔

ان دونوں قصبات میں تعلیم، ثقافت، تہذیب اور معاشرتی امور کی انجام دہی بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے، تعلیمی رجحان جس طرح یکہتہ میں قدیم ہے اسی طرح ململ میں بھی تعلیمی شعور قدیم زمانے سے نظر آتا ہے، یہ دونوں قصبے مردم خیزی میں اپنی مثال آپ ہیں، دینی، سماجی، علمی اور ادبی شخصیات کم وبیش دونوں جگہ کثرت سے پیدا ہوئی ہیں، تعلیم کے ساتھ زبان وادب اور شاعری کی روایات کے گہرے نقوش دونوں جگہ ملتے ہیں۔

اگر اداروں کو دیکھیں تو جس طرح مدرسہ رحمانیہ اپنی قدامت اور فیض کے لحاظ سے بے مثال ہے اسی طرح مدرسہ چشمۂ فیض بھی بڑا بافیض ادارہ ہے، جس کا سرچشمہ علم اس پورے علاقہ کو زمانہ قدیم سے سیراب کر رہا ہے، یہاں آزادی سے پہلے کا مڈل اسکول ہے تو وہاں ہائی اسکول کے ساتھ لڑکیوں کے لئے جامعہ فاطمۃ الزہراء، اور صفا گرلس اسکول جیسے ادارے ہیں، یہاں گلشن ادب اور شفیع اردو لائبریری قصبہ کے ادبی ذوق کا گواہ ہے تو وہاں کتب خانہ چشمہ فیض علم وادب کا گنجینہ ہے۔

تہذیب وثقافت کی ہم رنگی

یکہتہ اور ململ شہر سے دور دو الگ الگ قصبات ہیں، لیکن شہری تہذیب وثقافت سے دور ہونے کے باوجود یہاں مسلم تہذیب وثقافت کی جلوہ گری رہی ہے، اور یہ بھی اس علاقہ کا امتیاز ہے، تعلیم اور اردو سے تعلق اور تعلیمی وادبی سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں کی تہذیب وثقافت میں شہری تہذیب وثقافت رچ بس گئی ہے، عام رہن سہن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کے لوگ مہذب ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، ایک بڑے تعلیمی ادارہ کے مؤقر استاذ جو اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ خود مجھ سے فرمایا کہ جب میں آپ کے گاؤں جاتا ہوں تو مجھے اسلامی تہذیب وثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔

شادی و بیاہ کے طریقے، رہن سہن اور معاشرتی زندگی کا انداز اپنے اندر تہذیب وثقافت کا ایک حصہ لئے ہوئے ہوتے ہیں، کم از کم ہندوانہ تہذیب وثقافت کے اثرات بہت ہی کم نظر آئیں گے، پردہ کا اہتمام، ہر گھر کے ساتھ دیوان خانہ یا دالان (یہاں کی زبان میں دروازہ) مردوں کی الگ نشستیں، سلام کی کثرت، گھر میں غیر مردوں کا بلا اجازت نہ داخل ہونا، عورتوں کا دن میں کم سے کم گھر سے باہر نکلنا، مہمان نوازی، ہر محلّہ میں مسجد، اذان کی آوازیں، بلند منارے، چوک اور اس کی رونقیں، صبح وشام چائے خانوں کی ہمہ ہمی، یہ سب تہذیب وثقافت کے نقوش ہی تو ہیں۔

مسلمان کی کثرت اور معاشی خوشحالی بھی اس تہذیبی وثقافتی ارتقاء میں معاون ہوا کرتی

ہے، جس کا اثر بدلتے زمانہ کے ساتھ خوب نظر آتا ہے۔

متھلا کا حصہ ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کی عام زبان پر متھلی الفاظ اور لہجہ کا بڑا اثر ہے، اسی طرح ہندی کا بھی غلبہ ہے، لیکن ان دو قصبات کی زبان الگ ہے، یہاں کی بولی اردو سے قریب تر ہے، بلکہ زبان تو اردو ہی ہے، صرف لہجہ تھوڑا بدلا ہوا ہے، اسے اردو کی علاقائی بولی کہہ سکتے ہیں، جیسے اودھ کے علاقہ میں 'اودھی' بولی جاتی ہے، جسے اردو ہی کہا جاتا ہے۔

یہاں کی شخصیات نے جہاں گیسوئے اردو کو سنوارنے کی خدمت انجام دی وہیں اہل ذوق نے اپنی بولی یا مادری زبان میں بھی شاعری کر کے اپنے اعلی ذوق کا ثبوت پیش کیا، متعدد حضرات نے اس مادری زبان میں شاعری کی ہے، جناب انصار الحق کمپونڈر کے اشعار تو زبان زد تھے، میرے طالب علمی کے زمانہ میں ململ میں اپنی زبان میں انعامی مشاعرہ ہوا تھا، اس مشاعرہ میں ایک صاحب نے کمپیوٹر پر بڑی اچھی نظم کہی تھی، جبکہ انعام پانے والے ایک غیر مسلم شاعر تھے، انہوں نے بھی یہاں کی مادری زبان میں نظم پیش کی تھی۔

یہاں کی بولی میں اردو کے بعض اچھے محاورے کثرت سے استعمال ہوتے ہیں، بطور خاص عورتوں میں عام زبان میں ایسے الفاظ بے شمار ملتے ہیں جو اردو کے خالص ادبی الفاظ شمار ہوتے ہیں، ان الفاظ کا استعمال سننے والے کو ایک خاص مزہ دیتا ہے، گرچہ استعمال کرنے والے اس لفظ کی معنویت اور ادبی حسن سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں۔

اس قصبہ اور اس کے مضافاتی بستیوں میں شیخ برادری کے علاوہ کچھ دوسری برادریوں کے لوگ بھی ہیں، جن میں انصاری، لہیری، مونگیری وغیرہ شامل ہیں، یہ بہت کم تعداد میں ہیں، ان کی ثقافت میں ان کی برادری کے رسومات کا غالب حصہ شامل ہے، البتہ یہاں کی عمومی ثقافت کا اثر ان کی معاشرتی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔

ماضی کی معروف دینی، سماجی اور ادبی شخصیات

دینی تعلیم سے وابستہ شخصیات

مولانا زین الدینؒ

آپ کا شمار ان مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے قصبہ میں تعلیم کی شمع روشن کی، اور پوری عمر انہی اجالوں کے پھیلانے میں لگے رہے، آپ اس علاقہ کے پہلے فارسی داں عالم تھے، آپ کی فارسی دانی کا بڑا شہرہ تھا، مولانا ممتاز صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

> ’’حضرت مولانا زین الدین کا خاندان شرفاء میں شمار ہوتا تھا، آپ غازیپور کے مدرسہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مدرسہ رحمانیہ میں مدرس بنائے گئے، فارسی دانی میں بے مثل تھے، چنانچہ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دوردراز سے طلبہ یہاں آتے تھے، چونکہ اس وقت ملک کی زبان فارسی تھی، اس لئے ہندو مسلمان دونوں فارسی پڑھتے تھے‘‘ (یادداشت)

آپ کو مدرسہ رحمانیہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے، مگر میری تحقیق کے مطابق آپ مکتب کو مدرسہ کی شکل دینے والے یا مدرسہ کو منظم کرنے والے ہیں (اس کی تفصیل مدرسہ کی تاریخ میں آئے گی) آپ نے تعلیم کا باقاعدہ نظم کیا، بحیثیت استاد آپ کی بڑی شہرت تھی، فارسی میں کمال حاصل تھا، طلبہ دور دور سے آپ کے پاس پڑھنے آتے تھے، اس طرح بڑی تعداد میں طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا، اس طرح آپ کی خدمات اہم ہیں، تعلیم کے سلسلہ میں قصبہ کو جو شہرت حاصل ہوئی اس کے پیچھے آپ جیسے بے لوث اور مخلصین کی محنتیں ہیں، قاری ذوالفقار صاحب کے بقول ۱۹۳۰ء میں آپ کا انتقال ہوا، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے سن وفات ۱۹۳۷ء بتایا ہے۔

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، آپ بڑے

ادب کے ساتھ اپنے استاد کا نام لیتے ہیں، اور آپ کی خدمات کے بڑے معترف ہیں۔

قاری داؤدؒ

اپنے دور کے اچھے حفاظ اور قاریوں میں آپ کا شمار تھا، داناپور یا استھاواں میں تعلیم حاصل کی، آپ نے مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دی ہے، اور بقول مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب آپ اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، مدرسہ کے کاروائی رجسٹر میں ۱۹۵۵ء سے پہلے کے اساتذہ میں آپ کا نام ملتا ہے، آپ مچھلی کے بڑے شوقین تھے، کہا جاتا ہے کہ آپ شکار کے لئے چار پانچ میل دور تک چلے جاتے تھے، ۶۰۔۱۹۶۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

حافظ عبداللہؒ طوفانپور

حافظ عبداللہ بن وعظ الدین اپنے وقت کے جید حافظ تھے، تبلیغی کاموں میں سرگرم رہتے تھے، بنگال کے ضلع بردوان کے تیتل تلہ کی جامع مسجد میں تقریبا ۴۰؍سالوں تک امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، ساتھ ہی وعظ ونصیحت کے ذریعہ مسلمانوں کے اصلاح کی کوشش اور ان میں ایمان وعمل کی بیداری لانے کی کوشش کرتے رہے، اخیر عمر میں بیمار ہوکر وطن واپس آئے، اور چند سال بعد ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۱ء میں یہیں پیوند خاک ہوئے۔

حافظ فریدالدینؒ

آپ کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور حفاظ میں ہوتا ہے، قرآن اتنا یاد تھا کہ آپ کو حافظ ریل کہا جاتا تھا، مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دی، اس وقت قاری صابر صاحب بھی مدرسہ میں تھے، قرآن سے بڑا لگاؤ تھا، ہر وقت قرآن پڑھتے رہتے تھے، مختلف علاقوں میں تراویح سنائی، زندگی کا بڑا حصہ پٹنہ میں گزاری، آخری سال بھی تراویح سنائی، دو اور تین دنوں کی تراویح میں قرآن آسانی سے ختم کرلیتے تھے، مدرسہ رحمانیہ کے بعد اپنے محلّہ میں قرآن کی تعلیم دیتے رہے، آپ سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا ہے، طویل عمر پائی، اور تقریباً ۱۰۵؍سال کی عمر میں ۱۷؍جولائی ۱۹۷۹ء کو زندگی کی آخری سانس لی۔

مولانا ابوالحسن طوفانپوریؒ

مولانا ابوالحسن ابن محمد منیر الدینؒ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے نانیہال یکہتہ میں حاصل کی، اس وقت مدرسہ رحمانیہ ہی تعلیم کا واحد مرکز تھا، چنانچہ آپ کی ابتدائی تعلیم بھی یہیں ہوئی، مدرسہ میں دینیات اور فارسی کے ساتھ مڈل اسکول کی تعلیم بھی جاری رہی، مڈل پاس کرنے کے بعد مدرسہ نصرت الاسلام نرھیا میں داخلہ لیا، اس وقت یہ مدرسہ عروج پر تھا، وہاں عربی کی ابتدائی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عزیزیہ کا رخ کیا، گھریلو مسائل کی وجہ سے آگے کی تعلیم جاری نہ رہ سکی، اور آپ کو معاش کی طرف توجہ دینی پڑی، لیکن اسی مدت میں آپ نے بڑی صلاحیت پیدا کرلی، فارسی، ریاضی کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

آپ نے متعدد مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دی، تدریس کے لحاظ سے آپ کا سب سے سنہرا دور اور آپ کی سب سے بڑی خدمت مدرسہ اسلامیہ کی آبیاری ہے، اس مدرسہ کو مکتب سے مدرسہ بنانے اور اسے سنوارنے میں آپ کا بڑا اہم کردار رہا ہے، ۱۹۶۱ء میں جب گاؤں کے مکتب کو دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ یہاں کے ارباب دانش نے کیا تو سبھوں کی نظر آپ پر پڑی، چنانچہ آپ ۱۹۶۱ء میں پورخالی پورنیہ کے مڈل اسکول کو چھوڑ کر وطن آئے اور مدرسہ میں تدریس اور انتظام کی ذمہ داری سنبھالی، جسے اخیر تک نبھاتے رہے، یعنی ۱۹۸۰ء تک صدر مدرس کی حیثیت سے یہاں علم کی روشنی پھیلانے اور قوم کے بچوں کے مستقبل سنوارنے میں لگے رہے، اس مدت میں آپ سے بلا مبالغہ سیکڑوں لوگوں نے استفادہ کیا، گاؤں کے اکثر مولانا اور ماسٹر صاحبان آپ ہی کے شاگرد ہیں۔

مولانا بڑے متواضع، با اخلاق، ملنسار، اور ملت کا درد رکھنے والے تھے، خصوصا تعلیم کے بارے میں بڑی فکر رکھتے تھے، بیعت کا تعلق پیر طریقت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سے تھا، اخیر وقت تک معمولات ادا کرتے رہے، فروری ۱۹۸۰ء کے آخری ہفتہ میں اچانک فالج کا حملہ ہوا، جس سے جانبر نہ ہوسکے، اور ۶/مارچ ۱۹۸۰ء مطابق ۱۸/ربیع الثانی ۱۴۵۵ھ کو دار

فانی سے دار جاودانی کے لئے روانہ ہوگئے۔

مولانا حکیم زین الدینؒ

آپ اپنے زمانہ کے فاضل تھے، جونپور کے کسی مدرسہ سے تعلیم پائی، اور سند فراغت حاصل کی، قدیم زمانہ کی روایت کے مطابق آپ نے دینی تعلیم کے ساتھ حکمت بھی سیکھی، حکمت میں آپ کو بڑا درک تھا، چنانچہ تعلیم کی تکمیل کے بعد حکمت کو اپنا مشغلہ بنایا، دربھنگہ میں اپنا مطب شروع کیا، اور اس فن میں بڑا نام کمایا، تقریباً دس بارہ سال یہاں رہے، اس کے بعد قصبہ میں رہنے لگے، یہاں کاشتکاری کا کام دیکھتے تھے، ساتھ ہی علاج ومعالجہ کا سلسلہ بھی جاری رہا، آپ کے پاس علاقہ سے بہت سے مریض آتے تھے، مولانا اسلم قاسمی صاحب کے بقول آپ کا انتقال آج سے تقریبا پچپن سال قبل ہوا، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حکیم کا تذکرہ دربھنگہ سے شائع کتاب ''تذکرہ حکماء بہار'' میں موجود ہے، راقم کو یہ کتاب نہیں مل سکی، اگر واقعی آپ کا تذکرہ موجود ہے تو آپ کے لئے ایک سند اور قصبہ کے لئے باعث فخر ہے۔

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے بتایا کہ آپ طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ تھے، حکمت کی باضابطہ آپ نے تعلیم حاصل کی تھی، گھر پر ہی مطب کرتے تھے۔

قاری یعقوبؒ

آپ کے تعارف کے لئے یہی کافی ہے کہ مولانا ممتاز علی مظاہری کی تعلیم وتربیت جن کے ہاتھوں ہوئی وہ یہی چچا ہیں، والد کا نام پیغمبر بخش تھا، اچھے قاریوں میں شمار تھا، قاری ضیاء الدین الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا، پچیس تیس سال تک بھوارہ کے مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دی۔

مدرسہ رحمانیہ میں آپ نے مختلف اوقات میں تدریسی خدمت انجام دی، ۵۲ء میں چھ ماہ مدرسہ میں رہے، اس کے بعد ۵۴ء میں پھر بحال ہوئے، ۵۶ء کے اساتذہ کی فہرست میں بھی آپ کا نام شامل ہے، نومبر ۵۶ء میں آپ کے استعفیٰ کا ذکر ہے۔ (کاروائی رجسٹر)

آپ ہی کے مشورہ سے مولانا ممتاز علی صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے مظاہرعلوم سہارنپور گئے ،مولانا ممتاز صاحب کے بقول آپ بہت ظریف آدمی تھے،شعروشاعری سے ذوق رکھتے تھے، یہاں کا مشاعرہ جن افراد کے مرہون منت تھا ان میں ایک آپ بھی ہیں،آپ اپنا کلام پڑھتے تھے یا دوسروں کا،اس کے بارے میں صحیح معلومات نہیں مل سکی،آپ کا کوئی کلام اب محفوظ نہیں ہے،ایک مصرعہ جو اس زمانہ میں زبان زد ہوا اس طرح ہے:

جو بات یعقوب میں ہے اوروں میں کہاں

حافظ محمد عقیلؒ

حاجی حافظ محمد عقیل کے والد کا نام لیاقت علی تھا،آپ نے حفظ قرآن کی تکمیل مدرسہ چشمۂ فیض ململ میں کی، وہاں اس زمانہ میں گڑھول شریف کے ایک استاد تعلیم دیتے تھے،ان سے ہی آپ نے تعلیم پائی،اس کے بعد مدرسہ رحمانیہ،نرہیا کے مدرسہ اور مختلف اداروں میں قرآن کی خدمت انجام دیتے رہے،بحیثیت استاذِ حفظ بھی آپ بہت معروف ہوئے،آپ سے استفادہ کرنے والوں اور بطور خاص حفظ قرآن کی تکمیل کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے،مشہور حافظ جناب حافظ حبیب الحسن صاحب،حافظ عبدالقدوس صاحب،حافظ منظور صاحب،عبدالحی پیامی صاحب آپ کے شاگرد ہیں،آپ کے پوتے قاری نثار قاسمی صاحب بتاتے ہیں کہ اس دور کے جو حافظ بھی تھے وہ سب آپ ہی کے شاگرد تھے۔

آپ اپنے دور کے جید حفاظ میں سے تھے،قرآن شریف بہت یاد تھا،حافظہ اتنا قوی تھا کہ آیت پارہ،رکوع اور صفحہ کی تعیین کے ساتھ بتادیتے تھے۔

قاری نثار قاسمی صاحب بتاتے ہیں کہ دادا کہتے تھے کہ میں نے ۵۲ سال تک تراویح سنائی،شبینہ بھی کثرت سے سناتے تھے،بہت نیک،دیندار اور تہجد گزار تھے،مولانا محمد علی مونگیری جب قصبہ میں تشریف لائے تو آپ نے اسی موقعہ پر بیعت کی سعادت حاصل کی، آپ خانقاہ مونگیر جایا کرتے تھے،آپ مولانا منت اللہ رحمانی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، تقریباً ۷۷ءیا اس کے آس پاس آپ کا انتقال ہوا۔

اسحٰق عرف نتھو پنڈتؒ

آپ کا نام اسحٰق تھا،جس وقت تعلیم یافتہ لوگ انگلیوں پر گنے جاتے تھے،اس وقت آپ علم کی دولت سے بہرہ مند تھے،اسی وجہ سے پنڈت کے نام سے معروف تھے،صوم وصلوۃ کے انتہائی پابند تھے،علاقہ میں میلاد پڑھنے جاتے تھے،وعظ ونصیحت آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب اپنی یادداشت میں لکھواتے ہیں کہ:

> نتھو پنڈت سرزمین یکہتہ کی اہم شخصیتوں میں سے ہیں، یہ ظہر کی نماز کے بعد پانچ منٹ کے لئے مدرسہ ضرور آتے،اور جن لڑکوں کے سر پر ٹوپیاں نہیں ہوتیں ان کو زدوکوب کرتے،اور کہتے ٹوپی پہن کر آیا کرو، ورنہ سخت سزا دیں گے، وعظ بھی بہت اچھا کہتے تھے۔ (یادداشت)

مولانا صابر قاسمیؒ

ناخدا مسجد کلکتہ کے حوالہ سے آپ کی شخصیت بہت مشہور رہی ہے،آپ کے والد محترم کا نام محی الدین ہے،جو مڈل اسکول میں ٹیچر تھے،آپ اصلاً ململ کے رہنے والے ہیں،نانیہال یکہتہ تھا،آپ نانیہال میں ہی رہ گئے،آپ نے مدرسہ چشمۂ فیض ململ میں حفظ قرآن کی تکمیل کی،اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور وہیں سے سند فراغت حاصل کی،تعلیم کی تکمیل کے بعد جامع مسجد کی امامت اور مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دی،۵۵ء میں آپ مدرسہ میں مدرسِ دوم کی حیثیت سے بحال ہوئے،۵۷ء میں آپ نے استعفیٰ دیدیا،۵۸ء میں پھر بحال ہوئے،مگر اس بار بھی استقرار نصیب نہیں ہوا،اور ۵۹ء میں مدرسہ سے مستعفی ہوکر چلے گئے۔مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کے غائبانہ میں کچھ عرصہ تک آپ مدرس اول (صدر مدرس) بھی رہے۔

اس طرح مدرسہ رحمانیہ میں متعدد سال تک تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد آسنسول کے جہانگیری مسجد میں امامت شروع کی،اس کے بعد کمپنی باغ مظفر پور میں امام

ہوئے، یہاں آپ قرآن کی تفسیر بھی بیان کرتے تھے،اس درس قرآن کی وجہ سے آپ کوشہرت ملنے لگی،اسی زمانہ میں حاجی عثمان جوناخدامسجد کلکتہ کے کمیٹی کے رکن یامتولی تھے،مظفر پورآیا کرتے تھے، یہ اسی مسجد میں نماز پڑھتے ،آپ کے درس قرآن کی مجلس میں شریک ہوئے تو آپ سے بڑے متاثر ہوئے ،اس وقت کمیٹی والے ناخدامسجد کے امام کو ہٹانا چاہتے تھے،مگر ان کو کوئی مناسب امام نہیں مل پارہا تھا،حاجی عثمان صاحب کے دل میں آپ کا نام آیا،مگرقبل اس کے کہ وہ اس خیال کا اظہار کرتے ،مولانامظفر پور سے ٹاٹااور پھر وہاں سے شیوپور کلکتہ جا پہونچے،اب حاجی عثمان صاحب نے آپ کی تلاش شروع کی ،اوراس طرح آپ کوڈھونڈتے ہوئے شیوپور پہونچے ،انہوں نے آپ سے ناخدامسجد کی امامت کی پیش کش کی ،مولانا نے اسے قبول کیا،یہیں سے آپ کا ستارۂ اقبال چمکا اور آپ شہرت کی بلندی تک جاپہونچے۔

کلکتہ کی ناخدامسجد ہندوستان کی دیگر شاہی مسجدوں کی طرح اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے،اس کی یہ حیثیت عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں معروف ہے، یہاں آپ کی حیثیت صرف امام کی نہیں بلکہ ایک مذہبی رہنما کی ہوگئی،اب آپ کلکتہ بلکہ مغربی بنگال کے مذہبی رہنما تھے،مسلمانوں کے ملی قائد تھے،مسلمانوں کی رہنمائی اورسماجی خدمت دونوں کام انجام دیتے تھے،اہم مسائل میں جہاں آپ مسلمانوں کی رہنمائی کرتے وہیں بعض نازک اورحساس مسائل میں حکومت بھی آپ سے مشورہ لیتی ،فتوی کے لئے بھی آپ کی طرف رجوع کیا جاتا،اورآپ فتوی بھی دیتے تھے،اس طرح گویا آپ ناخدامسجد کے بے تاج بادشاہ تھے،یہیں خدمت کرتے ہوئے آپ کا وقت موعود آپہونچا اوراسی سرزمین میں آسودہ ٔخاک ہوئے۔

آپ ایک باصلاحیت مدرس تھے، باکمال خطیب تھے،آپ کے معاصرین کی رائے ہے کہ کتابی صلاحیت بھی بہت عمدہ تھی ،عربی پراچھی قدرت رکھتے تھے، بلاتکلف عربی بولتے بھی تھے،آپ نے زندگی کا اکثر حصہ امامت میں گزاری ،اگرتدریس سے وابستہ رہتے تو اس فن میں بھی ایک حیثیت ہوتی ،اورآپ کا فیض آپ کے شاگردوں کے ذریعہ جاری رہتا۔

مولانا ظفر شبیر ظفرؒ

حافظ فرید الدینؒ کے وہ فرزند جس نے اپنے عزم وحوصلہ کی مثال قائم کی،ان کا نام ظفر شبیر ہے،ظفر ہی تخلص تھا،انگریز کی فوج میں شامل تھے،اچانک تقریباچالیس سال کی عمر میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، جب اپنے اس شوق کا اظہار کیا تو لوگوں نے نہ معلوم کیا کیا کہا ہوگا ،مگر جودھن کے پکے ہوتے ہیں ان کے سامنے روایتوں کے بندھن ٹک نہیں پاتے ، چنانچہ عزم وحوصلہ لئے بہرائچ یوپی پہونچے ، جہاں مولانا محفوظ الرحمٰنؒ کی شکل میں آپ کو رہبرمل گیا، انہوں نے کہا کہ تعلیم کی راہ میں عمر مانع نہیں ہوتی ، چنانچہ ان کی سرپرستی ونگرانی میں تعلیم شروع کی ،حوصلہ وہمت کی دولت پہلے سے لے کر آئے تھے،محنت ولگن اورتوجہ کو اب اپنا رفیق بنایا، اورآٹھ سال کے بعد جب یہاں سے تعلیم مکمل کی تو آپ ایک جید عالم دین تھے،تبلیغ کا جذبہ دل میں موجزن تھا، یہاں سے وطن پہونچے ،اوراپنے بھائیوں کو دین سے واقف کرانے کی محنت شروع کی، پھر مدرسہ رحمانیہ میں مدرس ہوئے ،۱۹۸۰ء کی کاروائی رجسٹر میں آپ کا نام مدرسہ کے اساتذہ میں شامل ہے، یہاں دس سال تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اس کے بعد بہار شریف پہونچے اور مدرسہ معین الاسلام میں صدر مدرس ہوئے ، یہاں بھی آٹھ سال تک رہے، واپسی پر ایک بار پھر مدرسہ رحمانیہ میں تدریس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا۔

تدریس کے علاوہ آپ کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے علاقہ سے بدعات کوختم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا،اس زمانہ میں یہ پورا علاقہ بدعات میں ڈوبا ہوا تھا،میلاد میں قیام، فاتحہ ،نذر وغیرہ کا خوب رواج تھا،ایسے وقت میں بدعات کوختم کرنے میں جن حضرات نے اپنی بے پناہ کوششیں صرف کیں ان میں ایک اہم نام آپ کا بھی ہے۔

شعر وشاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے،آپ کے فرزند جناب انیس الرحمٰن صاحب سے آپ کی شاعری اورآپ کے کلام کے بارے میں دریافت کیا تو گلوگیر ہوگئے اور بڑے نمناک لہجہ میں بتایا کہ ایک برسات میں والد محترم کا مکان گرگیا،جس کے نتیجہ میں ان کا سارا ادبی سرمایہ ضائع ہوگیا،اس زمانہ میں مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے،طرحی مشاعرے بھی

ہوئے ہیں، نیز شادی میں سہرا کہنے کا بھی خوب چلن رہا ہے، موصوف ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے، آپ کا اکثر کلام تو ضائع ہوگیا، البتہ اس کا کچھ حصہ ان کے پاس محفوظ رہا، ان کی ڈائری میں جو حصہ محفوظ ہے ان میں حالات حاضرہ سے متعلق نظمیں، غزلیں، سہرے، وغیرہ شامل ہیں، بطور نمونہ آپ کا کچھ کلام یہاں نقل کرتے ہیں:

ایک نظم اس طرح ہے:

رب شناسی کے لئے گوشہ نشینی ہے ضرور
تنہائی کو سمجھے گا خود کو جو کوئی تنہا ہوگا
مرکے ہوگا اس جاگے ہوئے دل کو راحت
ٹھنڈی نیند سوئے گا جو یہاں جاگا ہوگا
اپنی تو سوچ میں بڑھاپے کی جوانی گزری
رات بھر خوف رہا کہ صبح کو اب کیا ہوگا
بے وفائی سے ظفرؔ تم کو ہر دم ہے خیال
تم جو اپنے نہ ہوئے کون کسی کا ہوگا

امتحان کے ایک موقعہ پر کہتے ہیں:

حصہ کیا ملے گا انہیں پاس فیل میں
جس نے کبھی کتاب نہ کھولی کلاس میں
چٹ آئے گی نہیں، وہ لکھے گا کس طرح
گزرگیا وقت اس کا اداس میں

ایک غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں:

دن رات تیرے ظلم وجفا کا ہے یہ عالم
اب ہمیں تیرا ظلم اکسانے لگا ہے
کیا تم ہو، کیا ہم ہیں؟ یہ تاریخ سے پوچھو

ہم گر کہیں تجھ سے تو بکھلانے لگا ہے
دل خون ہوا تیرا ظفرؔ ظلم سے کس کا
خون تیرا قلم آج تو ٹپکانے لگا ہے

خود اپنے بارے میں کہتے ہیں:

توبہ کو توڑ تاڑ کے پیتا ہوں اس لئے
میخانہ اجل تو خدا ہی کے گھر میں ہے
محفل خموش، رند بھی چپ، ساز بند بند
کیا سوز، کیا کمال، بیانِ ظفرؔ میں ہے

۴/ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

حافظ مجیب الحسنؒ

حافظ مجیب الحسن صاحبؒ ایک پوری نسل کے مربی تھے، آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ کے ذریعہ قصبہ واطراف میں حفظِ قرآن کا رجحان عام ہوا، اور علاقہ کے بے شمار لوگوں کو حفظ قرآن کی سعادت حاصل ہوئی، کہا جاتا ہے کہ آپ کے دور کے اکثر حفاظ اور علماء آپ سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں، آپ استھاواں کے فیض یافتہ تھے۔

طوفانپور میں آپ نے ایک مدت تک تدریسی خدمت انجام دی، وہاں آپ کے ذریعہ ہی گویا تعلیم کا فروغ ہوا، آپ کی کوششوں سے تعلیم کی طرف خاطر خواہ بیداری آئی، طوفانپور کے علاوہ مدرسہ رحمانیہ، مالدہ ضلع کچھ بہار (بنگال) اور پٹنہ میں تدریس وامامت کی خدمات انجام دیں۔

مدرسہ رحمانیہ میں آپ کی تقرری کے بارے میں مجلس منتظمہ کی میٹنگ کی جو کاروائی رپورٹ درج ہے، اس سے آپ کی مردم سازی کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، ۱۵/ نومبر ۵۹ء کی کاروائی رجسٹر میں درج ہے:

دیگر ضروریات کے ضمن میں صدر جلسہ (حاجی عبدالرؤف صاحب) نے

جملہ اراکین سے یہ کہا کہ حفظ درجہ میں اچھے استاد نہ ہونے کے باعث اس درجہ کی تعلیم کما حقہ انجام پذیر نہیں ہو رہی ہے، گارجین لوگوں کا بھی مطالبہ شدید ہے کہ اچھے حافظ کی تقرری اس درجہ کے لئے ہو، صدر جلسہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ حافظ مجیب الحسن سابق پیش امام جامع مسجد یکہتہ طوفانپور کی ملازمت کو ترک کر چکے ہیں، اور ملازمت کی تلاش میں باہر گئے ہوئے ہیں، ان کے بھائی حافظ محبّ الحسن کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ حافظ مجیب الحسن داناپور میں مقیم ہیں، اور ملازمت کی تلاش میں ہیں، لہذا میری رائے ہے کہ حافظ مجیب الحسن کی تقرری کر لی جائے، جملہ اراکین نے صدر جلسہ کی اس رائے کو پسند کیا اور متفقہ طور پر ان کی تقرری کو منظور کیا اور یہ پاس کیا کہ ان کو ......مشاہرہ ملے گا، کیونکہ اچھے استاد ہیں، اور ان کے طعام و قیام کا نظم بھی بذریعہ ٹیوشن کر دیا جائے گا'' (کاروائی رجسٹر)

آپ ۱۹۶۰ء میں مدرسہ میں بحال ہوئے اور ۱۹۹۰ء تک یہ خدمت انجام دے کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تدریس کے علاوہ آپ نے زمانہ تک جامع مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دئے، آپ کے بارے میں مشہور تھا کہ جنات بھی آپ سے پڑھتے ہیں، ۲۶/اپریل ۲۰۰۱ء میں آپ کا انتقال ہوا، آپ کی تاریخ پیدائش ۱۳، جولائی ۱۹۳۱ء ہے۔

حافظ شبیر احمدؒ طوفانپور

حافظ عبداللہؒ کے فرزند حافظ شبیر احمد قرآن کے خادموں میں سے ہیں، والد صاحب کی بیماری کے بعد ان کی جگہ تیتل تلہ (بردوان) کی جامع مسجد میں امامت شروع کی اور تقریباً ۱۵/سالوں تک امامت کے فرائض انجام دئے، آپ کو قرآن بہت یاد تھا، متشابہات والی آیات بہت زیادہ یاد تھیں، ہمیشہ رمضان میں تراویح سنانے کا معمول تھا، ایک طویل بیماری کے بعد آپ نے وفات پائی۔

حافظ محمد ادریسؒ

حافظ محمد ادریس صاحب اپنے دور کے ممتاز حفاظ میں شمار ہوتے تھے، والد کا نام حکیم زین الدین ہے، گھر پر کاشتکاری کرتے تھے، مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم بیان کرتے ہیں کہ آپ مدرسہ عزیزیہ سے فارغ تھے، اچھے حافظ تھے، قرآن تجوید سے پڑھتے تھے۔

قاری محمد ایوبؒ

حکیم زین الدین صاحب کے دوسرے صاحبزادے قاری محمد ایوبؒ کا شمار اس دور کے اچھے قراء میں ہوتا تھا، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے اپنی یادداشت میں انہیں 'رئیس القراء' لکھا ہے، آپ بھی قاری ضیاء الدین الہ آبادی کے شاگردوں میں سے ہیں، رنگون کے علاوہ کلکتہ کی ناخدا مسجد اور عینی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دئے۔

حافظ صدیقؒ

حافظ صدیق بن جمال احمد اپنے وقت کے مشہور حفاظ میں سے تھے، نرہیا میں تعلیم حاصل کی، جہاں مولانا منور حسین صاحب کی رفاقت نصیب رہی جو بعد میں علم اور تصوف کی دنیا کی بڑی شخصیت بنی، مولانا سے آپ کے گہرے مراسم تھے، تعلیم کے بعد پورنیہ کے چھہری قصبہ میں حفظ قرآن کی تعلیم دینے لگے، ساتھ ہی امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، بڑی تعداد میں طلبہ نے آپ سے اکتساب فیض کیا اور آپ کے پاس حفظ قرآن کی تکمیل کی، قصبہ کے حافظ منظور صاحب اور مولانا احمد حسین مظاہری آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

اکابر علماء سے تعلق رکھتے تھے، بیعت و ارادت کا تعلق حضرت مولانا محمد علی مونگیری سے تھا، ۱۹۸۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

مدرسہ رحمانیہ کے بڑے معاون تھے، ہر سال اپنے طور پر رقم اکھٹا کر کے مدرسہ کو بھیجا کرتے تھے، مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

حافظ صدیق مدرسہ کے ابناء قدیم میں سے ہیں، انہوں نے مدرسہ کے تعاون

کے سلسلہ میں بڑی قربانیاں دیں، مجھے اور حافظ عبدالقدوس صاحب کو پورنیہ بلایا، چندہ کرایا، مدرسہ کا تعارف کرایا، اور جب تک زندہ رہے مدرسہ کو اپنے علاقہ سے کافی چندہ کی رقم بھیجتے تھے، میں نے باربار درخواست کی کہ کچھ محنتانہ لے لیں، مگر انہوں نے انکار کیا، میرا خیال ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے چھپری سے لاکھوں روپئے وصول کر کے مدرسہ کو بھیجا۔ (یادداشت)

قاری محمودؒ

آپ نے داناپور سرائے کی مسجد میں عرصہ تک امامت کے فرائض انجام دئے، وہاں کے اعلی تعلیم اور روساء کے گھرانے میں آپ کے اچھے مراسم تھے، ان گھرانوں کے اکثر بچوں نے آپ سے ہی دینی تعلیم حاصل کی، فیضان احمد، مولانا مختار علی، سونو بابو وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں، مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم بھی آپ کے فیض یافتہ ہیں۔

مولانا عبدالغفار قاسمیؒ

مضافاتی گاؤں مہراجپور کے ایک دینی گھرانہ کے چشم و چراغ تھے، ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی، وہیں حافظ منظور صاحب سے حفظ کی تکمیل کی، اس کے بعد مدرسہ رحمانیہ میں داخل ہوئے، یہاں سے سہارنپور پہونچے، اور مظاہر العلوم کی شاخ میں چار سال رہے، پھر شرح جامی میں مظاہر میں داخل ہوئے، مگر اسٹرائک کی وجہ سے یہاں کی تعلیم کو چھوڑ دیا اور دارالعلوم میں داخلہ لے لیا، اور پھر یہیں سے ۱۹۶۴ء میں سند فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد سہرسہ سوپول میں ایک مدرسہ میں رہے، مگر راستہ کی ناہمواری کی وجہ سے وہاں طبیعت نہ لگی، چنانچہ اس کے بعد جانسی پٹی، ستروپٹی کے مدرسہ منت الاسلام میں تدریسی خدمت شروع کی، یہ مدرسہ مولانا منت اللہ رحمانی کی طرف منسوب ہے، جب یہ مدرسہ بورڈ سے ملحق ہوا تو آپ صدر مدرس بنے، یہاں تقریبا چالیس سال تک تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، اس علاقہ میں آپ کے ذریعہ علم کی روشنی پھیلی، پوری ایک نسل آپ سے فیضیاب ہوئی، آپ کے تلامذہ

بہت ہیں، جن میں مولانا فیاض رحمانی (صدر مدرس مدرسہ منت الاسلام) مفتی امام الدین، مولانا اشرف عالم (یہ دونوں گجرات میں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں) اور مولانا ابوبکر رحمانی (استاد مدرسہ رحمانیہ یکہتہ) قابل ذکر ہیں، علم کی شمع روشن کرنے کے ساتھ آپ نے یہاں کے عوام میں دینی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی، بدعات کا بڑا زور تھا، آپ نے حکمت عملی کے ساتھ ان بدعات کو ختم کیا، ان خدمات کی وجہ سے اس علاقہ میں آپ کا بڑا احترام تھا، دلوں میں بڑی قدر تھی، اور اب بھی یہاں کے لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں۔

آپ بڑے اخلاق مند، تقوی شعار اور انتہائی سادہ لوح تھے، نرمی، سادگی اور تواضع طبیعت میں ایسی رچی بسی تھی کہ ان چیزوں میں آپ کی مثال دی جاتی تھی، تقوی اور طہارت کی ایسی مثال کم دیکھنے کو ملتی ہے، بلاشبہ ان کو دیکھنے سے احساس ہوتا تھا کہ بزرگ کیسے ہوتے ہیں، رشتہ میں آپ میرے خالو تھے۔

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب سے میرا تعارف انہی کی ذریعہ ہوا، یہ اس وقت کی بات ہے جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شاید عالیہ ثانیہ کا طالب علم تھا، مولانا کی مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب سے بڑی قربت تھی، مولانا اکثر شام کے وقت خالو محترم کے پاس آتے تھے، ایک بار میں اپنے خالو سے ملنے پہونچا تو دیکھا کہ دونوں حضرات ایک موٹی کتاب کھولے کچھ ڈھونڈھ رہے ہیں، مجھے دیکھتے ہی خالو نے کہا کہ فلاں حدیث تلاش کرو، میں اسی سال مشکوۃ پڑھ رہا تھا، اور وہ حدیث چند دنوں قبل ہی پڑھی تھی، چنانچہ میں نے فوراً وہ حدیث نکال دی، یہ دیکھ کر مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب بہت خوش ہوئے اور بڑی دعائیں دی، اسی دن سے مولانا مجھے پہچاننے لگے، یہ مولانا دامت برکاتہم سے گویا میرا پہلا باضابطہ تعارف تھا۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے بھی اچھے تعلقات تھے، دوسرے بزرگوں سے بھی روابط تھے، قاری محمد صدیق باندویؒ سے بھی خط و کتابت تھی، آپ تاعمر مختلف امراض کے شکار تھے، شاید یہ اللہ تعالی کی طرف سے کوئی آزمائش تھی، جسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتے رہے، اخیر میں مرض بڑھتا گیا، بالآخر ۱۱؍رمضان المبارک ۲۰۰۲ء کو یہ عظیم شخصیت اللہ کو پیاری ہوگئی۔

مفتی فیض الرحمٰن مظاہریؒ طوفانپور

مولانا فیض الرحمٰن مظاہری صاحبؒ کا شمار علاقہ کے معروف ومشہور شخصیات میں تھا، آپ کے والد کا نام محمد ایوب ہے، ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی، مزید تعلیم کے لئے سہارنپور کا رخ کیا، وہاں حفظ قرآن کی تکمیل کی، پھر درس نظامی کی شروعات کی، اور مختلف درجات کو مکمل کرتے ہوئے ۱۹۶۹ء میں دورہ حدیث کی سعادت حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے اور مدرسہ رحمانیہ میں استاد مقرر ہوئے۔

مولانا علوم اسلامیہ میں امتیازی صلاحیت کے مالک تھے، کتب درسیہ میں مہارت حاصل تھی، حدیث اور فقہ دونوں پر گہری نظر تھی، آپ جس وقت مدرسہ رحمانیہ کے استاد مقرر ہوئے اس وقت یہاں اعلی درجہ تک تعلیم ہوتی تھی، چنانچہ مولانا کو ان کی صلاحیت کی وجہ سے حدیث وفقہ کی اونچی کتابیں پڑھانے کو ملیں، آپ نے سنن ترمذی کا بھی درس دیا ہے، اس طرح آپ کا علمی فیض عرصہ تک جاری رہا اور کثیر تعداد میں تشنگان علوم آپ سے سیراب ہوئے، مولانا اسلم قاسمی صاحب جو ان کے ابتدائی زمانہ میں مدرسہ رحمانیہ میں استاد تھے آپ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ مولانا کی درسی صلاحیت بہت مضبوط تھی، ان کے مدرسہ میں آجانے کی وجہ سے مجھے بڑی سہولت ہوئی اور درسی بوجھ کم ہوا۔

علم کے ساتھ اخلاق، مروت، شرافت جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف تھے، تدریس کے ساتھ دارالافتاء کی ذمہ داری بھی سنبھالتے تھے، مدرسہ کی طرف سے آپ افتاء کے لئے باضابطہ نامزد تھے، اس زمانہ میں فتاوی کا نقل رکھنے کا اہتمام نہیں تھا، اس لئے فتاوی کی نوعیت پر اظہار خیال مشکل ہے، آپ کے احباب بتاتے ہیں کہ قصبہ واطراف کے علاوہ نیپال تک سے فتوی کے لئے مدرسہ رحمانیہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اکثر سوالات طلاق، میراث وغیرہ سے متعلق ہوتا، سال میں اوسطاً پچاس کے قریب ضرور سوالات آتے تھے، آپ کی عدم موجودگی میں عموماً اور بسا اوقات آپ کی موجودگی میں بھی مولانا منظور احمد شمسی صاحب فتوی لکھا کرتے تھے۔

اخیر عمر میں مولانا محب الحسن مظاہری صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد ۱؍مارچ ۲۰۰۴ء کو آپ پرنسپل بنائے گئے، پرنسپل شپ کی تجویز میں آپ کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں درج ہے:

> مولانا فیض الرحمٰن صاحب کی درخواست برائے پرنسپل پر غور وخوض کے بعد ان کی حسن کارکردگی، تنظیمی وانتظامی صلاحیت، دوسالہ انچارج کی ذمہ دارانہ عمل، اور سینئریٹی کی بنیاد پر باتفاق رائے پرنسپل کے عہدہ پر ترقی کی منظوری دی جاتی ہے۔ (کاروائی رجسٹر، ص:۱۸۳)

اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد زندگی نے وفا نہیں کی، جلد ہی آپ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوگئے، جس کی وجہ سے مدرسہ جانا ترک ہوگیا، چند سال کی بیماری کے بعد وقت موعود آپہنچا اور ۱۹؍شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۲؍اگست ۲۰۰۸ء بروز جمعہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

حافظ محمد داؤدؒ طوفانپور

بچوں کے خاص استاد، ایک بارعب شخصیت، سختی میں اتنے مشہور کے بچے جن کا نام سن کر خوف کھاجائیں، مگر اندر سے اتنے ہی نرم، حددرجہ شفیق، مخلص، اور بچوں سے محبت کرنے والے، یہ تھے ہم سبھوں کے استاد حافظ داؤد صاحب، سند کے اعتبار سے صرف حافظ، مگر تدریس اور خصوصاً بچوں کو پڑھانے کے فن سے خوب خوب واقف، بلکہ بہت سوں سے اچھے، مدرسہ اسلامیہ میں داخل ہونے والے اس طالب علم کا پہلا سابقہ آپ ہی سے پڑا، شاید ''پانا جانا'' نامی کوئی کتاب تھی، جس کا پڑھنا حافظہ میں اب تک محفوظ ہے، کلاس میں ایک مرتبہ ''گوشت'' کی ہجے پوچھی، کوئی بھی صحیح ہجے نہیں کرسکے، صرف ایک مسکین صورت طالب علم نے صحیح جواب دیا، اس وقت آپ کی خوشی دیدنی تھی، خوش ہوکر ایک چونی انعام دیا، یہ اس وقت کی چونی تھی جس نے اس طالب علم کو باعث فخر اور ہمارے لئے قابل رشک بنادیا۔

آپ کے والد محترم حافظ محمد مسلم بھی تدریس سے وابستہ تھے، وہ اپنے دور میں میاں جی کہلاتے تھے، وہی اس وقت گاؤں میں دینی فکر رکھنے والے اور دینی علم سے بہرہ مند تھے،

۱۹۲۷ء میں حافظ داؤد صاحب کی پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی، پھر ململ پہونچے، حفظ کی تعلیم کے لئے جس کی طوطی بولتی تھی، آپ نے وہیں سے حفظ قرآن کی تکمیل کی، اس کے بعد مزید تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رہا، اور آپ درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔

مدرسہ اسلامیہ کا جب الحاق مدرسہ بورڈ سے ہوا اس وقت حافظ کے پوسٹ پر آپ کی تقرری ہوئی، ایک طویل عرصہ تک آپ نے تدریس کی خدمت انجام دی، اللہ تعالی نے آپ سے بڑا کام لیا، اہل علم جانتے ہیں کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم کتنا مشکل کام ہے، بننے اور بگڑنے کی اس عمر کے بچوں کی صحیح رہنمائی، کلاس کے بچوں سے اپنے حقیقی بچوں سی محبت، کتاب کو گھول کر پلانے کی فکر اور ہر بچہ کو اونچا سے اونچا اڑنے کی خواہش اور جذبہ، یہ چیزیں ایک کامیاب استاد کی علامت ہیں، اور مولانا میں نہ صرف یہ صفات بدرجہ اتم موجود تھے بلکہ ان چیزوں میں آپ کی حیثیت نمونہ اور آئیڈیل کی تھی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالی نے آپ کو ایک اور علم سے نوازا تھا، جس سے اطرف واکناف کے خلق خدا کو بڑا فیض پہونچا، وہ یہ کہ آپ سانپ کاٹنے کا کامیاب علاج جانتے تھے، کچھ آیتیں پڑھ کر متاثر شخص پر دم کرتے، پیٹھ پر پیتل کی تھالی رکھتے، اگر زہر کا اثر ہوتا تو وہ تھالی پیٹھ سے چپک جاتی، آپ آیتیں پڑھتے جاتے اور تھالی پر کنکر مارتے جاتے، اس طرح دھیرے دھیرے زہر کا اثر کم ہوتا جاتا، اور جب مکمل اثر ختم ہوجاتا تو تھالی پیٹھ سے خود بخود گر جاتی، یہ علاج بہت ہی مؤثر ہوتا تھا، اس کا شہرہ پورے علاقے میں تھا، پورے علاقے سے لوگ آتے، اور آپ کا یہ حال تھا کہ مریض کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر فوراً اس کے علاج کے لئے تیار ہوجاتے، کوئی دیر رات آئے، صبح سے پہلے آئے یا دوپہر کی دھوپ میں، آپ کے چہرہ پر شکن تک نہیں آتی، تمام کام چھوڑ کر اس کی تدبیر کرتے، اور یہ سارا کام بلا معاوضہ ہوتا، خدا کے بندوں کی خدمت کرنے والے ہمارے یہ مثالی استاذ جنت میں کس کس طرح سے نوازے جائیں گے وہ تو جنتی ہی دیکھیں گے۔

حافظ صاحبؒ اخلاق، مروت، اور شرافت میں واقعی بے مثال تھے، اتنے بےنفس اور بے ضرر آدمی راقم کی آنکھوں نے صرف دو ہی دیکھیں ہیں، ایک آپ، اور دوسرے خالو محترم جناب مولانا عبدالغفار قاسمیؒ، یہ دونوں گویا شرافت اور بےنفسی کے پتلے تھے۔

شرافت اور بےنفسی کا یہ عظیم پیکر طویل عرصہ تک خلق خدا کو فائدہ پہونچا کر ۱۳/رمضان ۱۴۳۰ھ مطابق ۳/ستمبر ۲۰۰۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ رحمة الله عليه رحمة واسعة۔

مولانا محمد شمیم اخترؒ

سادہ مزاج، سادہ دل اور سادگی پسند، انہی صفات کے حامل تھے جناب مولانا شمیم اختر صاحبؒ جو ۳/مارچ ۲۰۱۲ء کو ہمیں داغ مفارقت دے گئے، آپ کے والد کا نام عبدالحمید ہے، ۲۰/جون ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے، بچپن میں ہی والدین کی سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے، ساتھ ہی گھر کے حالات بھی اچھے نہیں تھے، مگر اس کے باوجود آپ نے حصول تعلیم کو ترجیح دی اور مشقتیں برداشت کر کے تعلیم کی تکمیل کی، استھاواں آپ کا مادر علمی ہے، یہیں سے ۱۹۶۷ء میں فاضل حدیث اور ۷۰ء میں فاضل فارسی کی سندیں حاصل کیں۔

فروری ۱۹۶۶ء میں سسوار ہائی اسکول میں عارضی ملازمت شروع کی، کچھ عرصہ کے بعد استھاواں کے مدرسہ کے لئے آپ کو طلب کیا گیا اور آپ وہاں چلے گئے، فروری ۷۳ء میں باضابطہ سرکاری طور پر سسوار ہائی اسکول میں اردو اور فارسی کے استاذ مقرر ہوئے، یہاں آپ نے ایک طویل عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی اور جون ۲۰۰۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

گاؤں کی تعلیمی وسماجی سرگرمیوں میں بھی آپ کی شرکت رہی ہے، عیدگاہ کمیٹی اور جامع مسجد کے سکریٹری رہے، مدرسہ کے بعض جلسوں میں کنوینر بھی مقرر ہوئے، آپ نے ان تمام ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیا۔ شرافت، سادگی، عزم وحوصلہ آپ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

عصری تعلیم سے متعلق چند اہم شخصیات

ڈاکٹر محمد فاروقؒ

بیرسٹر محمد شفیع صاحب کے بھانجہ اور داماد ڈاکٹر محمد فاروق صاحب آبائی طور پر ہرپور کے رہنے والے تھے، نانیہال میں پرورش و پرداخت ہوئی، اور پھر یہیں کے ہوکر رہے، بیرسٹر صاحبؒ نے اپنے ساتھ رکھ کر تعلیم دلائی، دربھنگہ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد دربھنگہ میڈیکل کالج سے پہلے LMP کی ڈگری حاصل کی، اس دور کے مشہور ڈاکٹروں میں آپ کا شمار تھا، اللہ تعالی نے دست شفا عطا فرمایا تھا، تعلیم کے بعد سرکاری اسپتال میں ملازمت اختیار کی، آپ نے دوران ملازمت مختلف اسپتالوں میں خدمت انجام دی، تموریا ہاسپٹل کے ملیریا سنٹر میں ہے، سسوار، پھلپراس، گھوکھڈیا اسپتالوں میں رہے، اور پھر وہیں ۱۹۷۳ء میں انتقال ہوا۔

جناب نیاز احمد بتاتے ہیں کہ ڈاکٹری میں مقبولیت کے ساتھ سماجی وسیاسی سوجھ بوجھ کے بھی مالک تھے، آپ گاؤں میں ہائی اسکول کے قیام کے لئے کوشاں رہے، مگر شاید لوگوں کے عدم دلچسپی کی وجہ سے یہاں ہائی اسکول کا قیام نہیں ہوسکا، البتہ آپ کی محنت ولگن بے ثمر نہیں رہی، گاؤں سے چند کیلومیٹر دور سسوار میں راج کچہری کمپونڈ میں ہائی اسکول قائم ہوا، آپ اس کے تاحیات سکریٹری رہے، جناب انیس احمد صاحب بھی عرصہ تک اس کے سکریٹری رہے۔

آپ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے، آپ کی خواہش تھی کہ قصبہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو، اس کے لئے آپ نے پوری جدوجہد کی، گاؤں کے اہل علم ودانش کے ساتھ اس موضوع پر نشستیں ہوئیں، ایک میٹنگ میں جناب عبدالحی پیامی صاحب کو بھی شریک کروایا، اسکول کے لئے اپنی ایک زمین دی اور پھوس کا ایک مکان بھی بنوادیا، مگر آپ کی یہ کوششیں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکیں، کہا جاتا ہے کہ اس کی ناکامیابی کی وجہ تعلیم نسواں کے

تئیں گاؤں کی بعض شخصیات کے خاص نظریات تھے، بہرحال اسباب کچھ بھی ہوں، تعلیم نسواں کے لئے اٹھنے والی اس صدا کی پذیرائی ہونی چاہیے تھی، اگر اس وقت یہ کوشش کامیاب ہوجاتی تو آج علاقہ میں تعلیم کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، مگر آہ ہماری کم نصیبی! جس نے یہ دن دکھائے، نہ جانے کتنی اور کوششیں ہماری ناعاقبت اندیشانہ ذہنیت کی قربان گاہ پر قربان ہوتی رہیں گی۔

آپ نے اپنی بچیوں کی تعلیم کے لئے جناب ضیاء اللہ صاحب کو مقرر کیا، اور پھر لڑکیوں میں تعلیمی وثقافتی ذوق پیدا کرنے کے لئے 'بزم حسنات' کے نام سے عورتوں کی تنظیم بنائی، صدیقہ خاتون اس کی سکریٹری تھیں، یہ بزم آپ کے مالی تعاون اور آپ کی سرپرستی میں فروغ پاتی رہی، اور اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے، کاش ڈاکٹر صاحب کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو تعلیم نسواں کا کوئی مستقل ادارہ ضرور قائم ہوجاتا۔

ادریس زبیریؒ

آپ کا شمار تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ہوتا تھا، اس زمانہ کے میٹرک پاس تھے، مڈل اسکول کے منیجر رہے، اس کے بعد دھنباد کے ملیریا آفیس میں بھی رہے، بسلسلہ ملازمت اڑیسہ میں بھی رہے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے، ۶۷،۷۷ء میں آپ کی وفات ہوئی، سماجی کاموں میں مشہور تھے، مدرسہ رحمانیہ کی مجلس منتظمہ کے ممبر اور جامع مسجد کے سکریٹری بھی رہے۔

ڈاکٹر رحمت اللہؒ

آپ نے مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد دربھنگہ میڈیکل اسکول سے LMP کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد بانکی پور جیل میں ملازمت شروع کی، جیل کے ڈاکٹر کی حیثیت سے مختلف جیلوں میں خدمت انجام دی، بانکی پور سے ٹرانسفر ہوکر دربھنگہ جیل پہونچے، اور یہیں سے ریٹائر ہوئے، ۱۹۹۳ء میں آپ کا انتقال ہوا، آپ بہترین ڈاکٹر تھے، ہاتھ میں شفا تھی، غریب پروری میں معروف تھے۔

محمد عقیل عاقلؔ

رحمٰن بخش کے تیسرے صاحبزادے اور ممتاز و معروف ملی وقومی رہنما جناب محمد شفیع بیرسٹر کے برادرِ خورد، ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ محمد عقیل صاحب نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد راج ہائی اسکول دربھنگہ سے ہائی اسکول اور ۱۹۱۳ء میں بہار یونیورسیٹی مظفرپور سے انٹرمیڈیٹ کیا، اس کے بعد بی اے میں داخلہ لیا مگر والد کی علالت کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا، مظفرپور میں آپ بیرسٹر اختر صاحب کے مکان میں رہتے تھے، یہیں آچاریہ جے بی کرپلانی کی شاگردی بھی میسر آئی۔

۱۹۳۴ء میں شفیع صاحب کی کوششوں سے قصبہ میں مڈل اسکول قائم ہوا تو آپ اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے، اور سبکدوش ہونے تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، ۱۹۵۹ء میں آپ اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔

مڈل اسکول اس وقت پورے علاقہ کے لئے گویا منارہ علم تھا، علاقہ کے پرانے اکثر عصری تعلیم یافتہ حضرات اسی اسکول کے پروردہ ہیں، مولانا ممتاز علی مظاہری، انصار الحق کمپونڈر اور ضیاء اللہ مملی اس کے ابتدائی دور کے طلبہ میں سے ہیں، یہاں تعلیم پر بڑی توجہ تھی، اساتذہ بڑی محنت اور لگن سے پڑھایا کرتے تھے، تعلیم کا پورا ماحول تھا، اور یہ سب دراصل اس کے روحِ رواں اور ذمہ دار اعلیٰ جناب عقیل صاحب کی محنت اور جذبہ صادق کی وجہ سے تھا، وہ خود بہترین منتظم تھے، وقت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ کبھی اسکول ایک منٹ تاخیر سے نہیں پہونچے، مشہور تھا کہ اسکول کا وقت ہوتے ہی آگے آگے اسکول کا چپراسی اسکول کھولنے جاتا اور پیچھے پیچھے آپ خود پہونچتے تھے، اس کے بعد کسی کو کیا مجال کہ تاخیر سے آئے!

آپ کے دل میں فروغِ تعلیم کا جذبۂ صادق فرواں تھا، اکثر غریب طلبہ کی فیس اپنی جیب سے ادا کرتے تھے، خاندان کے افراد کا خیال ہے کہ آپ کو اس زمانہ میں پینتالیس روپئے تنخواہ ملتی تھی، جو ایک بیش قیمت رقم تھی، مگر کبھی وہ رقم گھر نہیں لاتے، آپنے آفس میں وہ رقم رکھی رہتی اور وہیں سے غریب طلبہ کی فیس دیا کرتے تھے، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب

جنہیں آپ کی شاگردی بھی نصیب ہوئی، آپ کے اس وصف کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

> جناب ماسٹر شاہ محمد عقیل صاحب میرے استاذ تھے، اس وقت اسکول میں فیس ایک آنہ، دو آنہ ماہانہ تھا، یہ جنس بھی ادا کرنا لوگوں کے لئے مشکل تھا، ہمارے استاد محترم اللہ غریق رحمت کرے اپنی تنخواہ سے طلبہ کی فیس ادا کیا کرتے تھے۔

تاریخ آپ کا خاص مضمون تھا، انگریزی پر بڑی قدرت حاصل تھی، کہا جاتا ہے کہ لوکہا تک سے لوگ انگریزی میں درخواست لکھوانے اور پڑھوانے آپ کے پاس آتے تھے، جناب انیس احمد صاحب بتاتے ہیں کہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے، شفیع صاحب جب منسٹر بن کر پہلی بار گاؤں آئے تو عقیل صاحب نے انگریزی میں ایک نظم کہی جس کا ایک شعر اس طرح تھا:

Thy fly it so high
under camopy of sky
looks beautiful in eye.

مطالعہ کے شوقین تھے، ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وقت کا اکثر حصہ مطالعہ میں گزارتے تھے، اردو، انگریزی دونوں زبانوں کی کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔

آپ کی سب سے نمایاں خصوصیت آپ کی بےنفسی، شرافت اور علم کا شوق ہے، کبھی کسی کو کوئی شکایت آپ سے نہیں رہی، مزاج میں حلاوت اور انکساری کا یہ حال تھا کہ کسی طرح بھی بڑے پن کا اظہار نہیں ہوتا۔

مولانا بشارت کریمؒ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا، اپنے قصبہ کے بزرگ نقو شاہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، اس نسبت کی وجہ سے آپ کو شاہ صاحب بھی کہا جانے لگا، ابتداء میں وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات مسجد میں قیام رہتا تھا۔

شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، اس زمانہ میں بڑی کثرت سے طرحی مشاعرہ منعقد

ہوتے تھے،آپ ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور یہاں کی نمائندگی کرتے تھے،آپ کے صاحبزادے جناب نیاز احمد صاحب ململ کے مشاعروں کی منظرکشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

......مشاعروں کا دور چلتا رہا، بالخصوص آم کے موسم میں اس کا اہتمام قابل ذکر ہے، ملیح آباد سے سروش، الہ آباد سے بسمل، پرتاب گڑھ سے نازش جیسے شعراء ان مشاعروں میں شامل ہوتے، جو کئی دنوں تک پرتکلف دعوتوں کے ساتھ چلتا رہتا تھا، والد محترم عقیل عاقل شعروادب کی اس پر کیف فضاء میں یکہتہ کے ادبی ذوق وشوق کی نمائندگی کرتے۔

(سہ ماہی تمثیل نو، دربھنگہ، ص: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء)

نمونہ کلام اس طرح ہے:

بہت مشکل ہے عاقل اضطراب دل کا اندازہ
دل ہجراں کی کلفت کو اسیر دل سمجھتے ہیں

(رفتگاں وقائماں ص:۱۹۳)

شعروادب کی دنیا میں آپ کے معاصرین میں صدیق نیرنگ، ماسٹر آفاق پریشاں، بابو رفیق ململ، عبدالعزیز مضمحل، اور مولانا ظفر شبیر یکہتہ شامل ہیں۔

زندگی بھر شمع علم کو روشن رکھنے اور لوگوں میں خوشیاں بانٹنے والے فرد فرید پر ۱۹۷۱ء میں عید کی رات فالج کا حملہ ہوا، اور دوسرے دن ان کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا، اور اس طرح قصبہ اپنے ایک بےلوث رہبر، تعلیم کے پاسبان اور شرافت و بےنفسی کے پیکر سے محروم ہوگیا۔

ڈاکٹر منظور احمد شمسی

جناب عقیل احمد کے فرزند اور محمد شفیع صاحب کے بھتیجے جناب منظور احمد نے آئی ایس سی تک دربھنگہ میں اپنے چچا بیرسٹر صاحب کے یہاں رہ کر تعلیم حاصل کی، مسلم ہائی اسکول سے فرسٹ ڈویزن سے میٹرک اور سی ایم کالج دربھنگہ سے آئی ایس سی کیا، پھر پٹنہ سائنس کالج سے بی ایس سی کرنے کے بعد چچا محترم کی خواہش پر دربھنگہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس

کیا، اس کے بعد میڈیکل کی اونچی ڈگری ڈی ٹی ایم اینڈ ایچ (DTM&H) بھی حاصل کی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی، پہلے لدنیا ہاسپٹل میں رہے، پھر سعودی عرب کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹری کے لئے منتخب ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں سعودی عرب چلے گئے، وہاں تقریباً پچیس سالوں تک رہے، ۱۹۹۶ء میں واپس آئے، جولائی ۱۹۹۸ء میں پٹنہ میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہیں اللہ کو پیارے ہوگئے، پٹنہ سے آپ کا جسد خاکی گاؤں لایا گیا اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

گو پیشہ سے ڈاکٹر تھے، لیکن اردو اور انگریزی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے، کیرم بورڈ کے چمپئن کھلاڑی تھے، انٹر کالج اور انٹر یونیورسیٹی کے مقابلوں میں بھی چمپئن رہے، آپ کا مطالعہ گہرا، اور وسیع تھا، اکثر موضوعات پر معلومات رکھتے تھے، اور ہر طرح کے موضوع پر بولتے تھے، انگریزی اور اردو کے اچھے استاد تھے۔

شاعری کا ذوق بھی تھا، جب مترنم آواز میں پڑھتے تو سماں بندھ جایا کرتا تھا، شبیر ظفر صاحب کے یہاں ایک طرحی مشاعرہ تھا، جس میں ڈاکٹر شمسی صاحب نے غزل پڑھی تھی، جس کے دو اشعار جناب انیس احمد صاحب کی یادداشت میں محفوظ رہ گئے، جو اس طرح ہیں:

جناب ظفر میرے پاس آ کے بیٹھیں
نظریں انہیں برملا ڈھونڈتی ہیں
جناب ظفر کی ظفر ہے نرالی
لئے ہیں وہ دیوان، بڑی سوجھتی ہیں

علمی وادبی شخصیات

عبدالعزیز مضمحل

آپ کے والد کا نام حافظ محمد حنیف ہے، مڈل اسکول پاس تھے، آپ کے قلمی بیاض میں ۲۰؍جولائی ۱۹۴۶ء سے مڈل اسکول یکہتہ میں پڑھانے کا تذکرہ ملتا ہے، البتہ یہ مشغلہ کب تک جاری رہا، اس کی وضاحت نہیں ہے، اندازہ ہے کہ چند سالوں تک آپ نے یہ خدمت انجام دی ہے، پیشہ کے لحاظ سے کاشتکار تھے، لیکن اکثر اوقات شعروشاعری میں مشغول رہتے، شاعری کا بڑا ذوق پایا تھا، مضمحل اور کامل تخلص کرتے تھے، آپ نے بڑی کثرت سے اشعار کہے ہیں، مناجات ،حمد، نعت، سلام جیسے اصناف کے علاوہ دینی موضوعات پر بھی آپ کے اشعار ہیں، کلام کے متعدد مجموعے اس زمانہ میں شائع ہوئے، ان میں مہمان رحمٰن، ماہ رمضان، پھولوں کا گلدستہ، آپ آئے بہار آئی، تحفۂ سلام وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ بہت سارا قلمی نسخہ تھا، ان میں اکثر دیمک کی نظر ہو چکا ہے، کچھ حصہ آپ کے صاحبزادے عبدالمجید کے پاس محفوظ ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی صاحب نے دربھنگہ کی منظوم تاریخ 'رفتگان وقائماں' میں آپ کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اک مضمحل یکہتوی
کرتے تھے شاعری بھی
کچھ مسودے ہیں ان کے
جو چھپ نہیں سکے ہیں
اشعار کے تھے ناظم

(رفتگان وقائماں ص:۸۱)

حمد کے چند اشعار اس طرح ہیں:

رنج وراحت اور نعمت دیتا ہے پروردگار   کیا کوئی ہے جو کرے انعام کا اس کے شمار
زندگی یوں بیت جائے مٹ جائے دہر بھی   پھر بھی ناممکن زباں اکرام کا کر بے شمار
اس نے پیدا کیا عالم ہزار   زندگی بخشی ہے اس نے بار بار
ہے کرامات دوعالم جاندار   اے میرے مالک میرے پروردگار

سحری سے متعلق ایک نظم جو روزنامہ پندار میں ۲۰ اگست ۲۰۱۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے، اس طرح ہے:

وقت سحری کا ہے جاگئے جاگئے   رب سے دل سے دعا مانگئے مانگئے
کتنا پرنور ہے کتنا ہے جلوہ گر   ماہ رمضان کا صبح وشام وسحر
خیر وخوبی کے دن آگئے ہیں مگر   رب کی رحمت برستی ہے شام وسحر
جن کا جلوہ ہے خود ہی وہ ہے جلوہ گر   اللہ اللہ عجب شان ہے جاگئے
رب سے دل سے دعا مانگئے مانگئے   طالب خیر سحری بھی اب کھائیے
جانب سوئے مسجد کو بھی اب جائیے   رب کی حمد وثنا کرنے کو اب آئیے
سورہ طٰہٰ ویٰسین کو گائیے   ہے یہ وقت سحر جاگئے جاگئے

'رفتار زمانہ' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں اس وقت کے واقعات کی طرف اشارہ ہے:

فضائے دہر جو اس وقت سازگار نہیں   خدا ہی جانے کہ عالم میں کیوں بہار نہیں
خزاں کے دن میں چلی ہے جو بادصرصر کے   ہوا تند ہے موسم بھی خوشگوار نہیں
وجود عیش وطرب بن رہا ہے شعلہ نما   زمیں پہ خانہ جنگی کا کبھی اعتبار نہیں
ہوائے وقت نے منھ موڑی ہے دنیا سے   بچے کا کون کسی کا بھی اعتبار نہیں
بنا ہوا جو گزرتا ہے دہر کا منظر   پرانے وقت کا اب کوئی یادگار نہیں
سمند تیز پہ چڑھ کے دیکھئے رہرو   قرار جس کو تھا دنیا میں اب قرار نہیں

آپ کی پیدائش تقریباً ۱۹۰۷ء میں اور وفات ۱۹؍نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوئی، مولانا شبیر احمد ظفرؒ نے اس موقعہ پر حسب ذیل مرثیہ کہا:

چل بسا شاعر یکہتہ وہ عزیز روزگار
جاملا اپنے رب سے اے عزیز روزگار
تو جدا ہم سے ہوا کیا شعر کی دنیا گئی
کون اب لکھے گا نظمیں اے عزیز روزگار
یاد آئے گا ہمیشہ نسل مستقبل کو تو
سب ہی کامل سمجھیں گے جب اے عزیز روزگا
نیک صورت نیک سیرت عارف عابد بالیقیں
حذر کا پتلا تھا تو بے شک عزیز روزگار
بامروت باتحمل باوقار وباانکسار
ظاہر وباطن تھا یکساں اے عزیز روزگار
سال چوراسی نومبر انیس صد کا حادثہ
چل بسا ستائیس کی شب اے عزیز روزگار
لکھ لیا تو نے ظفرؔ جس وقت تاریخ وفات
یاد آیا تجھ کو بے حد وہ عزیز روزگار

مولانا نورالہدیٰ شمسیؒ

تقریباً دس سال قبل راقم نے نشان منزل میں آپ کا تعارف اس طرح کرایا تھا:

اس سرزمین کی ایک علمی شمع جو حال ہی میں خاموش ہوئی ہے، مولانا نورالہدیٰ کی ذات گرامی ہے، آپ نے ۱۹۴۲ء میں اسی بستی میں آنکھیں کھولیں، ابتدائی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لیا، اور وہیں سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد مسلم ہائی اسکول پٹنہ

میں ملازمت ملی، زندگی کے اخیر لمحہ تک وہیں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، ریٹائرمنٹ سے کم وبیش چھ ماہ قبل فروری ۲۰۰۲ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (نشان منزل، شمارہ:۲،ص:۴۶)

آپ کا علمی وادبی شعور پختہ تھا، بیدار مغز تھے، مسلم ہائی اسکول کے اسٹوڈنٹ یونین کے صدر رہے، پٹنہ کے ادبی وسیاسی لوگوں سے بھی اچھی راہ ورسم تھی مجلسی آدمی تھے، اور اپنی علمی وادبی ذوق اور مترنم آواز کی وجہ سے ہر مجلس میں بلبل ہزار داستاں بن جاتے۔

مشاعروں میں بھی پڑھتے تھے، اور اپنی آواز کی وجہ سے پسند کئے جاتے، جب قصبہ میں ہوتے تو یہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے، عموماً دوسروں کا کلام پڑھتے تھے، ممکن ہے کہ اپنا کلام بھی کہتے ہوں، آپ کے کلام کا کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔

پٹنہ کی ادبی صحبت نے آپ کے اندر تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا کیا، چنانچہ تدریس کے ساتھ آپ نے لوح وقلم کی بھی خدمت کی، چند کتابیں آپ کی علمی یادگار ہیں، جن میں ترجمہ آثار السنن، مفتاح الصلوۃ، عقائد وعبادات، ترجمہ عم پارہ، اردو قواعد، اور مضمون نویسی قابل ذکر ہیں، یہ ساری کتابیں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب سے متعلق ہیں۔

آپ کے انتقال پر آپ کے عزیز جناب انیس الرحمٰن صاحب نے ایک مرثیہ کہا، اس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

وہ شعلہ بیان تھے، وہ روح رواں تھے
ہر اک دل میں بستے تھے محبوب ہوکر
مصنف کہوں یا مقرر کہوں میں
چمکتے تھے محفل میں وہ نور ہوکر
وہ نورالہدیٰ تھے تخلص تھا شمسی
وہ لیٹے ہیں پٹنہ میں مدفون ہوکر
لکھا اس نے آثار السنن کو

کیا نام روشن مشہور ہوکر
خدایا کرم کردے اور بخش دے تو
گیا ہے یہاں سے بہت چور ہو کر

سلطان احمد ناشاؔد

جناب محمد منیرالدینؒ کے چشم وچراغ سلطان احمد نے مگدھ یونیورسیٹی سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی،اس کے بعد بینک میں ملازمت شروع کی،رولرڈ ولپمنٹ آرگنائزیشن میں کیشئر کے عہدہ پر رہے،اوراس فریضہ کو پوری دیانت وامانت کے ساتھ انجام دیتے رہے، آپ کی شرافت اورامانت داری مشہورتھی،اس امانت کی بڑی قیمت آپ کو چکانی پڑی،کہا جاتا ہے کہ آپ کی وجہ سے شعبہ کے افسران کی بالائی آمدنی بندتھی،چنانچہ ظالموں نے آپ کی جان عزیز سے کھیلنے کو بھی گوارہ کرلیا،اوراس طرح ۳۱ردسمبر ۱۹۹۸ء کی ایک صبح دربھنگہ میں آپ نے شہادت پائی۔

آپ کو شعروادب کا بہت اچھا ذوق تھا،زیادتر بشیر بدراورڈاکٹر کلیم عاجز کے اشعار پڑھتے تھے،خودبھی اشعار کہتے تھے،مگرکوئی سرمایہ محفوظ نہیں ہے،پروفیسر سلطان احمد آپ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔

سماجی وسیاسی شخصیات

غلام علی ادھیکاری

ماضی کے حوالہ سے سب سے قدیم جس شخصیت کا نام اورتذکرہ ملتا ہے وہ آپ ہی کی ذات گرامی ہے،اوپر چھٹی یا ساتویں پشت پرآپ کا نام ملتا ہے،اس سے پہلے کسی معروف شخص کا نام اب تک نہیں مل سکا ہے،قصبہ کے زیادہ ترافرادکا خاندانی سلسلہ آپ سے ہی جڑتا ہے،بعد کے افراد آپ کی طرف نسبت کرتے ہوئے ادھیکاری کہلاتے ہیں،آپ کوادھیکاری کیوں کہا جاتا ہے؟اس کے بارے میں بعض لوگ بتاتے ہیں کہ آپ کوحکومت کی طرف سے کوئی عہدہ ملا تھا،یامہاراج دربھنگہ کی طرف سے کسی چیز کا اختیار ملا تھا،ممکن ہے راج دربھنگہ میں اس طرح کا کوئی اعزازی عہدہ ہوا کرتا ہوگا۔

آپ کے دوصاحبزادے تھے،روشن علی اوربخش علی،انہی سےنسل درنسل یہاں کی آبادی بڑھتی رہی،غلام علی ادھیکاری کہاں سے آئے تھے؟اس بارے میں بھی ہماری معلومات صفر ہے،بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قاضی ٹولہ ہرپور سے آئے تھے۔

گاؤں میں دوبڑےتالاب اھیکاری پوکھر (تالاب) کہلاتے ہیں،جوان کی یاان کے فرزندان نے کھودوائی ہوگی۔

روشن علی،بخش علی

غلام علی ادھیکاری کے بعد یہی دونام ہمیں ملتے ہیں،عین ممکن ہے یہ دونوں فرزندان اپنے دور کے معروف سماجی لوگوں میں رہے ہوں گے،جس کی وجہ سےان کے نام محفوظ رہے، ان دونوں سے دوبڑی شاخیں وجود میں آئیں۔

خدا بخش

سہرسہ سوپول سے ہجرت کر کے آنے والے قافلہ میں شامل محمد علی کے صاحبزادے خدا بخش مرحوم علاقہ میں بڑے نیک نام رہے، اس خانوادہ کی شہرت کی شروعات آپ سے ہوتی ہے، آپ نے اپنی خداداد لیاقت، سمجھ بوجھ اور محنت وکاوش کے ذریعہ علاقہ میں بہت سی زمینیں حاصل کیں، مختلف گاؤں میں زمینوں کی دیکھ ریکھ کے لئے ان کے میر منشی رہا کرتے تھے، آپ بابو چندر دھاری سنگھ زمیندار کے تحصیل دار تھے جو موجودہ جھانجھ پٹی کے زمیندار بھی تھے۔

مولیٰ بخش

محمد علی کے چھوٹے صاحبزادے مولیٰ بخش اپنے دور کے معروف لوگوں میں تھے، رحمٰن بخش کے بعد علاقہ کی قیادت وسیادت آپ کے ہاتھ میں رہی، علاقہ کی سب سے اقبال مند شخصیت حاجی عبدالحق صاحب آپ کے پوتے ہیں۔

رحمٰن بخش

خدا بخش کے فرزند رحمٰن بخش زمینداروں میں سے تھے، ان کے نام کے زندہ رہنے کے لئے یہی کافی ہے کہ محمد شفیع بیرسٹر آپ کے فرزند ہیں، آپ کی دوراندیشی نے علاقہ کو محمد شفیع صاحب جیسا سپوت دیا، جو نہ صرف علاقہ بلکہ صوبہ اور ملک کے لئے قابل فخر بنے، آپ نے اپنے بچوں کو عصری تعلیم دلانے کی باضابطہ کوشش کی، اور دربھنگہ میں رکھ کر بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا، جو اس وقت تعلیم اور تحریک آزادی کا مرکز تھا، ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں آپ کا دربھنگہ میں انتقال ہوا، اور وہیں قلعہ گھاٹ شاہی مسجد کے گرد قبرستان میں مدفون ہوئے۔

شمشیر علی ادھیکاری

یوسف علی کے فرزند شمشیر علی ادھیکاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زمیندار تھے، ۳۴۸ بیگھہ زمین ان کے پاس تھی، بڑے رعب ودبدبہ کے آدمی تھے، زینب مسماۃ آپ کی

صاحبزادی ہیں جو حسن بانو کے بعد خواتین میں سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔

کاظم حسین

کریم بخش کے صاحبزادے اور محمد علی کے پوتے کاظم حسین اپنے دور کے مشہور سماجی لوگوں میں سے تھے، پروفیسر سلطان احمد صاحب بتاتے ہیں کہ عبدالحق صاحب سے پہلے سماجی کاموں کے لئے یہی سب سے مشہور تھے۔

ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے یہی کافی ہے کہ مسماۃ حسن بانو آپ ہی کی اہلیہ تھیں جنہوں نے بڑی شہرت حاصل کی، اور جن کی دینی اور سماجی خدمات آج بھی بطور مثال بیان کی جاتی ہیں۔

فقیر محمد

مولیٰ بخش کے صاحبزادے اور حاجی عبدالحق صاحب کے والد محترم جناب فقیر محمد گاؤں کے سرداروں میں تھے، گاؤں کے علاوہ علاقہ میں بھی متعارف تھے، آپ کی شخصیت بھی معروف رہی ہے۔

شیخ معین الدینؒ مہراجپور

ان کے والد کا نام شیخ موسن ہے، آپ اپنی شرافت کے لئے مشہور تھے، ۶۰ء، ۶۱ء کے دوران انتقال ہوا، مدرسہ معینیہ مہراجپور انہی کی طرف منسوب ہے، اپنے دور میں اچھی شہرت رکھتے تھے۔

عبداللہ طوفانپور

حافظ اختر حسن صاحب بتاتے ہیں کہ حافظ عبداللہ بن مینگل اپنے دور کے مشہور لوگوں میں سے تھے، برٹش حکومت کی طرف سے آپ کو جیٹھ رعیت کا خطاب ملا تھا، یہ عہدہ پنچایت کی سطح کا ہوتا تھا، آپ صاحب ثروت تھے، سیاسی وسماجی کاموں میں سرگرم رہے، طوفانپور کے معروف لوگوں میں سے تھے۔

الٰہی بخش طوفانپور

آپ کے والد کا نام شیخ محمد جعفر اور دادا کا نام حاجی اکبر ہے، جو ۱۸۷۵ء سے پہلے کے تھے، الٰہی بخش اپنے دور کے بڑے صاحب ثروت اور زمیندار تھے، حاجی قمر الزماں صاحب کے بقول ڈیڑھ سو بیگھہ زمین تھی، چینی، نمک کا کوٹہ تھا، انہی کے والد شیخ جعفر نے تالاب کھودوایا جو وسط گاؤں میں واقع ہے، مسجد اور مکتب کی دیکھ ریکھ بھی آپ ہی کرتے تھے، ۱۸۹۵ء کے قوالہ میں آپ کا نام ملتا ہے۔

محی الدین بابو

رحمٰن بخش کے دوسرے صاحبزادے اور جناب محمد شفیع صاحب کے بھائی محی الدین بابو علاقہ کے معروف ملی وسماجی لوگوں میں تھے، بڑے سوجھ بوجھ والے تھے، صاحب ثروت تھے، جملہ رفاہی کاموں میں آگے رہتے تھے، مدرسہ کے ابتدائی معاونین میں آپ بھی شامل ہیں۔

آپ کے صاحبزادے ماسٹر ارشد صاحب بتاتے ہیں کہ آپ کی سخاوت، غربا پروری مشہور تھی، آپ پہلے تحصیل دار، پھر جیٹھ رعیت بھی رہے، آپ کے دروازہ پر کھٹونہ، لوکہا، لوکہی، بابو برہی، وغیرہ علاقہ کی مال گزاری جمع ہوتی تھی، پھر یہاں سے مہاراج دربھنگہ کے پاس جاتی تھی، آپ تاحیات سسوار ہاسپٹل کے سکریڑی رہے، ۵۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

عبدالرحیم منیجر طوفانپور

اپنے زمانہ کے معروف لوگوں میں تھے، راستہ بنوانا، کنواں کھودوانا، درخت لگوانا آپ کا خاص مشن تھا، حافظ اختر حسن صاحب کے بقول آپ سوسال پہلے کے لوگوں میں سے ہیں۔

حاجی عبدالحقؒ

فقیر محمد کے صاحبزادے اور گھورن مہوا سے آئے اس خانوادہ کے وہ عظیم چشم وچراغ جو بلند اقبال لے کر آئے تھے، قدرت کی طرف سے جنہیں بڑی شہرت وناموری ملی، اور جن کی

انصاف پسندی کے چرچے آج بھی سننے کو ملتے ہیں، انہی کو دنیا حاجی عبدالحق بابوؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

آپ خوب رو، خوش پوشاک، خوش اخلاق اور بہت ہی بارعب شخصیت کے حامل تھے، دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ کے قد وقامت سے ہی ایک سردار کا تصور ہوتا تھا، بلند قامتی کے ساتھ بدن پر نفیس لباس، چہرے پر گھنی داڑھی اور ساتھ میں مصلی آپ کے پیکر کو حسین سے حسین تر بنا دیتا تھا، کشادہ جبیں اور روشن چہرہ شرافت، ایمانداری، اصول پسندی کا غماز تھا وہیں ظاہری وضع قطع سے حلم وبردباری، تواضع اور انسانیت دوستی کا اظہار ہوتا تھا۔

بچپن سے پڑھنے لکھنے میں کمزور تھے، چنانچہ ان کے چچا کاظم حسین ان کو لے کر حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خدمت میں دعا کرانے پہونچے، اچانک رات میں ایک بچھو نے آپ کو ڈس لیا، آپ درد سے رونے لگے، یہ دیکھ کر آپ کے چچا آپ کو لے کر حضرت مولانا مونگیریؒ کے پاس پہونچے، دروازہ کھٹکھٹایا، اور بچھو کے ڈسنے کا واقعہ سنایا، حضرتؒ نے اپنا لعاب دہن نکالا اور درد کی جگہ پر لگا دیا، حاجی عبدالحق صاحب خود کہتے ہیں کہ

> ''لعاب دہن سے نہ صرف درد ختم ہو گیا بلکہ میرے دماغ کا ہر گوشہ روشن ہو گیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ میں حاضر جواب ہو گیا ہوں، اور بڑے بڑے سنگین ودشوار مسائل کو اللہ کے فضل وکرم سے حل کر لیتا ہوں''

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے یہ واقعہ خود ان کی زبانی سنا تھا، اس واقعہ کے ساتھ یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ ان کو دیکھ کر مولانا مونگیری نے فرمایا تھا کہ ''یہ لڑکا بہت زیادہ تو نہیں پڑھے گا، مگر اس کا اقبال بہت بلند ہوگا''۔

اسے مولانا مونگیری کی کرامت کہنا چاہئے، کہ انہوں نے آپ کی پیشانی پر اقبال مندی کے نقوش کو دیکھ کر پیشین گوئی فرمادی کہ اس کی قسمت میں اقبال مندی لکھا ہے، مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی، اور چرخ کہن نے ان کی اقبال مندی دیکھی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد پہلے اپنے چچیرے بھائی ماسٹر محمد عقیل کے ساتھ مظفر پور میں اسکول

میں تعلیم کی شروعات کی، بعد میں مدھے پورا اسکول میں داخلہ لیا، میٹرک تک پہونچے تھے کہ والد کی اچانک وفات کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا، ادھر میٹرک کے امتحان میں بھی کامیابی کا رزلٹ نہیں آیا، جس کی وجہ سے آپ نے تعلیم چھوڑ دی اور آبائی پیشہ زمینداری کی طرف متوجہ ہوئے، تعلیم کی یہ ناکامی آپ کے لئے کامیابی کا زینہ ثابت ہوئی، یہیں سے آپ کی عقل وخرد کے بال وپر نکلنے شروع ہوئے، اور پھر اس مرتبہ کو پہونچے کہ علاقہ کو آپ سے ایک شناخت ملی۔

آپ کا رعب ودبدبہ مشہور ہے، انگریزی حکام تک آپ کا احترام کرتے تھے، علاقہ کے تقریباً پانچ تھانوں (لوکہی، لوکہا، کھٹونہ، لدنیہ اور پھلپراس) میں آپ کا گویا طوطی بولتا تھا، حکام جب علاقہ کے دورہ پر آتے تو آپ بھی ان کے ساتھ ہوتے۔

عدل وانصاف آپ کے امتیازی اوصاف ہیں، فیصلہ کرنے میں مشہور تھے، بڑے بڑے معاملات میں آپ فیصل بنائے جاتے تھے، معاملہ کیسا بھی ہو آپ اپنی فہم ودانائی سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیتے تھے، فیصلہ سے متعلق بہت سے واقعات مشہور ہیں، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب اپنی یادداشت میں لکھواتے ہیں:

حاجی عبدالحق صاحبؒ بڑے اقبال مند تھے، علاقہ کے امراء، بڑے بڑے لوگ، حتی کہ گورنمنٹ آفیسران، داروغہ، ایس ڈی او، کلکٹر، ایس پی وغیرہ سب کے سب ان کا احترام کرتے تھے، علاقہ کے مسلمان اور برادران وطن ہندو سب ان سے خوش تھے، عدل وانصاف کے معاملہ میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کردیتے تھے، اپنے دورحیات میں فریقین کو تھانہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹانے دیتے، اور سب لوگ ان کے فیصلے کو قبول ومنظور کرلیتے تھے۔

(یادداشت)

ایک موقعہ پر مولانا ممتاز علی صاحب بعض مسائل سے پریشان ہوکر مدرسہ کی ذمہ داری ترک کرنے کا ارادہ کرلیا، مگر جب مولانا نے حاجی عبدالحق صاحب کو اس کی اطلاع دی تو

انہوں نے آپ کو اس ارادہ سے باز رکھا، واقعہ کی تفصیل خود مولانا کی زبانی ملاحظہ کیجئے:

’’شروع دور تھا کہ کچھ لوگ میرے خلاف شکایت لے کر حاجی عبدالحق صاحب کے پاس پہونچے، وہی اس وقت مدرسہ کے ناظم تھے، میں گھبرا گیا، قریب تھا کہ میں استعفیٰ دے دوں، حاجی عبدالحق صاحب نے کہا آپ ان حضرات کی باتوں کو سنکر پریشان ہیں، آپ نے انگریزی پڑھا ہے، انگریزی مقولہ پر عمل کیجئے:

Let dogs bark and do your work

حاجی صاحب کے اس جملہ سے میری پریشانی میں کمی آئی اور ہم اپنے مثبت انداز میں کام کرتے رہے‘‘

آپ کے ذریعہ سے پورے علاقہ میں مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی، غیر مسلم زمیندار مسلمانوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے، مگر آپ کی وجہ سے کبھی ان کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

آپ ہمیشہ اپنے ساتھ اہل فہم وذکاء کو رکھتے، ان کی حیثیت مشیر کی ہوتی تھی، اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے، آپ کے معاصرین میں بہت نام ملتے ہیں، جس میں حاجی عبدالرؤف، حاجی منیر الدین، منشی سلیم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات کی فہم وفراست معروف تھی، اور گاؤں کے نظم ونسق اور مسائل حل کرنے میں ان حضرات کا بڑا اہم رول ہوا کرتا تھا، آپ گاؤں کے باشعور حضرات کے مشورہ سے اہم امور کو انجام دیتے تھے، اور یہی آپ کی مقبولیت کا راز تھا۔

آپ نے لمبی عمر پائی، نصف صدی سے زائد عرصہ تک علاقہ کے عوام کی خدمت کرتے ہوئے ۲۸/ مارچ ۱۹۶۴ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

آپ کا دور اس سرزمین کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہیں سے بڑے پیمانہ پر ترقی کا آغاز ہوتا ہے، معاشی حالت اب بھی بہت اچھی نہیں تھی، مگر پہلے کے مقابلہ میں اچھی

ضرورتھی،جس کانتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی طرف رجحان بڑھا،آئندہ صفحات میں جن اہم شخصیات کا تعارف کرایا جائے گا ان میں اکثر اسی دور کے ہیں،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں علم و ادب کا خوب چرچا تھا،لوگ خوشحال تھے،البتہ مزدوروں اور چھوٹے کسانوں میں غربت تھی۔

حق صاحب کے والد صاحب گاؤں کے سربراہ تھے،ان کے بعد یہ سربراہی آپ کی طرف منتقل ہوئی،آپ تاحیات علاقہ کے مسلمانوں کے سربراہی کرتے رہے،اور تمام لوگ آپ کو اپنا سربراہ اور رہنما مانتے تھے،آزادی کے بعد جب پنچایتی راج کا آغاز ہوا تو آپ مکھیا منتخب ہوئے۔

مدرسہ رحمانیہ سے خاص تعلق تھا،آپ مستقل مدرسہ کے سرپرستوں میں رہے،مارچ ۶۳ء میں جناب محبّ الحسن صاحب سکریٹری مدرسہ کے استعفیٰ کے بعد آپ سکریٹری منتخب ہوئے،مگر اس کے بعد زندگی نے وفا نہیں کی اور جلد ہی آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اسی دور میں دربھنگہ میں مسلم ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا،اس سلسلہ میں مسلم دانشوران اور اہل ثروت کی جو نشست ہوئی اس میں آپ بھی شامل تھے۔

گاؤں کے جامع مسجد کی تولیت آپ کے والد صاحب کے پاس تھی،ان کے انتقال کے بعد آپ متولی ہوئے،اور مسجد کے اخراجات میں ایک متعدبہ حصہ آپ ادا کرتے تھے،بطور خاص امام کا کھانا اور ان کی تنخواہ تاحیات دیتے رہے۔

گاؤں کے باذوق نوجوانوں نے جب گلشن ادب کے نام سے ایک لائبریری قائم کی تو آپ نہ صرف اس میں شریک تھے بلکہ ان لوگوں کی سرپرستی بھی کی،اور اپنے دروازہ کے سامنے مستقل زمین دے کر اس کی عمارت بھی بنوادی۔

علاقہ کے اہل ثروت اور زمینداروں سے گہرے روابط اور قریبی تعلقات تھے،اس لئے آپ کے ہمعصروں کی بڑی تعداد ہے جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں،بطور خاص مسلمانوں میں کھٹونہ کے بابو عبدالرحمٰن صاحب،مجید بابو و دیگر عراقی برادران،توڑیاہی کے حاجی یعقوب صاحب،نیرہیا کے عبدالحی پیامی،اندھرامنٹھ کے حاجی عین الحق صاحب اور

غیر مسلموں میں پرساہی کے ہری گویت،مجھورا کے گورکھ پرشاد،پپراہی کے جاگیشور گھوش، لوکہا کے ہردے نارائن بید،اور کھٹونہ کے ناگندر بابو وغیرے سے مراسم تھے،ان میں بعض سے دوستانہ تھا،اور بہت سے آپ کے مخلص رفقاء میں شمار ہوتے تھے،جن کے ساتھ مل کر آپ علاقہ کے مسائل حل کرتے تھے۔

دین کی طرف جھکاؤ شروع سے ہی تھا،۱۹۵۱ء میں اہلیہ اور گاؤں کے ہمصروں جن میں حاجی منیرالدین اور حاجی عبدالروف وغیرہ شامل تھے کے ساتھ حج کیا،صوم وصلاۃ کے پابند تھے،فجر کے بعد تلاوت اور نماز باجماعت کا ہمیشہ اہتمام رہا۔

نظام الدین طوفانپور

الٰہی بخش کے فرزند نظام الدینؒ اپنے دور میں بہت مشہور ہوئے،اس وقت کے پڑھے لکھے لوگوں میں آپ کا شمار تھا،حاجی قمرالزماں صاحب کے مطابق آپ نے قرآن کا کچھ حصہ حفظ بھی کیا تھا،منشی کہلاتے تھے،فارسی داں تھے،گاؤں میں امامت بھی کرتے تھے،مسجد کی دیکھ ریکھ کرتے،فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے،ان کی بہت سی تحریریں محفوظ تھیں،جواب ضائع ہو چکی ہیں،۱۹۵۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مخدوم بخشؒ مہراجپور

اپنے دور کے مشہور سماجی لوگوں میں تھے۔

محمد عقیل مہراجپور

محمد عقیل بن مخدوم بخش اپنے دور کے مشہور سماجی وسیاسی لوگوں میں سے تھے،پرساہی پنچایت کے سرپنچ بھی رہے۔

حاجی ولایت حسینؒ مہراجپور

اپنے دور کے پڑھے لکھے لوگوں میں ان کا شمار تھا،تعلیم کی وجہ سے ہر طبقہ میں ان کی بڑی

عزت تھی، کہا جاتا ہے کہ عبدالحق بھی ان کا احترام کرتے تھے، انہوں نے حکمت سیکھی تھی، اور عملی طور پر حکمت کرتے بھی تھے، آپ کی دینداری مشہور تھی، نماز کے بڑے پابند تھے، سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، ۶۰ء، ۶۵ء کے دوران ان کا انتقال ہوا۔

عبدالعزیز وعبدالجلیل بشنپور

یہ دونوں بھائی اپنے زمانہ کے مشہور لوگوں میں تھے، صاحب ثروت تھے، ان کے یہاں کپڑا، دودھ، چمڑا، کرانہ وغیرہ کئی چیزوں کی تجارت تھی، سرکاری کنٹرول بھی ان کے پاس تھا، سماجی لوگوں میں تھے، غریب پرور تھے، ۲۴ر مئی ۱۹۶۰ء میں ان کے یہاں ڈکیتی ہوئی اور یہ دونوں بھائی سمیت اور کئی لوگ شہید ہوئے، اس زمانہ میں یہ واقعہ پورے علاقہ میں زبان زد تھا، اس کے بعد ان کی حیثیت بھی ختم ہوگئی، کہ دولت تو باقی رہی، مگر خاندان کو سنبھالنے والے افراد ہی دنیا سے چلے گئے، یہ شاید اس زمانہ کا انوکھا اور پہلا واقعہ تھا جس میں ایک ساتھ کئی لوگوں نے مظلومانہ جام شہادت نوش کیا۔

زین العابدین راجپور

راجپور کے بڑے کاشتکاروں میں سے تھے، انتہائی نیک اور شریف آدمی تھے، اخلاق اور مروت میں بے مثال تھے، نماز کی پابندی کا یہ حال تھا کہ اگر کھیت میں وقت ہوگیا تو وہیں نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے، اپنے ملازمین کے ساتھ رحمدلی سے پیش آتے، اپنی سادگی، شرافت اور دینداری کے لئے معروف تھے، ۱۹۶۰ء کے آس پاس آپ کا انتقال ہوا۔

عبدالوحید کاری بابو طوفانپور

عبدالوحید ابن نظام الدین جو 'کاری بابو' سے مشہور تھے، زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، تعلیم زیادہ نہیں تھی، البتہ دینی حمیت، مسلمانوں سے ہمدردی، اور سیاسی شعور بہت تھا، علماء کی قدر کرتے تھے، ہمیشہ مدرسہ اور مسجد کے ذمہ داروں میں رہے، حکومت ہند کی طرف سے جب گرام پنچایتی نظام رائج ہوا تو دوبار جھانجھ پٹی پنچایت کے سرپنچ منتخب ہوئے، اور تاحیات

اس عہدہ پر فائز رہے، اسی طرح جب مدرسہ اسلامیہ کا الحاق ہوا تو آپ ہی مدرسہ کے صدر بنائے گئے، اور تاحیات مدرسہ کے صدر رہے، مدرسہ کے تعاون میں پیش پیش رہتے، مسجد اور مدرسہ کے انتظام وانصرام کی ہمیشہ فکر رکھتے تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ سے اصلاحی تعلق تھا، آپ کو کینسر کا موذی مرض لاحق ہوا، اور اسی مرض میں ۱۹۶۸ء میں آپ کا انتقال ہوا، حاجی قمرالزماں صاحب نے تاریخ وفات ۱۹۶۹ء بتائی ہے، آپ کے بقول انصاف اور رحمدلی آپ کی خاص صفت تھی۔

محبّ الحسن بھولا بابو

مسماۃ حسن بانو کے نواسہ اور حکیم صدیق صاحب راجپور کے صاحبزادہ جناب محبّ الحسن صاحب کا شمار قصبہ کے ان ذی ہوش اور ذی شعور لوگوں میں ہوتا ہے کہ جن کا نام یہاں کی ملی و تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا، آپ 'بھولا بابو' سے مشہور تھے۔

مسماۃ حسن بانو کو کوئی اولاد نرینہ نہیں تھیں، صرف لڑکیاں ہی تھیں، چنانچہ ان سے خاندانی نسبت کے ساتھ سماجی کاموں کی سرپرستی اور خیر کے کاموں میں تعاون کی وراثت بھی آپ کے حصہ میں آئی، قصبہ کے سماجی و رفاہی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے، دیگر کاموں کے ساتھ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ میں سرگرم شرکت بلکہ اس کی پوری نگرانی و سرپرستی کرنا ہے، مدرسہ سے تعلق اور اس کی معاونت تو خاندانی وراثت تھی، اس سلسلہ میں یہ خاندان ہمیشہ پیش پیش رہا اور دل کھول کر تعاون کرتا رہا۔

آپ شروع سے ہی مدرسہ کے رکن رہے، مدرسہ کے ریکارڈ میں ۵۲ء سے آپ کا نام مجلس منتظمہ کمیٹی میں شامل ہے، ۵۴ء میں جب مدرسہ کے سکریٹری جناب سمیع الدین صاحب نے معذرت کی تو ان کی معاونت کے لئے آپ کا نام طے ہوا، آپ اس ذمہ داری کے لئے تیار نہیں تھے، مگر اراکین کے شدید اصرار پر آپ نے اسے قبول کیا، کاروائی رجسٹر کے مطابق:

> چنانچہ قہر درویش برجان درویش کے تحت جناب محبّ الحسن صاحب نے نائب ناظم کے عہدہ کو قبول فرمایا۔ (کاروائی رجسٹر، ص:۵۴)

جنوری ۵۶ء میں جب سکریٹری جناب سمیع الدین صاحب نے معذرت کردی اوران کا استعفیٰ قبول کرلیا گیا تو سبھوں کی نظر آپ پر پڑی، اور یہ ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر ڈالی گئی ،آپ نے اس عہدہ کو قبول کیا اور پوری دیانت اوراخلاص و ہمدردی کے ساتھ ۶۳ء تک اس خدمت کوانجام دیتے رہے۔

سکریٹری کا عہدہ صرف ایک عہدہ نہیں تھا، مدرسہ ابتدائی ترقی کے مرحلہ سے گزر رہا تھا، ڈھیروں مسائل تھے، پھراقتصادی حالت بھی بہت اچھی نہیں تھی، اس وقت مدرسہ کے نظام کو بحسن وخوبی چلانااورآگے بڑھانا واقعی بہت اہم کام تھا، اس اہم ذمہ داری کو آپ نے بہت اچھے طریقہ سے انجام دیا، سخت حالات میں بھی آپ نے اپنی صائب رائے، دوراندیشی اور حسن تدبیر کے ذریعہ مدرسہ کو آگے بڑھاتے رہے، پروان چڑھاتے رہے، مدرسہ آگے بڑھتا رہااورترقی کے منازل طے کرتا رہا۔

مدرسہ کے لئے آپ کی حیثیت ایسے محسن وہمدرد کی تھی جن کے بغیر ترقی کا سفر ادھورا تھا، مدرسہ کے تئیں آپ کی ایثاروقربانی اورفکرمندی کا اندازہ کاروائی رجسٹر کی تحریروں سے ہوتا ہے، اپریل ۶۲ء میں آپ نے اس ذمہ داری سے استعفیٰ پیش کیا، اس سلسلہ میں میٹنگ ہوئی اور یہ طے پایا کہ ایک وفد کی شکل میں اراکین مدرسہ ان کے پاس جائیں اوراس ذمہ کو قبول کرنے کی منت وسماجت کریں، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

> کاروائی کے مطابق ناشتہ کے بعد متعدد حضرات حاضرِ مدرسہ ہوئے اور ناظم صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے، اولاً انہوں نے انکار کیا، لیکن بعد میں تمام حاضرین نے معذرت کی اور کہا کہ کم ازکم تین سال تک کے لئے اس ذمہ داری کو آپ ضرور قبول کریں، تاکہ مدرسہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے، ناظم مدرسہ نے اراکین وفد کے التماس کو شرف قبولیت سے نوازا ...... اور وفد کے اراکین خوشی خوشی اپنے گھر لوٹے۔ (کاروائی رجسٹر، ص:۵۲)

دوبارہ آپ نے پھراس ذمہ داری سے معذرت کی چنانچہ:

> اراکین مدرسہ نے بڑی ہی لجاجت کے ساتھ التماس کیا کہ مدرسہ کی نظامت سے آپ علیحدہ نہ ہوں، ورنہ مدرسہ کے کاموں میں ایسی گڑبڑی ہوگی جس کی تلافی مستقبل میں ناممکن ہوگی۔ (کاروائی رجسٹر)

ان تحریروں سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مدرسہ کے معماروں میں آپ کا قد کتنا اونچا ہے، سچی بات یہ ہے آپ جیسے بے لوث خادم اور ہمدرد مدرسہ کو نہیں ملتے تو شاید مدرسہ ترقی کے وہ منازل طے نہیں کرپاتا جو اس نے کم وقت میں طے کیا، اورایسا طے کیا کہ مدرسہ علاقہ کی تعلیمی ترقی کا پہچان بن گیا۔

حاجی نثار صاحب کے بقول آپ کا انتقال ۷۳ء کے قریب ہوا ہے۔

وجیہ الحسنؒ

آپ بھی مسماۃ حسن بابو کے نواسہ ہیں، والد محترم کا نام قاری محمد داؤد ہے، ''ڈھیٹر بابو'' سے مشہور تھے، آپ محبّ الحسن کے خلیرے بھائی اوران کی خصوصیات میں شریک تھے، سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے، حاجی عبدالحق صاحب کے زمانہ میں آپ قصبہ کے سرپنچ رہے۔

مدرسہ سے خاص تعلق رکھتے تھے، گلشن ادب کے نام سے ایک لائبریری کا قیام آپ کی مرہون منت ہے، جو بعد میں شفیع اردو لائبریری کے نام سے موسوم ہوئی، حاجی نثار صاحب کے بقول آپ کا انتقال ۷۵ء میں ہوا ہے۔

سمیع الدین بابوؒ

آپ کے والد حافظ محمد سلیم اپنے زمانہ کے مشہور لوگوں میں تھے، بڑے کاشتکار تھے، قرآن بہت یاد تھا، کہا جاتا ہے کہ گاؤں سے کھگڑیا قرآن پڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے، آپ کی شرافت ونیک نفسی آپ کے صاحبزادے سمیع الدین میں بھی منتقل ہوئی، اور وہ زمین جائیداد کے ساتھ ان اعلی اخلاق کے بھی وارث ہوئے، ارادہ کے مضبوط اور بات کے پکے تھے، دینی مزاج کے حامل تھے، بڑے شریف اور خوددار تھے، ان کی دینداری کو دیکھتے ہوئے لوگ انہیں

صوفی بھی کہتے تھے،قصبہ کے تعلیمی،سماجی اوررفاہی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، مدرسہ،قبرستان اورجامع مسجد تینوں سے تعلق تھا،اوران تینوں کی ایسی بے لوث خدمت کی کہ آپ کے بغیران میں سے ہرایک کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔

آپ کو ہمدردی،غمگساری اورخدمت خلق کا بے پایاں جذبہ قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا،علاقہ میں تعلیم کوفروغ دینے کا بڑا جذبہ تھا،اوراس لئے سب کچھ قربان کردینا چاہتے تھے، مدرسہ سے قلبی لگاؤاوردلی تعلق تھا،اوریہ تعلق ابتداء سے ہی تھا،مدرسہ کا ریکارڈ ۵۲ء سے محفوظ ہے،۵۲ء کے ریکارڈ میں آپ کومجلس منتظمہ کمیٹی کا سکریٹری لکھا گیاہے،اس سے پہلے آپ کس حیثیت سے مدرسہ سے وابستہ تھے،اورکب سکریٹری بنے،اس کی وضاحت نہیں ہے، ۵۶ء تک آپ یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے،کاروائی رجسٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت چونکہ مدرسہ کے ایک نئے دورکی شروعات ہورہی تھی،چنانچہ چھوٹے چھوٹے اموربھی باہم مشورہ سے انجام پاتے تھے،۵۴ء میں آپ نے اپنی مصروفیات کی بناء پراس ذمہ داری سے معذرت کی،مجلس منتظمہ کے اراکین نے اس معذرت کوقبول نہیں کیااورآپ کوبحیثیت سکریٹری باقی رہنے پرشدید اصرارکیا،اس میٹنگ کی کاروائی کے جوالفاظ ہیں ان سے آپ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے،کاروائی رجسٹر میں تحریر ہے:

> جناب سمیع الدین صاحب کے استعفیٰ پرممبران نے زوردارالفاظ میں ان سے التماس کی کہ آپ اپنے استعفیٰ کوواپس لے لیں،مستقبل قریب میں دیکھا جائے گا،مگرمذکورموصوف نے ممبران کی باتوں کوپس پشت ڈالتے ہوئے اپنی معذوری ظاہر کی کہ میں تنہا آدمی ہوں،مجھ سے مدرسہ کے امور باحسن الوجوہ انجام پذیرنہیں ہوتے ہیں،لہٰذا میں مجبور ہوں،پھربھی ممبران نے ان کے استعفیٰ کومنظورنہیں کیااوربعد میں جناب محبّ الحسن صاحب سے اکثرممبران نے یہ التماس کیا کہ آپ نائب ناظم کے عہدہ کوسنبھال لیں،تاکہ ناظم صاحب کے کام میں سہولت وآسانی ہو،کیونکہ واقعی ناظم صاحب ایک

> تنہا انسان ہیں،ان کا منیجر بھی ان کے یہاں سے چلاگیاہے،اس سے ان کے کام میں آسانی ہوگی" (کاروائی رجسٹر)

۵۶ء میں آپ نے دوبارہ اس ذمہ داری سے معذرت کی،اس موقعہ پربھی اراکین اورشرکاءنشست نے اصرارکیا،مگرجب آپ تیارنہیں ہوئے توآپ کا استعفیٰ منظورکیاگیا،کاروائی کے الفاظ ہیں:

> ناظم مدرسہ جناب محمد سمیع الدین صاحب کے استعفے کوباجودحاضرین کی معذرت کے بادل نخواستہ باتفاق آراءمنظورکرلیاگیا۔

مارچ ۶۴ء میں مدرسہ کے سکریٹری جناب حاجی عبدالحق صاحب کے انتقال کے بعد ایک بارسکریٹری کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پرڈالی گئی،اس بارپھرآپ نے یہ ذمہ داری قبول کی اورآئندہ نئے سکریٹری کے انتخاب تک اگست ۶۴ءتک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

اس پوری مدت میں جب آپ سکریٹری نہیں تھے،بحیثیت رکن مجلس منتظمہ مدرسہ کی تمام سرگرمیوں میں شریک ہوتے رہے،اورمدرسہ کی تعمیروترقی میں تعاون کرتے رہے،بتایا جاتا ہے کہ آپ بنفس نفیس مدرسہ جاکراساتذہ کوچیک کیا کرتے تھے،مدرسہ میں وقت دیتے، بحیثیت سکریٹری آپ کے دورکومدرسہ کازریں دورکہا جاتا ہے۔

مدرسہ کے علاوہ تاحیات قبرستان کے سکریٹری رہے،جامع مسجد کی تعمیر میں بڑاسرگرم حصہ لیا،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی سکریٹری شپ سے یکسوہوکرآپ قبرستان اورجامع مسجد کی تعمیر کی خدمت میں مشغول ہوگئے تھے،اس کی تصدیق کاروائی رجسٹر کی اس تحریر سے ہوتی ہے:

> اپریل ۶۲ء میں سکریٹری مدرسہ جناب محبّ الحسن صاحب نے اپنے گھریلو مصروفیات کی وجہ سے استعفیٰ دیدیا،میٹنگ میں اس استعفیٰ پرغورکیاگیا،اور کسی ایسے شخص کوتلاش کیاگیاجواس ذمہ داری سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوسکے،بستی میں دوسرے اصحاب پرممبران نے نظرڈالی،لیکن کوئی مناسب

اور معقول آدمی نظر نہیں آئے، جناب سمیع الدین صاحب کا اسم گرامی پیش کیا گیا، لیکن ان کے ذمہ رفاہ عامہ کے متعدد کاموں کی ذمہ داری کو دیکھ کر اراکین کی ہمت نہیں ہوئی کہ یہ بارِ عظیم ان کے ذمہ ڈالا جائے۔

(کاروائی رجسٹر، ص:۵۲)

''رفاہ عامہ کے متعدد کام''، مسجد کی تعمیر اور قبرستان سے متعلق ذمہ داری کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے، بہر حال آپ کی پوری زندگی ملی خدمات سے عبارت تھی، قصبہ کے سماجی ورفاہی کاموں اور بطور خاص ان تین اداروں کی تعمیر وترقی میں آپ کا خون جگر شامل ہے۔

۲۷ مئی ۱۹۷۷ء کو مسلمانوں کے اس سچے محسن، ہمدرد اور ملت کے خاموش خادم نے زندگی کی آخری سانس لی، اور اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوگئے۔

محی الدین مسہرو بابو

حافظ محمد اسماعیل کے صاحبزادے محی الدین مسہرو بابو قصبہ کے مشہور سماجی لوگوں میں تھے، ان کو 'غریب داس' بھی کہا جاتا ہے، بڑے کاشتکاروں میں تھے، ہمیشہ مدرسہ کے معاون رہے، ۵۶ء میں جب جناب عبدالغفار بابو نے صدارت سے استعفیٰ دیدیا تو آپ ہی مدرسہ کے صدر منتخب ہوئے۔

آپ قصبہ کے سرپنچ بھی رہے، آپ کے دور میں فیصلے باضابطہ عدالتی انداز میں ہوتے تھے، شفیع الرحمٰن شفیع صاحب اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> پنچایت کے سرپنچ تھے، پنچوں کے درمیان بڑے مقبول تھے، مقدمات کی مثل رکھی جاتی اور طریقۂ کار بالکل قانونی ہوتا، گواہوں کے بیانات لکھے جاتے اور ثبوت بھی مثل میں رکھے جاتے تھے۔
>
> (مولانا ممتاز علی مظاہری کی کہانی یادوں کی زبانی، از: شفیع الرحمٰن شفیع)

اک زمانہ میں قصبہ کی دو برادریوں یعنی ''بارہ گھریا'' اور 'تیرہ گھریا'' کے درمیان دوری خاصہ بڑھ گئی، اور یہاں کی قدیم باشندے ''تیرہ گھریا'' والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم لوگوں

کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، دونوں برادریوں کے درمیان انصاف کے پیمانے الگ الگ ہیں، اس موقعہ پر جنہوں نے حاکم طبقہ یعنی حاجی عبدالحق صاحب کے خلاف آواز اٹھائی وہ یہی شخص تھے، ان کی آواز کے بعد یہ ایک تحریک بنتی گئی، عبدالحق صاحب اپنے دور کے بڑے آدمی تھی، ان کا رعب وجلال مشہور تھا، ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا معمولی بات نہ تھی، محی الدین بابو یہ سب کچھ دیکھ کر میدان میں آئے، مکھیا کے الیکشن میں عبدالحق صاحب کے خلاف کھڑے ہوئے، اس جرأت واقدام کی وجہ سے لوگ ان کو 'غریب داس' کہنے لگے، حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ جس عبدالحق صاحبؒ کے خلاف میدان میں آئے وہ رشتہ میں آپ کے خالہ زاد بھائی تھے، ۱۹۸۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

حاجی محمد منیر الدینؒ

آپ بڑے کاشتکار اور چمڑے کے گودام دار کی حیثیت سے علاقہ میں معروف تھے، سماجی وفلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے، مظلوموں کی مدد اور پریشان حال لوگوں کی حاجت روائی آپ کی خاص صفت تھی، عبدالحق صاحب کے ساتھ مصاحبت تھی، بلکہ مشیر کی حیثیت حاصل تھی، مدرسہ کے خاص معاون تھے، مالی تعاون کے علاوہ ایک دو استاد اور چند طلبہ کا کھانا اکثر آپ کے یہاں ہوتا تھا، ۵۶ء میں منتظمہ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے اور تقریباً تاحیات رکن رہے، مجلس منتظمہ کی بعض میٹنگیں آپ کی صدارت میں بھی منعقد ہوئی ہیں، مدرسہ کے چند گنے چنے مخلصین ومعاونین میں آپ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب بیان کرتے ہیں:

> ......یہ اور حاجی عبدالرؤف صاحب مدرسہ کے کمیٹی کے ممبر تھے، مدرسہ کے ابتدائی دور میں یہ حضرات بابو محبّ الحسن صاحب سکریٹری مدرسہ کے ساتھ فصل کے موسم میں علاقہ کا دورہ کرتے، اور مدرسہ کے لئے تعاون جمع کرتے، یہ سلسلہ ہفتوں تک چلتا، اپنے بیل گاڑی سے سفر کرتے، سارے اخراجات خود برداشت کرتے، اس طرح مدرسہ کا کام کرتے تھے۔ (یادداشت)

مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی سالوں میں ہی جب مولانا ممتاز صاحب مسلم ہائی اسکول دربھنگہ چلے گئے تو یہی دو حضرات یعنی حاجی منیر الدین اور حاجی عبدالرؤف صاحبان آپ کو بلانے کے لئے دربھنگہ گئے تھے۔

آپ بڑے مہمان نواز تھے، چمڑا کا کاروبار تھا، راشن کا کوٹہ بھی تھا، چینی بنواتے تھے، کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ریڈیو انہی کے پاس آیا، لوگ اسے دیکھنے آتے تھے، اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے نجی ہینڈ پائپ انہوں نے ہی لگوایا، علاقہ کے رؤساء سے ان کے گہرے تعلقات تھے، بطور خاص نرہیا، انہار بن، راج نگر وغیرہ کے معروف لوگوں سے رابطہ تھا، حاجی عبدالحق صاحب کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی، ۱۵ر فروری ۱۹۸۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

حاجی عبدالرؤفؒ

دینی مزاج کے حامل تھے، بڑے کاشتکاروں میں تھے، قصبہ کے معروف لوگوں میں ان کا بھی شمار تھا، حاجی عبدالحق صاحب کے خاص مصاحبین میں سے تھے، گائے کی قربانی سے متعلق ان کا ایک واقعہ مشہور ہے جس سے ان کی دینداری کا پتہ چلتا ہے، واقعہ یوں ہے کہ ان کے زمانہ میں گائے ذبح کرنا ممنوع ہوگیا تھا، قربانی کے موقع پر انہوں نے گائے ذبح کی، جس کی مخبری ہوگئی، تھانہ کی طرف سے چھاپہ پڑا، اور آپ کے گھر میں گائے کا گوشت پایا گیا، جس کی بنیاد پر کیس ہوا، اس موقعہ پر لوگوں نے مشورہ دیا کہ عدالت میں کہہ دیجئے کہ میں ہوش میں نہیں تھا، مگر وہ جھوٹ بولنے پر تیار نہیں ہوئے، انہوں نے سچی بات کہی، جس کے نتیجہ میں جیل جانا پڑا، انہوں نے جیل جانا گوارہ کرلیا مگر جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اس دور کے جملہ سماجی ورفاہی کاموں میں شریک رہتے تھے، مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ کے ابتداء سے ہی آپ کا نام مجلس منتظمہ میں شامل ہے، مدرسہ کی تعمیر وترقی کے لئے فکرمند رہتے، اور عملی طور پر فراہمی مالیات کے لئے نکلتے تھے، فصل کے موسم میں اپنے بیل گاڑی سے علاقہ میں جاتے اور مدرسہ کے لئے چندہ کرتے تھے، ۱۹۸۸ء میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

عبداللطیفؒ مہراج پور

شیخ معین الدین کے فرزند عبداللطیف کا شمار اس وقت کے معروف لوگوں میں ہوتا تھا، شرافت اور صلاح وتقوی والد صاحب سے وراثت میں ملی تھی، ان کی عبادت اور نیکی کا یہ حال تھا کہ مغرب کی نماز کے لئے سجدہ میں گئے اور روح قبض ہوگئی، اس پر مستزاد یہ کہ رمضان کا مہینہ اور اعتکاف کی حالت، بارگاہ الٰہی میں مقبولیت کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہوگی۔

حاجی حبیب اللہ اسیرؒ راجپور

آپ کے والد کا نام فقیر محمد ہے، آپ علاقہ کے چند گنے چنے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، بڑے خوش حال، ذی شعور اور شریف آدمی تھے، امانت کا کام بھی کرتے تھے، اس وقت ہر پنچایت میں راج دربھنگہ کی طرف سے ایک 'اسیر' ہوا کرتا تھا، یہ گویا ایک اعزازی عہدہ تھا، جس کا کام پنچایت کے اہم واقعات کی اطلاع حکومت کو کرنا تھا، تھانہ کے چوکی داروں کی دیکھ ریکھ بھی انہی سے متعلق ہوتی تھی، آپ اسی عہدہ پر فائز تھے، اس لحاظ سے سماج میں آپ کی عزت بھی تھی، اور وقار بھی، کہا جاتا ہے کہ سرکار سے آپ کو وظیفہ (کمیشن) بھی ملتا تھا، ملک کی آزادی کے بعد یہ چیز ختم ہوگئی، علاقہ کے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں سے بھی آپ کے اچھے تعلقات تھے۔

حکیم صدیقؒ راجپور

والد کا نام حاجی حبیب اللہ ہے، فرنگی محل لکھنؤ سے باضابطہ عالم تھے، لکھنؤ ہی میں آپ نے حکمت کی بھی تعلیم حاصل کی، آپ حکمت کا کام کرتے تھے، اور اسی میں مشہور ہوئے، گھر پر کاشتکاری کرتے تھے، نیک طبع اور شریف تھے، چونکہ جمعہ کی نماز قصبہ میں ہی جائز ہے، اس مسئلہ کی بنیاد پر آپ ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھنے یکہتہ آتے تھے۔

حسین بابو

اپنے وقت کے بڑہ صاحب ثروت تھے، قصبہ واطراف میں اس حوالہ سے شہرت رکھتے

تھے، کہا جاتا ہے اس زمانہ میں انصاف میں حاجی عبدالحق صاحب کا اور ثروت میں حسین بابو کا نام ضرب المثل بن چکا تھا۔

حافظ عبدالقدوسؒ

آپ کا شمار بھی قصبہ کے معروف دینی وملی لوگوں میں تھا، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف سے حفظ مکمل کیا، پھر وہیں کسی کالج سے ہومیوپیتھ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد گھر پر کاشتکاری اور مطب کرتے تھے۔

تعلیمی وسماجی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ۶۳ء میں جب محبّ الحسن صاحب کے استعفیٰ کے بعد جناب عبدالحق صاحب ناظم یعنی سکریٹری اور آپ نائب ناظم یعنی نائب سکریٹری منتخب ہوئے، ۱۵؍جون ۵۸ء تا ۱۰؍اگست ۵۹ء تک آپ نے درجہ حفظ میں تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔

آپ مولانا ممتاز صاحب کے دست راست، انکے مشیر خاص، مدرسہ سے متعلق سارے کاموں میں شریک تھے، جامع مسجد کے لئے آپ کی بڑی خدمات ہیں، تاحیات بلامعاوضہ جامع مسجد کی امامت اور مسجد سے متعلق تمام کاموں کی نگرانی کرتے رہے، جامع مسجد کی موجودہ تعمیر آپ ہی کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔

مولانا امتیاز ندوی کے مطابق ۵۸، ۶۰ء کے درمیان ڈاکخانہ میں غبن ہوا، چنانچہ انگریز افسر اس کی تحقیق کے لئے آیا، ڈاکٹر فاروق صاحب نے اس سے بات چیت کی، انہوں نے ایک امانت دار آدمی کا مطالبہ کیا جو ڈاک خانہ کی ذمہ داری سنبھال سکے، ڈاکٹر فاروق صاحب نے آپ کا نام پیش کیا، چنانچہ اسی وقت آپ ڈاک خانہ کے پوسٹ ماسٹر ہوگئے اور انتقال تک ملازمت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب اپنی یادداشت میں لکھواتے ہیں کہ حافظ عبدالقدوس صاحب مدرسہ رحمانیہ کے معاونوں میں سے ایک بڑے معاون تھے، انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ۲۸؍دسمبر ۹۳ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

نتھو خلیفہ

نتھو خلیفہ کے والد کا نام محی الدین لہرو ہے، اپنے وقت کے معروف سماجی وسیاسی لوگوں میں سے تھے، مشہور خلیفہ تھے، اس حوالہ سے علاقہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے، رزیق صاحب کے مطابق دو میعاد گاؤں کے سرپنچ رہے، یہ ۷۵ء اور اس کے آس پاس کا زمانہ تھا، قاری ذوالفقار صاحب نے اس دور کے مشہور خلیفہ میں آپ کا بھی ذکر کیا ہے۔

عبدالغفار بابوؒ

حاجی عبدالحق صاحبؒ کے داماد اور آپ کے جانشین جناب عبدالغفار صاحب اپنے دور کے مشہور سماجی لوگوں میں سے تھے، مسلم ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد سی ایم کالج سے انٹر کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد زمینداری کی دیکھ ریکھ میں مشغول ہوگئے۔

آپ سنجیدہ اور خاموش طبیعت کے مالک تھے، گاؤں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے، مطالعہ کے شوقین تھے، اخبار بینی کا خوب اہتمام تھا، مدرسہ اور مسجد یہی دونوں آپ کی دلچسپی کے مراکز تھے، ان دونوں کی تعمیر وترقی کے لئے ہمیشہ سرگرم رہے، مدرسہ کے محسنوں میں تھے، اس کی منتظمہ کمیٹی کے صدر بھی رہے، رکن تو ہمیشہ ہی رہے، مدرسہ کے لئے تعاون میں آپ کا ہاتھ ہمیشہ اونچا رہتا۔

مدرسہ کے ریکارڈ میں ایک میٹنگ کی روداد میں آپ کی ایک تقریر کے چند جملے نقل ہوئے ہیں، جس سے آپ کی اسلامی غیرت اور دینداری کا اظہار ہوتا ہے، ۱۵؍اکتوبر ۵۵ء کی میٹنگ میں آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> یہ ادارہ جبکہ اسلامی ہے تو ہم ممبران کو اسلام کے اصول سے منحرف نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اگر ہم ہی لوگ انصاف کا خون کریں گے تو پھر کون لوگ انصاف پر چلیں گے۔

علم اور علماء کی بڑی قدر کرتے تھے، اپنے گھر پر علماء کی مجلس کرواتے، جب کبھی گاؤں

میں کسی بڑے عالم کی آمد ہوتی تو انہیں اپنے گھر مدعو کرتے، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا عابد چندیپوری اور دیگر مؤقر علماء آپ کے یہاں قدم رنجا فرما چکے ہیں، مولانا منت اللہ رحمانی سے تو آپ خود بیعت تھے ہی پورا گھرانہ بھی بیعت تھا، سب محبت وعقیدت سے خانقاہ کے اکابر کا نام لیتے تھے، ۱۹۹۵ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

شبیر احمد زخمی صاحب نے آپ کے بارے میں ایک شعر کہا تھا:

ان سے ملئے یہ ہیں غفار
بند پپنی ہے، اور دل بیدار

اختر جمیل طوفانپور

بیدار مغز، بارعب، سیاسی شعور رکھنے والے، انتہائی ذہین وفطین، انہی اوصاف وکمالات کے حامل تھے، جناب اختر جمیل صاحب، جو عرف عام میں نتھنی بابو سے مشہور تھے، تقریباً ۱۹۳۲ء میں ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے، والد محترم کا نام محمد سلیم ہے، سماجی لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے، سیاست اور سماجی کام آپ کی زندگی کا عنوان ہیں، سماجی انصاف میں ید طولی رکھتے تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو اپنے ناخن تدبیر سے آسانی سے حل کر لیتے تھے، حاجی عبدالحق صاحب اور کلری پٹی پنچایت کے مکھیا بھائی جی بدھیشو ار سے وابستہ اور ان کے دست راست تھے۔

ایک زمانہ تک آپ کے نام کی دھوم رہی، اپنی پنچایت اور اطراف میں آپ کا رعب و دبدبہ خوف کی حد تھا، بے باکی اور دلیری میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اور بسا اوقات انصاف کی حد بھی پھلانگ جاتے تھے۔

زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، مگر دینی ہمدردی اور مسلمانوں کے لئے بڑا جذبہ رکھتے تھے، ہمیشہ تعلیم کے لئے فکرمند رہے، مسجد اور مدرسہ کے انتظام کے لئے کوشاں رہتے، مدرسہ اسلامیہ کے قیام میں آپ پورے طور پر نہ صرف شریک تھے، بلکہ اس کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے، ۱۹۶۲ء میں جب مدرسہ اسلامیہ کو مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے الحاق کا فیصلہ ہوا اور مدرسہ کی باضابطہ کمیٹی بنی تو آپ اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے، پہلے صدر عبدالوحید صاحب

کے انتقال کے بعد آپ صدر منتخب ہوئے، اور تاحیات صدر رہے۔

۸/جنوری ۱۹۹۸ء مطابق ۸/رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ بروز جمعرات کو آپ کا انتقال ہوا اور گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

نتھو سرپنچ بشنپور

اپنے زمانہ کے معروف سماجی لوگوں میں تھے، نام محمد داؤد تھا، کسی وجہ سے بچپن میں کان چھدایا گیا، جس کی وجہ سے 'نتھو' کے نام سے پکارے جانے لگے، بعد میں اصل نام کی جگہ یہی نام رائج ہو گیا، ملی وسیاسی سمجھ بوجھ کے آدمی تھے، غریبوں کی مدد کرتے، مظلوموں کو انصاف دلاتے، کمزوروں کا تعاون کرتے۔

ایک یا دو مدت تک اپنی پنچایت کے سرپنچ رہے، رشتہ میں میرے دادا مرحوم کے چچیرے بھائی ہوتے تھے، اس لئے ہم لوگ بھی انہیں نتھو دادا کہا کرتے تھے، بڑے شریف اور نرم مزاج کے تھے، میرے بچپن میں ان کا انتقال ہوا ہے، یہ تقریباً ۸۶ء یا اس کے قریب کا زمانہ تھا، عبدالجلیل وعبدالعزیز کے بعد اس گاؤں کے یہ پہلے شخص ہیں جو علاقہ میں معروف ہوئے، غیر مسلموں سے بھی اچھے تعلقات تھے، اب بھی پرانے لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں۔

حافظ ظہور احمدؒ

اپنے دور کے صاحب ثروت اور ذی حیثیت لوگوں میں آپ کا شمار تھا، غریبوں کے تعاون میں آپ کا ہاتھ ہمیشہ اونچا رہتا، ہر سال بہت سی غریب لڑکیوں کی شادی کراتے، کثرت سے خیر خیرات کرتے تھے، قاری ذوالفقار صاحب کی تحریر کے مطابق ۱۹۷۱ء میں عیدگاہ کی چہاردیواری کی تعمیر آپ نے اپنی جیب خاص سے کرا کے اس کے حسن کو دوبالا کیا، اور بعض احباب کے مشورہ سے اس کا نام بیت المکرّم رکھا۔ (یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں، ص:۱۱)

صدر عالم شہیدؒ

جناب صدر عالم صاحب کی شہادت کا غم کسے نہ ہوا ہوگا، یہ واقعہ بھی کوئی بھولنے والا ہے،

ابھی سیاست میں پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ سیاست کی نذر ہوگئے، میری واقفیت اور سلام و دعا اس وقت ہوئی جب گاؤں سے نکلنے والے پہلے میگزین ''نشان منزل'' کی رسم اجراء کی تقریب منعقد ہوئی، موصوف نے بڑے بلند الفاظ میں اس کاوش کو سراہا، اس موقع پر جب انہوں نے ایک شعر پڑھا جس کا ایک مصرعہ ہی یادداشت میں محفوظ رہ سکا، جو اس طرح ہے:

میں نے اک شمع جلائی ہے ہواؤں کے خلاف

تو پوری محفل زعفران زار ہوگئی، یہ ان کی جمالی صفت تھی، چند دنوں بعد ان کی جلالی صفت کا بھی اندازہ ہوا، ہوا یوں کہ اچانک خبر ملی کہ موصوف ہم لوگوں (راقم اور برادرم نوشاد عالم ندوی کہ یہی دونوں اس تنظیم کے روح رواں تھے) کو یاد کیا گیا ہے، اور ان کو کسی مضمون پر سخت اعتراض ہے، ساتھ ہی یہ خبر گشت کرنے لگی، کہ صدر عالم صاحب نشان منزل کے کسی مضمون پر سخت برہم ہیں، اور اس پرچہ کے ذمہ داروں کو سخت سست کہنے والے ہیں، یہ سن کر ہمیں حیرت ہوئی، اور قدرے خوف بھی کہ نہ معلوم کیا کہیں گے، مگر ہمت کر کے ہم ان سے ملنے گئے، خلاف توقع بڑے خوشگوار ماحول میں ان سے باتیں ہوئیں، راقم نے مولانا ممتاز صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ مدرسہ رحمانیہ کے بے لوث خادم ہیں، موصوف کو اسی لفظ 'بے لوث' پر اعتراض تھا، بات بڑے جارحانہ انداز میں شروع ہوئی مگر جب ہم لوگوں نے اس لفظ کی وضاحت کی تو جوش قدرے ٹھنڈا ہوا اور پھر تواضع ہونے لگی۔

یہ تھا ایک واقعہ جو مرحوم سے متعلق تھا، اس واقعہ کے بعد ہماری تنظیمی سرگرمیاں سرد ہوگئیں، لہٰذا ملنے کی مناسبت بھی باقی نہیں رہی، ہاں چند سالوں بعد جب الیکشن کے بعد ان کی شہادت کی خبر ملی تو بڑا افسوس ہوا، افسوس اس کا تھا کہ قصبہ نے ایک دلیر اور بے باک آدمی کو کھو دیا، ہمیں غرض شہادت کی وجوہات سے نہیں کہ اس کے کیا اسباب تھے اور یہ صحیح ہوا یا غلط، کہ یہ کام تو عدالت کا ہے، ہاں ہمیں ماتم ان قدروں کا ہے، جن کے ختم ہونے کا غم بہت کم لوگوں کو ہے۔

موصوف ایک بے باک اور نڈر انسان تھے، حاجی منیر الدین صاحب کے چشم و چراغ تھے، ۲۰۰۶ء کے الیکشن میں ان کی اہلیہ سرپنچ کی امیدوار بنی اور کامیاب ہوئی، یہی کامیابی

شاید آپ کی موت کا ذریعہ بن گئی، شہادت کا یہ واقعہ نومبر ۲۰۰۶ء کو پیش آیا۔

حبیب احمد فہمی

ماضی قریب میں گاؤں جن اہم شخصیات سے محروم ہوئی ہے ان میں ایک نمایاں نام جناب حبیب احمد صاحب کا ہے، آپ نتھو خلیفہ کے فرزند تھے، دینی اور عصری دونوں تعلیم سے بہرور تھے، حفظ کی سعادت بھی حاصل تھی، آپ نے جہاں مدرسہ بورڈ سے ڈگریاں حاصل کیں وہیں گریجویشن تک عصری تعلیم بھی حاصل کی، ۲۷ء میں متھلا یونیورسیٹی سے گریجویشن مکمل کیا۔

پوری زندگی سیاسی اور سماجی کاموں میں مصروف رہے، یہی ان کی مشغولیت تھی، اور یہی ان کا میدان عمل تھا، ایک نہایت متحرک وفعال اور جذباتی نوجوان کی حیثیت سے اس وقت سیاست کی وادی میں داخل ہوئے جب گاؤں کے دو طبقوں میں کشاکش زوروں پر تھی، آپ ایک طبقہ کے لیڈر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے، اور مکھیا الیکشن میں کامیابی حاصل کی، آپ اس طبقہ کے پہلے فرد تھے جن کو سیاسی قیادت حاصل ہو رہی تھی، اس لحاظ سے آپ کے اس اقدام کی بڑی ستائش ہوئی، کیونکہ اب تک ایک ہی خاندان میں سیاسی وسماجی قیادت دائر تھی، جس کی وجہ سے دوسرے طبقہ کے بعض افراد میں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے، اور شاید یہی عنوان آپ کی کامیابی کا زینہ بنی۔

اس خاص تناظر میں اگر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ مرحوم نے انقلاب کا جو نعرہ دیا وہ لوگوں کے نزدیک نہ صرف قابل قبول تھا، بلکہ بہت سے لوگ اس تبدیلی کے منتظر تھے، چنانچہ حسب توقع آپ کو سیاسی قیادت حاصل ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ اگر یہ بھی دیکھیں کہ جس محرومی، ناانصافی، امتیازی سلوک، اور تعلیمی ومعاشی پسماندگی کو انقلاب کی بنیاد بنایا گیا، کیا بعد میں اس طبقہ کے لوگوں کو یہ چیزیں حاصل ہوئیں، جب اس دوسرے طبقہ کے پاس قیادت آئی تو اس نے اپنے طبقہ کی اجتماعی ترقی کے لئے کیا کوششیں کیں، کیا اقدامات کئے، جس سے پرانی محرومی کا ازالہ ہوتا اور پرانے زخم بھرتے، تو ہمیں مثبت نتائج کم ملتے ہیں۔

اس خاص نقطہ سے قطع نظر آپ کی سیاسی شخصیت علاقہ میں معروف تھی، آپ تقریبا ۲۲ سال مکھیا اور اپ پرمکھ کے عہدہ پر بھی رہے، اس طویل مدت میں آپ نے گاؤں میں بہت سے فلاحی کام کئے، بلکہ اس دور میں جو بھی سرکاری کام گاؤں میں ہوئے اور جس انداز کے بھی ہوئے، ان سب میں آپ کی شرکت ظاہر و باہر ہے۔

آپ کی ایک اہم خدمت یہ بھی ہے کہ آپ نے گاؤں اور علاقہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے موقع پر مسائل کو حل کرنے میں اور اس کشیدگی کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سیاسی اعتبار سے آپ پہلے راشٹریہ جنتا دل میں شامل تھے، پھر جدیو میں شامل ہوئے اور ضلع سطح کے سکریٹری رہے، مدرسہ رحمانیہ کی مجلس منتظمہ کے رکن رہے، ۱۹۷۸ء میں اس کے صدر بنائے گئے اور ۸۳ء تک بحیثیت صدر مجلس منتظمہ مدرسہ کی سرگرمیوں میں شریک رہے۔

اخیر عمر میں مختلف امراض کے شکار تھے، اور بڑی حد تک سیاسی زندگی ختم سی ہوگئی تھی، پھر علالت بڑھنے لگی اور دھیرے دھیرے کمزور اور بالآخر فریش ہوگئے، اس طرح ۲۷/ جون ۲۰۱۱ء کو زندگی کی آخری سانس لی اور راہی ملکِ عدم ہوئے۔

صوفیائے کرام

حضرت نتھو شاہؒ

آپ کے والد کا نام شاہ بخشؒ ہے، آپ علاقہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں، مولانا بشارت کریم صاحب سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا، اس تعلق کی وجہ سے خانقاہ میں اکثر حاضری ہوا کرتی تھی، اسی وجہ سے 'شاہ' آپ کے نام کا جزء بن گیا، پیشہ کے لحاظ سے کاشتکار تھے، کم پڑھے لکھے تھے، جامع مسجد کی خشت اول جو پرانی مسجد کے نام سے تھی اس میں رات میں عبادت کرتے، چلہ کشی کرتے، آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ ذکر میں آپ کے اعضاء الگ ہو جاتے، اور عضو سے اللہ اللہ کی آواز نکلتی۔

قاری ذوالفقار صاحب اس طرح کا ایک چشم دید واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ایک بار آپ پرانی جامع مسجد میں جو کسی شاہی زمانے کی بنی ہوئی تھی، رات کی تاریکی اور سناٹے میں مشغول مراقب تھے، آپ کے ایک مخالف جوان باتوں پر یقین نہیں کرتا جس کا نام غالباً عبدالحلیم دفعدار تھا، دبے پاؤں چپکے سے مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب کے جسم کا ہر جوڑ علاحدہ ہے، اور اندرون مسجد بکھرا ہوا اچھل رہا ہے، اور اللہ اللہ کی میٹھی میٹھی آواز آرہی ہے، جب اس نے یہ منظر دیکھا تو مارے خوف و دہشت کے غش کھا کر دھم سے زمین پر گر پڑا، شاہ صاحبؒ عملیات روحانی کے ذریعہ اس کو ہوش میں لائے، اور کافی دیر تک نصیحت کرتے رہے کہ بغیر سلام اور بغیر آواز دئے رات کی تاریکی میں مسجد میں داخل ہونا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

(یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں ص:۱۹)

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب ان کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> عصر کی نماز کے لئے جامع مسجد آتے، تو اس کے بعد گھر نہیں جاتے، رات بھر مسجد میں مراقبہ اور وظائف میں مشغول رہتے، اور اشراق پڑھ کر ہی مسجد سے نکلتے تھے، یہی ان کا معمول تھا۔

آپ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ روحانی طور پر خانقاہ گڑھول حاضر ہوا کرتے تھے، یعنی ایک ہی وقت میں وہ یہاں بھی ہوتے، اور خانقاہ میں بھی نظر آتے تھے، اس واقعہ کی صداقت پر کلام ہوسکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ نتھو شاہ صاحب بڑے خدا رسیدہ آدمی تھے، انہوں نے بڑی ریاضتیں کی تھیں، اور پیر ومرشد مولانا بشارت کریم صاحب سے خاص عقیدت تھی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں مولانا بشارت کریم سے خلافت ملی تھی، مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم نے بھی بیان کیا ہے کہ غالباً وہ حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کے مجاز بھی تھے۔

میں حضرت نتھو شاہ کی بزرگی کا پوری طرح معترف ہوں، میرے خیال میں تصوف کے حوالے سے ان سے بڑی شخصیت یہاں کی خاک سے نہیں اٹھی، لیکن مجھے خلافت والی بات خلاف واقعہ نظر آتی ہے، میری ناقص معلومات کے مطابق سلسلۂ نقشبندیہ میں خلافت کا تصور ہی نہیں، ان کے یہاں خلافت دی نہیں جاتی ہے، بلکہ مریدین میں جو زیادہ فائق ہوتے ہیں وہی بعد میں خلیفہ سمجھے جاتے ہیں۔

آپ کے اذکار ومراقبہ کی کیفیات دیکھ کر بہت سے لوگوں کو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی، اور بہت سے قلوب اس عرفانی دولت سے منور ہوئے، آپ سے مستفید ہونے والوں کی تفصیلات نہیں ملتی، البتہ یہ ضرور بیان کیا جاتا ہے کہ جناب عقیل صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول نے آپ کی رفاقت اختیار کی اور تسبیح ومراقبہ کا سلسلہ شروع کیا اور آپ کے ساتھ خانقاہ گڑھول شریف بھی حاضر ہوئے۔

آپ نے دوبار پیدل حج کئے، اور تقریباً بارہ سالوں تک گھر سے غائب رہے، مولانا

ممتاز علی مظاہری کے بقول ۱۹۳۶ء میں ان کی وفات ہوئی، بعض لوگوں نے ان کی تاریخ وفات ۴۶ء بھی بتائی ہے۔

مولانا امتیاز ندوی نے ان سے سنا ہوا ایک شعر سنایا، مجھے نہیں معلوم یہ شعر انہی کا ہے یا کسی اور کا، اگر انہی کا مانا جائے تو یہ ان کے شعری ذوق کی علامت ہوگی، شعر اس طرح ہے:

اک طرف ہے آگ روشن اک طرف ہے ماہ رو
اس دو طرفی آگ میں کیسے بچے گی آبرو

قاری ذوالفقار صاحب آپ کے انتقال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازہ میں بہت زیادہ بھیڑ دیکھی گئی، اور نماز ختم ہوتے ہی یہ بھیڑ ختم ہوگئی، کسی کو معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کون لوگ تھے، اسی طرح آپ کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ تقریباً سال بھر تک آپ کی قبر سے خوشبو آتی رہی، اور جو آپ کی قبر چھو لیتا اس کا جسم خوشبو سے مہکنے لگتا تھا۔ (یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں ص:۲۰)

حافظ امام حسینؒ

آپ مولانا زین الدین صاحب کے صاحبزادے ہیں، مولانا بشارت کریم صاحب سے بیعت تھے، آپ اپنے دور کے ولی کامل سمجھے جاتے تھے، آپ کے صاحبزادے قاری ذوالفقار صاحب آپ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> حضرت مولانا زین الدینؒ کے صاحبزادے اور میرے والد محترم جناب حافظ امام حسین صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ اور ولی کامل تھے، یکہتہ کا ہر بوڑھا مرد وعورت خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور آپ کے کرامتوں سے واقف ہیں، آپ کا تعلق سلسلہ قادریہ چشتیہ سے تھا، پورنیہ ضلع کے ٹھاکر گنج تھانہ کے تحت ایک گاؤں 'عمل جھاڑی' کے ایک ویران وخوفناک قبرستان کے ایک قبر میں بارہ برس تک مراقبہ وچلہ کشی کرتے رہے، گاؤں

کے چندنو جوان مثلا جناب حافظ مسلم صاحب، ڈاکٹر منت اللہ صاحب، حافظ
شبیر صاحب، ان کے علاوہ ململ، رسید پور، سیتامڑھی، دیودھا اور جئے نگر کے
بہت سے حضرات جو اس علاقہ میں رہتے تھے، آپ کی زیارت کے لئے
جایا کرتے تھے، ٹھاکر گنج سے بہادر گنج تک کے علاقوں میں آپ کے کافی
مرید تھے، ان کے چند شاگرد آج بھی باحیات ہیں، ان کے خطوط میرے پاس
آتے رہتے ہیں، بہادر گنج میں آپ کے استاد علی حسین کی آخری آرام گاہ ہے۔

(یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں ص:۲۱)

آپ مزید لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے ایک بار عرس کیا، یہ ۱۹۵۰ء کے قریب کا زمانہ
تھا، اس میں بشیر دیوانہ اور دوسرے بزرگان دین آئے تھے، اس موقع پر شیخ کے حکم پر انہوں
نے پورے قصبہ اور قریب کے دوسرے گاؤں کے تمام لوگوں کی دعوت کی، شیخ نے کہا کہ جب
کھانا تیار ہو جائے تو مجھے بتانا، چنانچہ جب تیار ہوا تو شیخ نے کھانے پر کچھ دم کر دیا، اور کہا کہ
اس کو ڈھانک دو اور ایک کنارے سے نکالتے رہو، کھانا شروع ہوا، اور دوپہر سے شام تک
کھانے کا سلسلہ چلتا رہا، جب کھانے کے لئے کوئی نہیں بچا تو شیخ کے حکم پر دیگ کھولا گیا،
دیگ میں اب بھی کھانا موجود تھا، شیخ کی اس کرامت کا مدتوں چرچہ رہا۔

قاری ذوالفقار صاحب نے اس کے علاوہ دوسری کرامتوں کا بھی ذکر کیا ہے، مولانا احمد
حسین مظاہری صاحب بیان کرتے ہیں کہ پہلے ہیضہ بہت آتا تھا، ایک دفعہ ہیضہ بہت زور کا آیا،
جس میں اموات اس کثرت سے ہونے لگیں کہ ایک ایک گھر سے بسا اوقات کئی جنازے اٹھتے تھے،
جناب امام حسین صاحب نے اپنی عملیات کے ذریعہ گاؤں کو باندھا، طوفان کے قریب بہت سے
جھنڈے لگائے، اس وقت ان کے ساتھ ان کے معاون خصوصی مقبول حسین حجام بھی تھے، اس عمل
کے بعد واقعی ہیضہ آنا بند ہو گیا۔

مولانا عبدالمجیدؒ کسمار

محمد غلام علی کے فرزند مولانا عبدالمجیدؒ اپنے دور کی بزرگ شخصیت گزری ہے، حج بیت اللہ کی

سعادت حاصل تھی، کسمار میں سب سے زیادہ شہرت انہی کو حاصل ہوئی، کسی مدرسہ سے باضابطہ
فارغ تھے، علاقہ میں شہرت رکھتے تھے، کہا جاتا ہے کہ حاجی عبدالحق صاحب وغیرہ آپ کے یہاں
ہی ٹھہرتے تھے، عملیات کے ماہر تھے، آپ کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں، جناب سلطان صاحب
(کسمار) بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ ندی میں طوفان آیا ہوا تھا، آپ نے پانی میں انگلی رکھ دی تو راستہ
بن گیا، اسی طرح ہیضہ کے موقع پر آپ نے اپنے گاؤں کو باندھ دیا، جس سے پورا گاؤں اس وبا سے
محفوظ رہا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ موسلہ دھار بارش میں کھڑے رہتے اور جسم نہیں بھیگتا، ۱۹۷۵ء
کے آس پاس آپ کا انتقال ہوا، دوسری رائے یہ ہے کہ ۶۰ء کے آس پاس آپ کی وفات ہوئی۔

محمد مسعودؒ راجپور

آپ کی جوانی کا دور کچھ یوں ہی گزرا، مگر اس کے بعد اللہ نے ایسی توفیق دی اور دل کی دنیا
کچھ ایسی بدلی کہ اہل اللہ میں شمار ہونے لگے، انتہائی متقی و پرہیزگار، تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن،
کشن گنج اور ٹھاکر گنج وغیرہ میں آپ نے وقت لگایا، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ سے بیعت وارادت کا
تعلق تھا، ذکر مشہور تھا، مولانا احمد حسین مظاہری بتاتے ہیں کہ ان کے ذکر میں بڑا جلال تھا، تہجد کے
بڑے پابند تھے، ہمیشہ مسجد میں تہجد پڑھتے تھے، تہجد کے عاشق کو اللہ نے ایسا قبول کیا کہ اسی نماز کی
حالت میں روح قبض ہوئی، ۷۰ء یا ۷۲ء میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

منشی محبّ اللہؒ

ایک صوفی منش انسان، خلوص وللّٰہیت کے پیکر، سادگی اور تواضع کی مثال، چہرے سے
شب بیداری کی علامت ہویدا، روشن پیشانی اور آنکھیں آہ سحر گاہی اور دعائے نیم شبی کی غماز،
نہ عالم نہ حافظ، اسکول کے تعلیم یافتہ، مگر قرآن سے ذوق وشوق ایسا کہ زندگی بھر قرآن کی
خدمت کی سعادت حاصل رہی، نماز، ذکر، تلاوت اور ان سب سے وقت ملے تو مطالعہ یہی ان
کا شغل تھا، اور یہی مصروفیت، دنیا کی ظاہر بیں نگاہیں یہی دیکھتی رہیں کہ اس اللہ کے بندے
نے مشقت بھری زندگی گزاری، عام نگاہوں نے یہی دیکھا کہ وہ ایک عام سے آدمی تھے، لیکن

حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل محبت الٰہی سے آباد تھا، ان کی آنکھیں اشک سحر گاہی سے تر رہتی تھیں، زبان ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتی، رات کا بیشتر حصہ ذکر واذکار اور عبادت میں گزرتا، وہ تصوف سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ انہوں نے اس راہ کی اہم منزلیں طے کیں، وہ اہل دل تھے، بلکہ اہل اللہ میں سے تھے، اور صحیح بات یہ ہے کہ انہیں بہت سوں نے دیکھا، برتا، مگر کم لوگ ہی ان کو پہچان سکے، اور ان کے اصل جوہر سے واقف ہو سکے...... یہ اس طرح کی بہت سی خصوصیات کے حامل تھے ہمارے مخدوم ومحترم جناب ''محبّ اللہ'' صاحب، جنہیں کچھ لوگ ''منشی محبّ اللہ'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

جناب محبّ اللہ صاحب ۲۸؍فروری ۱۹۳۲ء کو ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم حافظ صدیق صاحب علاقہ کے معروف حفاظ میں سے تھے، اور حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، ابھی مدرسہ رحمانیہ میں ابتدائی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ یہ چھوٹا خاندان اپنے وطنِ مالوف سے پورنیہ منتقل ہوگیا، آپ بھی اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تھے، یہاں کٹیہار اسکول میں تعلیم شروع ہوئی، نویں کلاس تک پہونچنے کے بعد طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، اور کئی سال زیر علاج رہے، جس کے نتیجہ میں تعلیم کا سلسلہ موقوف ہوگیا، پھر جب صحت بحال ہوئی تو گھر کی ذمہ داریوں میں گھر گئے، اور اس طرح ایک عرصہ گزرا۔

اسی دوران ایک بار تبلیغی جماعت کے لئے نکلے تو کشن گنج میں فردوسی سلسلہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت شاہ تجمل حسین صاحب فردوسی سے ملاقات ہوئی، یہ ملاقات آپ کی زندگی میں اہم موڑ ثابت ہوئی، اور پھر یہیں سے آپ کی زندگی کا رخ بدل گیا، حضرت شاہ صاحب سے بیعت ہوئے اور پھر آپ کی صحبت اختیار کرلی، ایک سال سے زیادہ عرصہ ان کے پاس گزارا، اس دوران حضرت سے باطنی امور میں کسب فیض کیا اور سلوک کے منازل طے کرتے رہے، آپ کو شیخ کی توجہ کامل حاصل تھی، آپ ان کے منظور نظر بھی تھے، اس لئے بہت کم عرصہ میں بہت کچھ حاصل کرلیا، مگر بعض ناگزیر اسباب کی بناء یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا،

اور آپ ایک بار پھر گھریلو مسائل میں الجھ گئے، اس کے بعد آپ کو اپنے شیخ سے دوبارہ ملاقات کا موقع نہیں مل سکا، کہ اس دوران شیخ کا انتقال ہوگیا، البتہ انتقال سے پہلے شیخ نے اپنے اس مرید باکمال کے لئے ایک خاص وصیت کی۔

شیخ کے انتقال کے بعد آپ نے حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا منور حسین صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، اور موقع بموقعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، اور اس طرح اصلاح باطن کا سلسلہ جاری رہا۔

پورنیہ کے زمانہ قیام میں آپ نے موضع چپھری میں فخر العلوم کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، اور ایک عرصہ تک تدریس کے ساتھ اس کی انتظامی ذمہ داری بھی سنبھالتے رہے، لیکن جب مدرسہ بورڈ سے الحاق کی بات آئی تو آپ اس سے سبکدوش ہوگئے، کیونکہ آپ دینی مدارس کے الحاق کو مفید نہیں سمجھتے تھے، بہرحال یہ ادارہ آج بھی قائم ہے، اور تشنگان علوم کو سیراب کررہا ہے۔

آپ کی زندگی کا سب سے بڑا عنوان خدمت قرآن ہے، زندگی کا بیشتر حصہ اسی کلام الٰہی کے پڑھنے پڑھانے میں گزرا، پورنیہ کے زمانہ قیام میں وہاں کے بعض مکاتب میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں بمبئی کا سفر کیا، ۱۹۸۳ء میں مجلس دعوۃ الحق ہردوئی کی ایک شاخ مدرسہ اشاعت العلوم شیواجی نگر گونڈی میں بحیثیت استاد آپ کا تقرر ہوا، اور ۱۹۸۹ء تک آپ یہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہ ادارہ مجلس دعوۃ الحق سے متعلق تھا، جس کے روح رواں عارف باللہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، چنانچہ ان سے بھی ملاقات کے مواقع میسر آئے، اور پھر ان سے بھی آپ نے اپنا اصلاحی تعلق قائم کیا، ہر سال ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے تھے۔

۱۹۸۹ء میں آپ کی طبیعت خراب ہوئی اور آپ مستعفی ہوکر وطن واپس آئے، کچھ دنوں تک گھر پر رہنے کے بعد اپنے علاقہ میں ہی متعدد جگہوں پر تدریسی سلسلہ جاری رکھا، اخیر میں جب یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا تو گھر کے بچوں کو ہی پڑھانے لگے اور اس طرح تدریس سے تعلق

آخری وقت تک قائم رہا۔

۱۹۹۸ء کے آس پاس آپ کی ملاقات ایک نقشبندی بزرگ حضرت ڈاکٹر علی احمد عرف ناظر صاحب دامت برکاتہم (سیوان) سے ہوئی، اوران سے بھی عقیدت اتنی بڑھ گئی کہ بیعت وارادت کا تعلق قائم ہوگیا، ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے آپ پھر اپنی پرانی منزل پر پہونچ گئے، خود ڈاکٹر صاحب بھی آپ سے بڑی محبت فرماتے، اور بلند کلمات کہتے تھے، مرید باصفا کا اس آخری شیخ سے تعلق اخیر وقت تک قائم رہا۔

آپ کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں محبت الٰہی کی آگ روشن تھی، عشق ومحبت الٰہی کی بھٹی میں آپ کی زندگی کندن بنتی رہی، جب اور جہاں آپ کو اس راہ کے رہرو ملے، آپ نے بڑھ کر ان کا دامن تھاما، اوران کی رہنمائی میں راہ سلوک کے منازل طے کرتے رہے، زندگی کی آزمائشیں اور زمانہ کے ستم شاید آپ کو کندن بنانے کے لئے تھی، اور آپ واقعی کندن ثابت بھی ہوئے، محبت الٰہی میں جلنے اور سلگنے کا جو بدل اللہ تعالی کے یہاں ملے گا وہ اللہ ہی جانتا ہے، دنیا میں مقبولیت کی ایک مثال یہ بھی نظر آئی کہ آپ شیخ اول حضرت شاہ تجمل حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انتقال کے وقت آپ کے لئے اجازت وخلافت کی تحریری سند لکھ کر اپنے داماد کے حوالہ کیا کہ جب محبّ اللہ ملیں یا ان کے بارے میں معلوم ہو تو ان تک یہ امانت پہونچا دینا، انتقال سے چندسال پہلے شیخ کے داماد کی طلبی پر آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، جہاں آپ کو شیخ کی امانت 'نامہ خلافت' کی شکل میں پیش کی گئی۔

جب آپ کو اس امانت کی خبر ملی تو آپ بڑے متفکر ہوئے، خود راقم سے متعدد بار کہا کہ میں اب اپنے اندر اس امانت کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں پاتا ہوں، پھر برادرم نوشاد عالم ندوی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آپ کے معمولات میں حیرت انگیز تبدیلی آچکی ہے، عمر کے اس مرحلہ میں بھی آپ کی شب بیداری اور عبادت وریاضت قابل رشک تھی۔

آپ اپنے معمولات کے بڑے پابند تھے، مطالعہ کا بہت شوق تھا، تصوف کی بعض اہم کتابیں مثلا احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت، مکتوبات صدی، دوصدی اور دیگر کتابیں اکثر

مطالعہ میں رہتیں، زندگی بڑی سادہ تھی، حتی الامکان سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے، قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھانے کی گویا مہارت حاصل تھی، نورانی قاعدہ پڑھانے کی تربیت حاصل کی تھی، اس میں آپ بہت کامیاب تھے، رزق حلال کی بڑی فکر رہتی، حرام اور حرام کے شبہات سے بھی بچتے رہتے، یہی وجہ ہے کہ فقر وفاقہ اور قناعت کی زندگی بسر کر لی مگر حرام کمائی کے قریب بھی نہیں گئے۔

خود راقم کو آپ سے والہانہ تعلق تھا اور آپ بھی اس سراپا تقصیر سے خصوصی محبت وشفقت کا معاملہ کرتے تھے، آپ سے ملاقات اور گفتگو میں ایک لطف ملتا تھا، جب بھی ملنے کا موقع ملتا اور میں حاضر ہوتا تو ایسی خوشی کا اظہار کرتے گویا مجھ سے زیادہ خود ان کو خوشی ہو رہی ہے، میری کتاب چھپی تو اصرار سے منگوایا اور پوری کتاب پڑھی پھر بڑے اچھے حوصلہ افزا کلمات کہے، ان کا ایک جملہ جو شاید میں کبھی نہ بھول پاؤں، ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ کہا ''میں نوشاد میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں سمجھتا ہوں'' سچی بات یہ ہے کہ ان کے دل میں میرے لئے بڑی قدر تھی، اور صرف میرے لئے ہی نہیں بلکہ اکثر نوجوانوں کے لئے ان کا یہی انداز تھا، کئی بار مختلف طلبہ کا تذکرہ آیا تو انہوں نے نام سنکر یا دیکھ کر بلا ساختہ کہا ان کی پیشانی بڑی روشن ہے، ان کو نوجوان طلبہ سے بڑی توقعات تھیں، جس کا اظہار اکثر کیا کرتے تھے۔

گاؤں کی تاریخ اور شخصیات کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے تھے، میں اکثر ان سے بہت سی باتیں پوچھا کرتا تھا، مگر میں نے اس وقت پورا فائدہ نہیں اٹھایا، جب یہ کام شروع کیا تو ان کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوئی، مگر اب وہ کہاں، اب تو صرف ان کی یادیں ہیں۔

الغرض ۱۴ر فروری ۲۰۰۹ء کی صبح یہ امانت واپس لے لی گئی، زندگی بھر محنت ومشقت سے چور بندہ کے لئے آرام کا پروانہ آگیا، لوگوں نے کہا محبّ اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا، غیب سے صدا آئی علاقہ آج ایک اہل دل سے خالی ہوگیا، درویش صفت انسان سے محروم ہوگیا، ایک صوفی باصفا نہ رہا، قرآن کا بےلوث خادم چلا گیا، بچوں کا کامیاب مربی اور بہت سو کا غمخوار آج دنیا سے رخصت ہوگیا، اہل دل اور اہل محبت کی مجلس سونی ہوگئی، یہ تنہا ان کے فرزندان اور اہل

خانہ کا غم نہیں بلکہ علاقہ کا غم ہے، ملت کا غم ہے، کہ وہ ایک خاندان کے سرپرست ہی نہیں تھے، ایک نسل کے مربی ومحسن تھے۔

رام کے منتی۔ایک مجذوب

یہ ایک مجذوب تھے، ہمیشہ ''رام کے منتی'' کا زبان سے دہرایا کرتے تھے، اسی وجہ سے لوگ ان کو'رام کے منتی' کے لفظ سے پکارنے لگے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ انہیں بہت سی باتیں قبل از وقت معلوم ہو جاتی تھیں، عموماً کسی کے آنے کی یا کسی کے مرنے کی اسی طرح کسی خاص حادثہ کی اطلاع وہ پہلے ہی دے دیا کرتے تھے، برادرم نوشاد عالم ندوی کے بقول یہ ان کے دادا کے ہمراہ پورنیہ سے یہاں آئے، ان کے دادا نے انہیں پورنیہ میں تعلیم دی تھی، جس کی وجہ اپنے استاد کا بڑا احترام کرتے تھے۔

ان کے بارے میں بہت سے واقعات مشہور ہیں، جنہیں کشف وکرامت سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ مسلمان تھے یا غیر مسلم، اس لئے انہیں ہم مجذوب ہی کہہ سکتے ہیں۔

رام کے منتی کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ان کو دفن کیا جائے یا غیر مسلموں کے حوالہ کیا جائے، کیونکہ کسی نے کبھی کلمہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا، ہمیشہ ''رام کے منتی'' کا لفظ ہی ان کے زبان پر ہوتا، چنانچہ بڑے غور وفکر کے بعد یہ طے ہوا کہ اس کا جنازہ تو نہیں ہوگا، البتہ دفن کیا جائے، چنانچہ ان سے خاص تعلق رکھنے والے رشید خلیفہ نے اپنے دروازہ کے سامنے انہیں دفن کیا، ان کو جاننے والے آج بھی بہت سے افراد موجود ہیں۔

چند قابل ذکر خواتین

مسماۃ حسن بانوؒ

کاظم حسین کی اہلیہ اور حاجی کریم بخش دو ہتمل کی صاحبزادی مسماۃ حسن بانو اپنے وقت کی نامور خاتون گزری ہیں، آپ بڑی نیک، دیندار، انتہائی مخیّر اور پیکر جود سخا تھیں، شوہر کے انتقال کے بعد نہ صرف زمینداری کے کام کو سنبھالا بلکہ ایک رہنما کی طرح سماجی کام بھی دیکھتی رہیں، بڑا جاہ وجلال تھا، بڑی دیندار تھیں، سماجی اور فلاحی کاموں میں پیش پیش رہتیں، بڑی غریب پروری میں بے مثل تھی، انہیں اپنے زمانہ کا حاتم طائی بھی کہا جاتا تھا، ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ اردو میں بات کرتی تھیں، کبھی اپنی مادری زبان استعمال نہیں کرتیں، کہا جاتا ہے کہ آپ ہاتھی رکھتی اور اس پر سوار ہو کر کبھی کبھی اپنے حلقۂ زمینداری میں دورہ پر نکلتی تھیں۔

مدرسہ رحمانیہ سے بڑا تعلق تھا، مدرسہ کے تعاون میں ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی، اور دل کھول کر مدرسہ، وہاں کے طلبہ اور اساتذہ پر خرچ کرتی تھیں، مدرسہ سے متعلق پرانی تحریر میں ان کی خدمات کا ذکر اس طرح ہے:

> یوں تو یہ مدرسہ تمام بستی والوں کے چندہ کے اوپر چلتا رہا ہے، مگر کل آمدنی کا نصف حصہ اس بستی کے ایک مخیّرہ عورت مسماۃ حاجہ حسن بانو صاحبہ اللہ ان کی عمر دراز کرے، اپنی جائیداد سے عطا کیا کرتی ہیں، مدرسین وطلبہ کی ہر ضرورت کو موصوفہ ہر وقت پورا کرنے کے لئے برضا ورغبت تیار رہتی ہیں، ابھی جو مدرسہ کا موجودہ مکان ہے انہی موصوفہ کی اکثر امداد واعانت پر تعمیر کی گئی ہے۔

مدرسہ میں جب بیرونی طلبہ رہنے لگے تو ان طلبہ کے قیام وطعام کا مدرسہ میں انتظام نہیں

تھا، بلکہ قصبہ کے خوشحال افراد اپنے گھروں میں ان کے کھانے کا نظم کرتے تھے، مسماۃ حسن بانو صاحب کے یہاں بھی مستقل کچھ طلبہ اور اساتذہ کا کھانے کا نظم ہوا کرتا تھا، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب اپنی یادداشت میں لکھواتے ہیں:

> محبّ الحسن بھولا بابو، اور ان کی نانی مسماۃ بانو صاحبہ مدرسہ رحمانیہ کی حتی الوسع جان ودل سے خدمت کرتے تھے، ایک مدرس اور ایک طالب علم کا مسماۃ بانو کے یہاں ہمیشہ قیام وطعام رہا، جب میری تقرری ہوئی تو میرا قیام و طعام بھی انہی کے یہاں تھا، جب بیرونی اساتذہ آئے تو میں نے یہ قیام و طعام ان کو دیدی، مسماۃ بانو صاحبہ اگہن کے زمانہ میں، آم کے زمانہ میں، مرہی، چوڑا، آم وغیرہ طلبہ ومدرسین کے لئے برابر بھیجتی تھی۔

علماء اور بزرگان دین سے بڑا عقیدتمندانہ تعلق رکھتی تھیں، مولانا محمد علی مونگیری سے بہت ہی زیادہ عقیدت رکھتی تھیں، آپ سے بیعت بھی تھی، اور اس وجہ سے مونگیر آنا جانا تھا، وہ ہمیشہ علماء اور بزرگان دین اور صوفیاء کو اپنے یہاں بلاتی رہتی تھی، اور وعظ ونصیحت کی مجلسیں ہوتی رہتی تھیں، مولانا مونگیری کے علاوہ جو بزرگان دین تشریف لاتے رہے ان میں مولانا حشمت اللہ رحمانی، مولانا محمد عابد چندیپوری (بنگال)، مولانا سلیمان پھلواری، مولانا فصیح عالم استھانوی کے علاوہ اعظم گڑھ، دیوبند کے علماء بھی شامل ہیں، ان حضرات کی بڑی خاطر مدارات کرتیں، ان بزرگوں سے ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا، یہ سب آپ کے مہمان ہوتے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ یہاں کے قبرستان میں جامن کا ایک پیڑ تھا، ان کے شوہر کاظم حسین نے اس کو کٹوا دیا، درخت کو کاٹتے ہی خون کا فوارہ ابل پڑا، اور کئی دنوں تک اس سے خون نکلتا رہا، پھر خون نکلنا بند ہوگیا، مگر پورے قصبہ میں آتش زنی شروع ہوگئی، دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ ایک خاص انداز میں آگ لگتی تھی، اچانک کسی گھر میں آگ لگتی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی مکان جل کر خاکستر ہوجاتے، اس صورت حال سے لوگ بڑے پریشان تھے، انہی دنوں جب حسن بانو مونگیر پہونچی تو اپنے پیرومرشد سے اس واقعہ کو بیان کیا، یہ سن کر مولانا مونگیری یہاں

آنے کے لئے تیار ہوگئے، چنانچہ علماء کی ایک جماعت کے ساتھ آپ تشریف لائے، اس وقت کھوٹونہ میں ریلوے لائن نہیں تھی، بیل گاڑی سے لوگ سفر کرتے تھے، آپ راج نگر اترے، وہاں سے یہاں پالکی پر لائے گئے، کئی دنوں تک آپ کا قیام رہا، اس موقعہ پر قریبی علاقہ کے علاوہ نیپال تک سے بڑی تعداد میں لوگ مولانا مونگیری کی زیارت کو آئے، کہا جاتا ہے کہ روزانہ چھ سات گائیں ذبح ہوتی تھیں، اور یہ سارا نظم اسی خاتون کی طرف سے تھا، اس موقعہ پر بڑی تعداد نے مولانا سے استفادہ کیا، اور آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے، یہ واقعہ ۱۹۲۰ء کا ہے۔

مذکورہ صورتحال کو دیکھنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اس درخت پر جناتوں کا بسیرا تھا، آپ نے اسی جگہ تینوا کا ایک درخت لگوایا، یہ درخت آج بھی موجود ہے، اس میں کبھی پھل نہیں آیا، لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ اس کے نیچے کبھی پتے نظر نہیں آتے ہیں۔

جود وسخا حسن بانو کا امتیازی وصف بتایا جاتا ہے، آپ کے دروازہ سے کوئی خالی نہیں لوٹتا، مدرسہ سے ان کو خاص محبت تھی، اور خوب دل کھول کر تعاون کرتی تھیں، فصل کے موسم میں بڑی مقدار میں غلہ بھیجتی تھی، آم کے موسم میں تو ایک آدھ باغ ہی مدرسہ کے لئے وقف کردیتی تاکہ وہاں کے اساتذہ اور طلبہ آم کھاسکیں، اس کے علاوہ ریکارڈ کے مطابق پونے دوبیگھہ زمین انہوں نے مدرسہ کے لئے وقف کیں۔

حاجی نثار صاحب کے بقول ان کا انتقال ۶۲ء یا ۶۳ء میں ہوا، مرحومہ کی کوئی اولاد نرینہ زندہ نہ رہیں، سب بچپن میں ہی فوت ہوگئے، سات لڑکیاں تھیں، ان سے ہی آگے کی نسل چلی، کہا جاتا ہے کہ جب کوئی حاکم ان کے پاس آتا اور انہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے سارے نرینہ اولاد فوت ہوگئے تو آنے والا بڑی حیرت سے دیکھتا اور کہتا کہ آپ آخر زندہ کیسی ہیں؟ یہ ان کے صبر اور اللہ پر اعتماد کی بات تھی، نہ صرف اپنے دور کی بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس طرح کی بے مثال خاتون اس سرزمین بلکہ علاقہ کی سرزمین نہیں پیدا کرسکی۔

مسماۃ زیب النساءؒ

شمشیر علی کی رفیقۂ حیات زیب النساء قصبہ کی دوسری خاتون ہیں جو اپنی خدمات کے لحاظ

سے بہت مشہور ہوئیں، سماجی اور رفاہی کاموں میں سرگرم رہتی تھیں، کہا جاتا ہے کہ یہ بھی زمیندارن تھیں، قدیم مدرسہ رحمانیہ کی زمین انہی کی وقف کردہ ہے، مدرسہ کے ریکارڈ میں اس کا تذکرہ موجود ہے، دستاویز میں مسماۃ زیبن درج ہے، جو زیب النساء کی بگڑی ہوئی شکل ہوسکتی ہے۔

ام الفاطمہؒ

خواتین میں دینی اور تعلیمی بیداری کی کوشش کے حوالہ سے محترمہ ام الفاطمہ (زوجہ محمد عقیل احمد) کا نام ضرور یاد رکھا جائے گا، یہ شہرۂ آفاق شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق کار مولانا نورالہدی نورؒ کی ہمشیرہ اور مولانا شمس الہدی ململ کی دختر نیک اختر تھیں، ان کا علمی معیار بہت بلند اور مطالعہ وسیع تھا، اسلامی تاریخ کا مطالعہ اس کثرت سے کیا کرتی تھیں کہ اپنے بھائیوں اور افراد خاندان کے درمیان جب کبھی اس موضوع پر بحث ہوتی تو وہ ہمیشہ فائق رہتیں، انہوں نے اپنے گھر پر عورتوں کے لئے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تھا، جہاں روزانہ ایک متعدبہ تعداد میں بچیاں اور عورتیں تعلیم حاصل کرنے آتی تھیں، آپ انہیں قرآن، فارسی اور اردو کی تعلیم دیتی تھیں، اس کے علاوہ عورتوں میں تفسیر بیان کرتیں، عیدو بقرعید میں خطبہ پڑھتی تھیں، ان کے ذریعہ بہت سی خواتین تعلیم سے بہرہ مند ہوئیں، ان کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہوا۔

صابرہ خاتونؒ

بزم حسنات کی روح رواں، لڑکیوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنے والی محترمہ صابرہ خاتون، بیرسٹر محمد شفیع صاحب کی چھوٹی صاحبزادی اور ڈاکٹر محمد فاروق صاحب کی زوجہ تھیں، جماعت اسلامی تحریک سے وابستہ اور اس کی متحرک کارکن تھیں، جماعت کی اصطلاح میں متفقین میں سے تھی، خواتین سے متعلق جو سرگرمیاں جماعت اسلامی کی طرف سے طے پاتی، یہ انہیں اپنے قصبہ میں انجام دیتی تھیں، بزم حسنات کے نام باضابطہ عورتوں کی انجمن قائم کی، جس کے تحت ہفتہ واری پروگرام ہوتے، اجتماعی مطالعہ کا پروگرام ہوتا، انہوں نے عورتوں کے لئے ایک لائبریری بھی قائم کی تھی، بڑی متحرک اور دینی شعور کی حامل تھیں، ۱۹۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

موجودہ دور کی چند قابل ذکر شخصیات

دینی تعلیم سے وابستہ شخصیات

۱۸۸۰ء میں مدرسہ رحمانیہ کی باضابطہ بنیاد پڑی، اس سے پہلے بھی یہاں مکاتب کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، رحمانیہ کے قیام سے گاؤں اور علاقہ میں تعلیم کا بڑا فروغ ہوا، علم کی روشنی جو پہلے چند افراد یا مخصوص خاندان میں منحصر تھی، اب ہر عام وخاص کی رسائی وہاں تک ہونے لگی، جس کے نتیجہ میں قصبہ اوراس کے اطراف میں خاص طور پر اور علاقہ میں عام طور پر تعلیم کی طرف توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی، اور کثرت سے حفاظ، قراء، علماء پیدا ہونے لگے۔

اک زمانہ تک یہاں کے طلبہ کا مرکز توجہ مدرسہ عزیزیہ بہارشریف اور مدرسہ احمدیہ استھاواں تھا، بعد میں ہندوستان کے مرکزی اداروں کی طرف یہ طلبہ رخ کرنے لگے، اس طرح اہل علم کی تعداد سال بہ سال بڑھتی رہی، مدارس کے فارغین، حفاظ اور علماء میں سے اکثریت نے تدریس اور امامت کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا، اور اسی میں لگے رہے، قصبہ اور اطراف کے علماء کی ایک تعداد بورڈ سے ملحق مدارس میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہے، بہت سوں کی قسمت نے یاوری کی اور بورڈ کی سند پر پرائمری اور ہائی اسکول میں ملازمت حاصل کی، زیادہ تر حفاظ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس طرح مکاتب اور مدارس میں تدریس سے وابستہ افراد کی بڑی تعداد ہے، ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی قرآن کی خدمت میں گزار دی، بچوں کی تعلیم کو ہی اپنا نصب العین بنالیا، بعض بڑے اداروں میں پہونچے، بعض حضرات نے تدریس کے ساتھ علمی و تحقیقی کاموں کو اپنا نصب العین بنایا، دین اور علم دین کی خدمت سے وابستہ ان تمام حضرات کی کوششیں قابل قدر ہیں، دین کے یہ خدام صلہ وستائش کی تمنا نہیں رکھتے، انہیں تو اللہ کے اجر پر بھروسہ ہے، اور اسی جذبہ کے ساتھ اپنی عمرِ عزیز دین کی نشر واشاعت میں صرف کررہے ہیں۔

یہاں اختصار کے پیش نظر صرف انہی حضرات کے تعارف پر اکتفا کریں گے جو تعلیم کے میدان میں طویل خدمات کی وجہ سے ایک شناخت رکھتے ہیں، ورنہ دین اور علم دین سے وابستہ تمام افراد ہماری نظر میں یکساں مقام رکھتے ہیں، یہ سب ہماری تکریم اوراعزاز کے مستحق ہیں، مکتب اور مدرسہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اصل مسئلہ اخلاص کا ہے، کیا معلوم کسی مکتب میں پڑھانے والے استاد کا اخلاص کسی بڑے ادارہ کے شیخ الحدیث سے زیادہ ہو!

مولانا محبّ الحسن مظاہری

مولانا محبّ الحسن بن احمد حسین صاحب پرانے دور کے یادگار علماء میں سے ہیں، مدرسہ کے ریکارڈ کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۱۹۴۰ء ہے، ابتداء تا وسطانیہ کی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کی، اس کے بعد سہارنپور کا رخ کیا، شاہ بہلول کے مدرسہ میں ایک سال رہے، پھر مظاہر علوم کی شاخ میں داخلہ لیا، اس کے بعد مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہوئے اور یہیں سے ۱۹۶۲ء میں سند فراغت حاصل کی۔

آپ نے مولانا امیر احمد خاںؒ سے قدوری اور ترمذی اور مفتی مظفر حسینؒ سے مشکوۃ پڑھنے کی سعادت حاصل کی، اس وقت کی روایت کے مطابق آپ نے ان دروس کو مکمل اپنی کاپی میں محفوظ کیا، صحیح بخاری آپ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے پڑھی۔

فراغت کے فوراً بعد یعنی ۱۹۶۲ء میں ہی مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت شروع کی، اور ۲۰۰۴ء تک یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے، اس دوران مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو پرنسپل کا عہدہ ملا، اس سے قبل ایک مدت سے آپ مولانا دامت برکاتہم کی معاونت کرتے آرہے تھے، اور ایک موقعہ پر کمیٹی کی طرف سے آپ باضابطہ مولانا کے معاون بھی مقرر ہوئے تھے، اس طرح آپ نے بیالیس سالوں تک مدرسہ کی خدمت کی، ۲۰۰۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پرائیویٹ طور پر تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

مظاہر علوم میں آپ سجاد لائبریری کے صدر بھی رہے، جو طلبہ کے لئے ایک اعزاز ہوا کرتا

ہے، یہاں کے اساتذہ میں حضرت شیخ الحدیث سے زیادہ تعلق تھا، ان سے فائدہ خوب اٹھایا، انہی کے ہاتھوں پر بیعت بھی ہوئے، اور آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا محمد طلحہ صاحب سے بیعت کی تجدید کی، ان کے علاوہ حکیم اسرائیل جو حکمت کے استاد تھے ان سے بھی خاص تعلق تھا۔

آپ لکھنے کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، مدرسہ رحمانیہ کے اکثر سپاس نامہ آپ کے قلم کی رہین منت ہیں، اصلاح معاشرہ تحریک میں آپ شریک تھے، اس کے لئے آپ نے ایک مقالہ بھی لکھا تھا جو اس کانفرنس میں پڑھا گیا۔

آپ علماء سلف کی یادگار ہیں، تواضع، اخلاق، متانت آپ کی خاص صفات ہیں۔

مولانا احمد حسین مظاہری، طوفانپور

علم کی نشر واشاعت اور بطور خاص قرآن کی تعلیم کے لئے جن ہستیوں نے اپنی زندگیاں وقف کررکھی ہیں ان میں سب سے نمایاں نام مولانا احمد حسین مظاہری کا ہے، کئی نسلوں کے معلم، قرآن کا خاص شغف رکھنے والے اور پوری زندگی قرآن کی خدمت میں بسر کرنے والے، متواضع اور منکسر المزاج شخصیت۔

ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حافظ مسلم صاحبؒ سے حاصل کی، انہی کے پاس حفظ شروع کیا اور دس پارے مکمل کئے، حفظ کی تکمیل حافظ مجیب الحسن صاحب کے پاس کی، اس کے بعد پورنیہ میں حافظ صدیق کے پاس قرآن کا دور سنایا، آپ کی طالب علمی کی زندگی بڑی مجاہدانہ اور مشقت سے پر تھی، فاقہ کشی تک کی نوبت تک آئی، مگر ان مشکلات کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور پہونچے، جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ سے کسب فیض کا موقع ملا، آپ نے اس فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے بھرپور محنت کی اور حضرت کی صحبت سے اپنے دامن مراد کو بھرتے رہے، ۶۵ء میں سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مدرسہ رحمانیہ میں تدریس کی جگہ ملی، جب گاؤں والوں کو اس کی خبر ملی تو

انہوں نے کوشش کر کے اپنے یہاں مدرسہ اسلامیہ میں بحیثیت مدرس بحال کیا جو جلد ہی بہار بورڈ سے ملحق ہوا تھا، ۶۹ء میں صدر مدرسی کی ذمہ داری ملی، جسے سبکدوشی کے وقت تک انجام دیتے رہے، ۲۰۰۳ء میں آپ مدرسہ سے سبکدوش ہوئے۔

اس کے بعد متعدد مدرسہ کے ذمہ داران نے آپ کو اپنے یہاں بلانے کی کوشش کی، مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے معذرت کرتے رہے، البتہ قرآن سے تعلق باقی رکھنے کے لئے اپنے دروازہ پر حفظ کی تعلیم شروع کی، لیکن جلد ہی مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کی طلبی ہوئی، جس کے بعد انکار کی گنجائش نہ تھی، چنانچہ حضرت کی ایماء پر آپ معہد البنات یعقوبیہ تشریف لے آئے اور صدر مدرسی کی ذمہ داری قبول کی، اور اب تک یہیں خدمت انجام دے رہے ہیں، اس طرح تدریس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اور یہاں بھی قرآن سے تعلق باقی ہے۔

تدریس کے ساتھ ایک طویل عرصہ تک آپ اپنے گاؤں کی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں، آپ سے بڑی تعداد میں طلبہ نے استفادہ کیا، آپ کے پاس حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے، یہ راقم بھی فیضیاب ہونے والوں کی فہرست میں شامل ہے، میری تعلیمی زندگی آپ کے مشوروں اور دعاؤں کا رہین منت ہے، ململ جانے کا مشورہ آپ نے ہی والد صاحب کو دیا تھا اور میرے داخلہ کے لئے بنفس نفیس چشمۂ فیض ململ تشریف لے گئے تھے۔

گاؤں اور علاقہ میں تعلیمی فروغ اور مسلم معاشرہ سے ہندوانہ رسم ورواج ختم کرنے میں آپ کی کوششیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

حافظ عبد الحمید، طوفانپور

عبدالحمید بن بنوالی، طوفانپور اپنے وقت کے اچھے حفاظ میں شمار ہوتے تھے، گاؤں کے اہل ثروت کے ظلم وستم اور چیرہ دستیوں سے پریشان ہو کر ہجرت پر مجبور ہوئے اور سوپول کے چھتہی گاؤں میں آباد ہوئے، یہ واقعہ تقریباً ۱۹۶۰ء کے آس پاس کا واقعہ ہے، آپ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ نے اپنے تمام بچوں کو تعلیم سے اس طرح آراستہ کیا کہ آج یہ اہل

علم کا خاندان شمار ہوتا ہے، آپ کے اعزاز کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کا ایک پوتا مولانا نعمت اللہ صاحب جامعہ اشاعت العلوم اکل کواں (مہاراشٹر) جیسے ادارہ میں استاذ ہیں، آپ منصوری برادری سے تعلق رکھتے ہیں، اور پوری برادری میں تعلیم کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

قاری ذوالفقار علی

امام حسین کے فرزند جناب ذوالفقار صاحب حفظ وقرأت کی تکمیل کے بعد مختلف مساجد میں امامت کی خدمات انجام دیتے رہے، ساتھ ہی کتابت کے ہنر سے بھی متصف تھے، اس فن میں آپ نے شہرت حاصل کی، اور عموماً لوگ اسی حوالہ سے آپ کو پہچانتے ہیں۔

میرے نزدیک آپ کا امتیاز اور آپ کی اصل شناخت تصوف سے ہے، آپ کے والد اپنے وقت کے صوفیاء میں سے تھے، یہ دولت وراثت میں آپ کو بھی ملی، تصوف میں آپ کا تعلق سلسلہ قادریہ چشتیہ کے علاوہ مجددیہ مظہریہ سے بھی ہے۔

آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کتابت اور امامت میں گزارا، تقریباً تیس سال تک پٹنہ کے مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے، بہار ورکنگ جرنلسٹ یونین کے ممبر بھی ہیں، اسی کے ساتھ عملیات سے دلچسپی رکھتے ہیں، آپ کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو فائدہ پہونچا ہے، گاؤں کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں، ''یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں'' آپ کا قلمی رسالہ ہے، جس سے راقم نے استفادہ کیا ہے۔

مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی

مدرسہ رحمانیہ کے موجودہ پرنسپل، جامع مسجد کے سابق امام وخطیب اور گاؤں کی مختلف تحریکوں میں سرگرم جناب مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی صاحب نے ابتدائی اور حفظ کی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں مکمل کی، اس کے بعد دارالعلوم مئوناتھ (یوپی) میں کچھ عرصہ رہے، پھر دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۸۴ء میں سند فراغت حاصل کی۔

تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد کولہاپور اور تلک میدان مظفر پور میں امامت وخطابت اور تدریس کے فرائض انجام دئے، ۱۹۸۸ء میں مدرسہ میں تدریس کے لئے بحال ہوئے، اور اب تک یہیں تدریس کا سلسلہ جاری ہے، مولانا فیض الرحمٰن مظاہریؒ کے انتقال کے بعد ۲۰۰۹ء میں آپ مدرسہ رحمانیہ کے پرنسپل بنائے گئے۔

رحمانیہ میں تدریس کے ساتھ آپ تقریباً تیرہ سال تک جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے رہے، اس کے علاوہ قومی تحریک اور اصلاح معاشرہ کمیٹی میں آپ نے سرگرم حصہ لیا، شفیع اردو لائبریری سے بھی وابستہ رہے، اس کی کمیٹی کے ذمہ دار بھی رہے، گذشتہ سالوں میں حج کی سعادت نصیب ہوئی، آپ نے سفر حج کی روداد پر مشتمل ایک رسالہ لکھا، جو ''مشاہدات حج'' کے نام سے مطبوع ہے۔

مولانا امتیاز احمد ندوی

ڈاکٹر عبدالقدوسؒ کے چشم وچراغ، نوجوان عالم دین، سلجھے ذہن اور معتدل مزاج کے حامل، بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے سرفراز، ۷/جنوری ۷۰ء میں علمی وادبی خانوادہ میں آنکھیں کھولیں، والد محترم ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب جہاں سماجی کاموں کے ساتھ مدرسہ اور مسجد کی خدمت کے حوالے سے معروف تھے وہیں چچا مضمحلؔ صاحب جیسے کثیر الکلام شاعر تھے، اسی ماحول میں نشو ونما ہوئی، ابتدائی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کرنے کے بعد عربی کی تعلیم کے لئے مدرسہ فلاح المسلمین تیندوا (رائے بریلی، یوپی) پہونچے، یہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عالیہ اولی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، تین سال تک یہاں کے اصحاب فن اساتذہ سے اکتساب فیض کرنے کے بعد ۸۷ء میں عالمیت کی سند پائی۔

۸۸ء میں آپ نے مدرسہ رحمانیہ میں تدریس شروع کی، اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، اس دوران آپ نے عصری تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، آر کے کالج سے بی اے اور ایم اے کرنے کے بعد اس وقت متھلا یونیورسیٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، آپ کے مقالہ کا موضوع ''سرسید احمد خاں کی فکر ونظر کی توضیح'' ہے۔

۵ر ستمبر ۲۰۱۱ء کا دن آپ کی زندگی کا سب سے یادگار دن ہوگا جب سابق صدر جمہوریہ محترمہ پرتیبھا پاٹل کے ہاتھوں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ (نیشنل ایوارڈ) سے سرفراز ہوئے، یہ ایورڈ جہاں آپ کے لئے افتخار اور اعزاز ہے وہیں قصبہ کے لئے باعث مسرت بھی کہ اس کا ایک فرزند دوسری بار اس اعزاز سے سرفراز ہوا، اس سے قبل مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم اس اعزاز سے نوازے جا چکے ہیں۔

گاؤں کی دینی وتعلیمی کاموں میں ہمیشہ شریک رہتے ہیں، گاؤں کی تنظیم 'قومی تحریک' کے قیام میں آپ بھی سرگرم رہے، راقم الحروف نے طلبہ کی جو تنظیم بنائی تھی اور اس کے تحت تعلیمی بیداری کا جو کام ہوا، اس میں آپ کا بھرپور تعاون شامل رہا، گاؤں میں تعلیمی ترقی کے لئے مثبت فکر رکھتے ہیں۔

علماء، حفاظ اور فارغین مدارس کی کثرت

یہ چند معروف نام ہیں، ورنہ قصبہ اور اس کے مضافاتی بستیوں میں علماء، حفاظ، قراء اور فارغین مدارس کی فہرست بہت طویل ہے، ہم نے یکہتہ اور اطراف کے ان علماء اور فارغین مدارس کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی جو کسی بڑے دینی ادارہ سے باضابطہ فارغ ہیں تو یہ تعداد سو سے متجاوز ہونے لگی، گذشتہ سالوں میں دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ اشاعت العلوم اکل کواں اور دیگر بڑے اداروں سے ہر سال کثرت سے اس علاقہ کے طلبہ فارغ ہو رہے ہیں، جس کی وجہ سے علماء اور فارغین مدارس کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے، اس کثرت تعداد کی وجہ سے خواہش کے باوجود ہم ان کا تعارف یا کم از کم ان کی فہرست بھی شامل کرنے سے قاصر ہیں۔

یہاں کے اساتذہ دیگر درسگاہوں میں

اس قصبہ اور اس علاقہ کو علم کی روشنی کا مینار کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اس چھوٹے علاقہ میں علماء، حفاظ کی جو کثرت ہے وہ کم علاقوں میں ہوگی، یہ علماء اور حفاظ قصبہ اور اطراف کے مدارس

کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان میں ائمہ کی تعداد تو سب سے زیادہ ہے، ملک کا کون سا گوشہ ہے جہاں یہاں کے مدرس یا امام نہیں ہوں گے، اسے اللہ کا خاص فضل ہی کہہ سکتے ہیں، جس نے یہاں کی مٹی میں وہ خاصیت رکھی ہے کہ اس کا ایک ایک فرد اپنے اپنے علاقوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے کام اور حیثیت سے گاؤں کے افراد صحیح طور پر واقف بھی نہیں ہوں گے۔

عصری تعلیم سے متعلق چند اہم شخصیات

عصری تعلیم کی طرف سب سے پہلے کس نے توجہ دی؟ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، شاید رحمٰن بخش صاحب نے باضابطہ عصری تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے بچوں کو دربھنگہ میں رکھ کر تعلیم دلانا شروع کیا، یہ گویا اس سمت پہلی کوشش تھی، آپ کے صاحبزادے بیرسٹر محمد شفیع نے اس سمت مزید کوشش کی، ایک طرف گاؤں کے مڈل اسکول اور دربھنگہ کے ہائی اسکول نے تعلیم کو عام لوگوں کے لئے آسان بنایا، اور دوسرے خود بیرسٹر صاحب نے اپنے خویش و اقارب کے ساتھ گاؤں کے متعدد افراد کو اپنی نگرانی و سرپرستی میں اعلیٰ تعلیم دلایا، اس کے بعد گاؤں میں عصری تعلیم کا عمومی رجحان بنا، بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں میں عصری تعلیم کی طرف بہت زیادہ توجہ رہی، اور یہی رجحان اب بھی ہے، بلکہ اس میں روزافزوں اضافہ ہورہا ہے، البتہ اس مدت میں زیادہ تر لوگوں نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی، پوسٹ گریجویشن کرنے والے کم ہیں، اور اس کے بعد کی تعلیم حاصل کرنے والے اور بھی کم ہیں۔

اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہوں نے اعلی عصری تعلیم حاصل کی، یہاں صرف ان حضرات کے تعارف پر اکتفا کریں گے جو قصبہ واطراف میں اپنی شناخت رکھتے ہیں، اس فہرست میں شامل متعدد حضرات کا تذکرہ علمی وادبی اور سیاسی شخصیات کے عنوان سے آرہا ہے ان کا ذکر یہاں نہیں کیا جائے گا، ورنہ وہ سب اس فہرست میں شامل ہیں۔

پروفیسر توحید عالم

یکہتہ کے مضافاتی گاؤں راجپور کے سب سے ممتاز ترین فرزند، تعلیم کی سب سے اونچی ڈگری رکھنے والے جناب توحید عالم صاحب (راجپور) حکیم صدیق صاحبؒ کے چشم و چراغ

ہیں، فوقانیہ تک مدرسہ رحمانیہ میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد تقریباً ۶۴ء میں مدرسہ شمس الہدی پٹنہ سے عالم اور پھر ادارہ تحقیقات عربی سے فاضل اور کامل (دکتور العلم) کی ڈگری حاصل کی، بعدازیں پٹنہ یونیورسیٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے کیا، یہ تقریباً ۶۹ء کا زمانہ تھا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ تک پٹنہ مسلم ہائی اسکول میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر کھٹونہ کالج میں بحیثیت لکچرر ملازمت شروع کی، شاید ایک یا دو سال یہاں رہے ہوں گے کہ پی ایچ ڈی کے لئے اسکالرشپ کی منظوری آگئی، ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آر ڈی ایس کالج مظفرپور میں ملازمت ملی، جہاں سے انچارج پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مظفرپور میں ملازمت کے بعد آپ نے وہیں سکونت اختیار کی اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے، جس کی وجہ سے اپنے قصبہ اور علاقہ سے رابطہ منقطع سا ہوگیا، ۱۹۸۳ء میں آپ مدرسہ رحمانیہ کے سکریٹری منتخب ہوئے، مدرسہ کے ریکارڈ میں آپ کا تذکرہ موجود ہے، آپ مدرسہ کے موجودہ نظام میں اصلاح چاہتے تھے، اور شاید اس کی کوشش بھی کی۔

آپ مظفرپور میں مقیم ہیں، وطن چھوٹ چکا ہے، عمر کی وجہ سے ضعف بھی ہے، راقم نے معلومات کے لئے متعدد بار رابطہ کرنے کی کوشش کی، باتوں سے اندازہ ہوا کہ اب سماعت متاثر ہے، اور دماغ بھی پورے طور پر کام نہیں کررہا ہے۔

حکیم خورشید

حکیم صدیق کے دوسرے فرزند جناب خورشید صاحب نے مدرسہ رحمانیہ سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ، اور مدرسہ عزیزیہ بہارشریف میں اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے، عالمیت مکمل کرنے کے بعد حکمت کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، طبیہ کالج پٹنہ میں داخلہ لیا اور جی یو ایم ایس (G.U.M.S) کی ڈگری حاصل کی (اس وقت یونانی والوں کو یہی ڈگری ملتی تھی، بعد میں بی یو ایم ایس کی ڈگری ملنے لگی) اس کے بعد چند سال گھر پر رہے، پھر ۸۳ء میں سرکاری ملازمت ملی، آپ نے پٹنہ، بہارشریف، سہسرام، کٹیہار وغیرہ متعدد شہروں کے ہاسپٹلوں میں خدمت انجام دی، ۲۰۰۴ء میں آپ ملازمت

سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

اپنے والد اور دادا کی طرح آپ کی شرافت، سنجیدگی اور مروت معروف ہے۔

پروفیسر بدیع الزماں

آپ ڈاکٹر عبدالقدوسؒ کے فرزند ہیں، ابتداء سے فوقانیہ تک کی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لیا، جہاں ۱۹۶۲ء میں عالم، ۶۸ء میں فاضل حدیث، پھر فاضل فارسی اور اس کے بعد کامل جو اس وقت دکتورالعلم کے نام سے معروف تھا، کی ڈگریاں حاصل کیں، کامل کی ڈگری کے لئے آپ نے علامہ ابن حجر عسقلانیؒ پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔

دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کی طرف بھی توجہ رہی، پہلے پٹنہ کالجیٹ اسکول سے میٹریکولیشن پاس کیا، اس کے بعد ۶۸ء میں بی اے اور ۱۹۷۰ء میں پٹنہ یونیورسیٹی سے فارسی میں ایم اے مکمل کیا، اور پھر ۸۰ء میں پٹنہ یونیورسیٹی سے ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، آپ کے مقالہ کا موضوع 'سید حسین خالص: حالات اور کارنامے' تھا۔

تعلیم کے دوران ہی آپ نے ملازمت شروع کی، چنانچہ ۷۰ء میں شفیع مسلم ہائی اسکول میں تدریسی خدمت شروع کی، اس کے بعد کمار باغ مغربی چمپارن اور شاستری نگر پٹنہ میں بھی رہے، ۸۲ء میں آر کے کالج مدھوبنی میں بحیثیت لکچرار بحال ہوئے اور اب تک یہیں اردو کے استاد کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں، اس وقت آپ لکچرار سے ترقی کر کے اسسٹنٹ پروفیسر کے ساتھ صدر شعبہ بھی ہیں، آپ کی نگرانی میں پانچ طلبہ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

ایم اے کرتے ہوئے آپ نے اردو اور فارسی میں بعض تحقیقی مقالات لکھے، بعد میں یہ سلسلہ جاری نہیں رہا، دربھنگہ ریڈیو اسٹیشن سے آپ کے بعض پروگرام بھی نشر ہوئے ہیں۔

آپ مدرسہ رحمانیہ کی مجلس منتظمہ کے رکن اور ۷۷ء سے ۸۲ء تک اس کمیٹی کے صدر بھی رہے ہیں۔

امتیاز احمد راجو

ایک انتہائی متحرک وفعال نوجوان، چہرے پر ذکاوت وذہانت کے آثار، کشادہ پیشانی پر گہری سوچ کی لکیریں، دل میں جذبات کا اتھاہ سمندر، علاقہ میں تعلیمی ترقی کے لئے بہت کچھ کرنے کا حوصلہ، امنگ اور تڑپ، باتوں میں غضب کی تاثیر، ایک پرکشش شخصیت کے حامل نوجوان......جس کو ہم امتیاز احمد راجو کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔

ہائی اسکول کی تکمیل کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے پی یو سی کیا، یہاں آپ کو زیادہ مدت تک استفادہ کا موقع نہیں ملا، مگر اس ماحول نے ملک وملت کے لئے کچھ کرنے کا ایک عزم وحوصلہ دیا، اس کے بعد مگدھ یونیورسیٹی سے گریجویشن اور پھر فاصلاتی ذریعۂ تعلیم سے ایم بی اے مکمل کیا۔

علی گڑھ سے واپسی کے بعد شبیر احمد زخمی صاحب کے قائم کردہ اسکول ''چلڈرن پبلک اسکول'' کی سرگرمیوں میں شامل ہوئے، زخمی صاحب کے شانہ بہ شانہ کام کیا، ایک دو سال بعد زخمی صاحب ملازمت میں چلے گئے، جس کے نتیجہ میں اسکول پر پوری توجہ نہیں دے سکے اور اس طرح یہ اسکول بند ہوگیا۔

اس کے بعد ۹۲ء میں امتیاز احمد صاحب نے اپنا اسکول ''سنٹرل پوائنٹ اسکول'' کے نام سے شروع کیا، اپنے جذبہ ولگن اور پرکشش شخصیت ومؤثر ترجمانی کی وجہ سے جلد ہی قصبہ کے ساتھ علاقہ میں اس اسکول کو شہرت حاصل ہوگئی، یہ ایک انگلش میڈیم اسکول تھا، جس کو چلانے میں امتیاز صاحب نے اپنی پوری صلاحیت صرف کردی، اپنی کل پونجی لگادی، مگر حیف صد حیف! کہ اس کوشش نے بھی دم توڑ دیا۔

یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا، میں نے اسکول کا چرچہ سنا، ہمارے چچازاد بھائیوں نے اس میں داخلہ بھی لیا، شعور آنے کے بعد جب بھی اس اسکول کے بارے میں سنتا تو بڑا افسوس ہوتا، میرے خیال سے تعلیم کے حوالے سے یہ ایک بہت اچھی کوشش تھی، اگر یہ اسکول اور یہی کیا دوسرے اسکول کامیاب ہوجاتے تو گاؤں کے تعلیمی معیار میں آج بڑا فرق آچکا ہوتا۔

امتیاز صاحب بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے اور ہیں، انگریزی پر اچھا عبور حاصل ہے، ملت کا بے پناہ درد ان کے دل میں ہے، زبان میں کشش ہے، کسی بات کو مؤثر انداز میں پیش کرنے اور سامنے والے کو نہ صرف قائل بلکہ مطمئن کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

اسکول کے زمانہ میں انہوں نے طلبہ کے لئے کئی ڈرامے لکھے، 'راجو کا خواب' ایک تعلیمی ڈرامہ تھا جو گاؤں میں اسٹیج ہوا، 'انسان بنو' ایک کلچرل ڈرامہ تھا جو مدھوبنی میں اسٹیج ہوا، پھر یہی ڈرامہ حیدرآباد کے ریان مشن اسکول میں بھی اسٹیج کیا گیا، یہ ڈرامے بہت پسند کئے گئے، اسی طرح آپ نے بچوں کے لئے نظم بھی لکھی، نئے سال کے موقع کہی گئی نظم کا ایک شعر ہے:

یہ سال نیا آیا پیغام سنا دیں گے
بکھرے ہوئے موتی سے اک ہار بنادیں گے

ان ڈراموں اور اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے اندر تخلیقی صلاحیت تھی، اگر حالات سازگار ہوتے اور آپ کی ان صلاحیتوں کی قدر کی گئی ہوتی تو دیگر چیزوں کے ساتھ یہ تخلیقی صلاحیتیں کس طرح پروان چڑھتیں، اور پھر یہ گاؤں کی شہرت میں کس قدر اضافہ کا سبب بنتیں، مگر ظاہر بینوں اور مفاد کے پجاریوں کو یہ سب کہاں نظر آتا ہے! ترقی اور کمال کو اپنی جاگیر سمجھنے والے برہمن مزاج مسلم چہرے اور اپنے چراغ کی روشنی کو بھنانے کے لئے سورج پر تھوکنے والے خدا معلوم قیامت میں کیا جواب دیں گے!!!

حیدرآباد کے زمانہ قیام میں اور اس کے بعد بھی میری ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں ہیں، میرا یہ احساس ہے کہ وہ آج بھی تعلیم کے تئیں بڑے فکرمند ہیں، ان کے اندر جذبہ اور حوصلہ کے ساتھ تعلیمی ادارہ چلانے کی صلاحیت ہے، علمی پختگی کے ساتھ فکری وسعت اور دردمندی کے حامل ہیں، آج بھی ان کی آنکھوں میں عزم اور حوصلوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، ان کے پاس تعلیم ترقی کے ڈھیروں منصوبے ہیں، مگر ایک بار حوصلہ ٹوٹنے کے بعد دوبارہ اسے جوڑنا آسان نہیں ہوتا۔

اسکول ختم ہونے کے بعد مزید طوفان کا مقابلہ کرنے کے بجائے آپ نے ملازمت کو

ترجیح دی، حیدرآباد میں مشہور کتابوں کی کمپنی 'ہولی فیتھ انٹرنیشنل' میں ریجنل ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا، ان دنوں آپ مظفرپور میں ایک انڈوجرمن کمپنی سے وابستہ ہیں، تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس کی سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں۔

خورشید اکرم

ایک محنتی نوجوان جنہوں نے اپنی محنت، لگن، دھن اور جہد مسلسل کے ذریعہ قصبہ میں ایک تاریخ رقم کی، معاشی تنگ حالی کے باوجود نہ صرف تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اپنے اندر ایسی لیاقت وصلاحیت پیدا کی کہ دوسروں کے لئے مثال بنے، ذہانت کی دولت سے بہرہ مند تھے ہی، محنت اور لگن نے کامیابی کے راستہ کو اور قریب کر دیا، یہ مثالی نوجوان مولانا کلیم اللہ کے فرزند جناب خورشید اکرم صاحب (پیدائش ۲۲/جون ۱۹۶۴ء) ہیں، جو اس وقت بہار ایڈمنسٹریشن میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہیں۔

آپ نے وسطانیہ چہارم تک مدرسہ رحمانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایشوری بھگت ہائی اسکول گوٹ پرساہی سے میٹرک پاس کیا، پھر پٹنہ کا رخ کیا، جہاں پٹنہ کالج سے انٹر، ۸۵ء میں گریجویشن اور ۸۷ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، اس دوران شمس الہدی سے اردو اور فارسی سے فاضل تک کی سند حاصل کی، اس کے بعد آپ نے بی ایڈ بھی کیا، زمانہ طالب علمی سے ہی انگریزی اور فارسی میں ممتاز رہے۔

۸۹ء میں نوودیہ ودیالیہ رانچی میں آپ کو ملازمت ملی، یہاں آپ نے پانچ سالوں تک تدریس کے فرائض انجام دئے، اس کے بعد آپ کا ستارہ اقبال بلند ہوا، جون ۹۵ء میں آپ نے بی پی ایس سی (B.P.S.C) میں کامیابی حاصل کی اور بہار ایڈمنسٹریٹو سروس میں شامل ہوئے۔

آپ کی پہلی پوسٹنگ ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے دربھنگہ میں ہوئی، اس کے بعد کٹیہار، دربھنگہ صدر، بہادرپور، وارث نگر سمستی پور، لکھی سرائے، آرہ، بھاگلپور وغیرہ میں بی ڈی او، سی او اور سینئر ڈپٹی کلکٹر کے عہدوں پر فائز رہے، اس وقت آپ دربھنگہ میں اقلیتی ویلفیر سیل کے ضلع افسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

قصبہ میں تعلیمی اور سماجی ترقی کی فکر رکھتے ہیں، ۲۰۰۱ء میں آپ نے شاہین کلب قائم کیا جس کا مقصد مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے گرلس ہائی اسکول کا قیام تھا، اس سلسلہ میں آپ نے اپنی حد تک کوششیں کیں، ہائی اسکول کے لئے بھی کوشاں رہے، مگر ان دونوں مقاصد میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوسکی، میرے سوال پر آپ نے بتایا کہ بعض معاصرین کی فتنہ سامانی ہمیشہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہی ہے، آپ منفی ذہنیت رکھنے والوں سے شکوہ سنج نظر آئے، آپ کے خیال میں ترقی کی راہ میں ہمیشہ وہی افراد حائل رہے ہیں جو نہیں چاہتے ہیں کہ ان کے بغیر ترقی کا کوئی کام انجام پائے، آپ ایسے افراد سے بھی سخت نالاں نظر آئے جو چاہتے ہیں کہ علم اور سربراہی ہمیشہ ان کی جاگیر رہے، کوئی دوسرا اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

خدا کرے آپ اپنے قصبہ اور علاقہ کے لئے تعلیمی میدان میں کچھ کام کر جائیں، متوسط طبقہ کے لئے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ آپ بہتر جانتے ہیں، اللہ نے آپ کو فکر ارجمندی کے ساتھ ملی ہمدردی سے بھی نوازا ہے، جس کا تقاضہ ہے کہ ذہن کے افکار عمل کے سانچہ میں ڈھلے، اور کوئی ٹھوس کام ہو جو مستقبل میں نوجوانوں کے لئے سنگ میل ثابت ہوسکے۔

ڈاکٹر صباح الدین علی احمد

ڈاکٹر منظور احمد شمسیؒ کے چشم و چراغ جناب صباح الدین علی احمد بھی ڈاکٹری کی اعلی ڈگری رکھتے ہیں، آپ نے لندن سے FRCS کیا ہے، تعلیم کی تکمیل کے بعد سے اب تک سوئزرلینڈ میں مقیم ہیں اور وہیں ملازمت کر رہے ہیں، بہت کم وطن آتے ہیں، ۱۹۹۹ء یا ۲۰۰۰ء میں ایک بار قصبہ آئے تو اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل سوسائٹی کے حوالے سے راقم نے آپ سے ملاقات کی تھی۔

دیگر اعلی عصری تعلیم یافتہ افراد

یہ وہ حضرات ہیں جو سماجی و ادبی سطح پر معروف ہیں، اور قصبہ واطراف میں جنکی ایک

شناخت ہے، ورنہ اعلی عصری تعلیم یافتہ افراد کی فہرست بہت طویل ہے، اس وقت گریجویشن کی ڈگری رکھنے والوں کی بڑی تعداد ہے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق قصبہ واطراف میں گریجویشن کی ڈگری رکھنے والوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔

ان میں ایک بڑی تعداد تدریس سے وابستہ ہے، خاصے افراد ہائی اسکولوں میں اردو و فارسی کے ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر رہے ہیں، اس کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی برسر روزگار ہیں۔

گذشتہ سطور میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ جن حضرات نے طب (میڈیکل) اور انجینئرنگ وغیرہ کی اعلی ڈگریاں حاصل کی ہیں، ان کے نام اس طرح ہیں:

ایم بی بی ایس (M.B.B.S) کرنے والوں میں ڈاکٹر آصف اقبال (ابن نیاز احمد) ڈاکٹر عمران احمد، ڈاکٹر گلفام احمد (صاحبزادگان ریاض احمد علامہ) بی ڈی ایس (B.D.S) کرنے والوں میں ڈاکٹر جلیس اختر و ڈاکٹر عدیل اختر (صاحبزادگان نبیل اختر عرشی)، بی یو ایم ایس (B.U.M.S) کرنے والوں میں ڈاکٹر عتیق احمد بن حافظ بشیر صاحب طوفانپور، ڈاکٹر افروز عالم، ڈاکٹر عاکف مدنی، ڈاکٹر ثاقب مدنی (صاحبزادگان محمد شفیع الرحمٰن مدنی) اور ڈاکٹر تحسین رضا بن رضا احمد طوفانپور شامل ہیں۔

انجینئرنگ (B.E) کرنے والوں میں معروف احمد چنو، رضوان احمد راجو ابن جمیل اخترؒ طوفانپور، صلاح الدین علی احمد بن حبیب احمد آسو، محمد علی بن محمد موسی (مینجر نینوکار) آفتاب عالم بن صدر عالمؒ، حسام احمد بن ریاض احمد (میکینیکل) رمیض احمد اشعر بن محمد کونین (میکینیکل) کامران احمد بن حبیب احمد (M.Tec)، ثاقب علی بن شعیب احمد طوفانپور، اور ڈپلوما انجینئرنگ کرنے والوں میں شاہد علی (الیکٹریکل، علی گڑھ) اعجاز احمد چاند، افتخار احمد آسو، محمد اعظم بن حبیب احمد طوفانپور، محمد ولی الزماں بن حاجی قمر الزماں طوفانپور، انور سجاد اور ثاقب احمد شرقی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ وہ نام ہیں جو مجھے آسانی سے معلوم ہوسکے، یہ تمام ناموں کی فہرست نہیں ہے، ممکن

ہے ان شعبوں سے متعلق اور بھی افراد ہوں۔

اس موقعہ پر مجھے چند نام اور بھی یاد آرہے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، ان میں ایک ریاض احمد علامہ ہیں جنہوں نے علی گڑھ سے تعلیم مکمل کی، اور بینک میں ملازم ہوئے، آپ نے اپنے تمام بچوں کو اعلی عصری تعلیم دلائی، دوسرے حبیب احمد آسو بابو ہیں جو قصبہ میں زیادہ معروف نہیں ہیں، پٹنہ میں رہتے ہیں، انہوں نے وکالت (B.L) کی ڈگری حاصل کی، اور ڈیفنس اکاؤنٹ میں ملازم ہوئے، ان کے بھی تمام بچے اعلی عصری تعلیم سے بہرور ہوئے، جناب بدرالدین صاحب کینرا بینک کے منیجر ہوئے، آپ کے ایک صاحبزادے بھی بینک میں ہیں، اور جناب منت اللہ صاحب پولیس میں آئی سی ایس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، آپ بہار کے سابق وزیر اعلی لالو پرساد کے علاوہ کئی وزراء کی سکوریٹی گارڈ میں شامل رہے، اور اس طرح اپنے قصبہ کا نام روشن کرتے رہے۔

یہ حضرات بھی قابل ذکر افراد میں شامل ہیں، ان کے علاوہ اور بھی افراد اس فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں، مگر صفحات کی تنگ دامانی کے پیش نظر یہی کہنا پڑے گا ع

ورق تمام ہوا اور مدح ابھی باقی ہے

علمی وادبی شخصیات

انصار الحق کمپونڈر برجستہ

قصبہ کے معمر ترین افراد میں ایک نام جناب انصار الحق کمپونڈر صاحب کا بھی ہے، آپ اپنے دور کے معروف لوگوں میں سے ہیں، جوانی میں مشاعروں میں خوب شریک ہوتے تھے، عموماً اکبر الہ آبادی کا کلام پڑھتے، کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے، اپنی مادری زبان میں بھی شعر کہنے پر قدرت تھی، اب عمر کی اس منزل میں پہونچ چکے ہیں کہ شعور اور یادداشت ختم سی ہو رہی ہے۔

راقم نے گاؤں کی تاریخ معلوم کرنے کے لئے جن پرانی شخصیات سے ملنے کا پروگرام بنایا ان میں ایک نام آپ کا بھی تھا، میں اس سلسلہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، امید تھی کہ آپ سے بہت سی معلومات مل سکے گی، لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو اندازہ ہوا کہ اب یادداشت ساتھ نہیں دے رہی ہے، ماضی کے حوالہ سے ہر سوال پر آپ مسماۃ حسن بانو کی دینداری اور عبدالحق صاحب کی شان وشوکت کو ضرور بیان کرتے، جس سے واضح ہو رہا تھا کہ آپ ان دونوں شخصیات سے بہت متاثر رہے ہیں، بطور خاص مسماۃ حسن بانو کی تعریف میں آپ رطب اللسان نظر آئے۔

۲۱-۱۹۲۲ء میں آپ کی پیدائش ہوئی، اس دور کے مڈل پاس ہیں، اسی تعلیم پر کمپونڈری کی ملازمت ملی، آپ نے مختلف اسپتالوں میں خدمت انجام دی، سماجی کاموں میں پوری عمر خوب دلچسپی لیتے رہے، اردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے، آپ کے اشعار کئی بیاضوں پر مشتمل تھے، مگر اب کچھ بھی محفوظ نہیں ہے، یہاں کی مادری زبان میں بھی آپ نے بہت سے اشعار کہے تھے، مگر آپ کی زبان سے کچھ بھی سننے کو نہیں مل سکے، اس لئے صحت کے ساتھ آپ کے حوالہ سے نمونہ کلام پیش کرنا مشکل ہے، گاؤں کے مختلف افراد کی زبانی آپ کے جو اشعار سننے

کو ملے انہیں شامل تحریر کرتے ہیں:

پکا کھا میں کوئی ذلت نہیں ہے
محبت نہیں تو مسرت نہیں ہے
پڑی سر پہ اتنی جوتی کہ ہوئی صاف چندیا
حجامت کی ان کو ضرورت نہیں ہے

مولانا اسلم صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبدالحق صاحب نے گائے خریدی، جو بڑی فربہ تھی، اور خاص نسل کی تھی، اس نے بچہ دیا، اسی موقع پر برجستہ یہ شعر کہا:

رمضان میں گائے بیانی ہے
نہ بلوئی ہے نہ اچھمانی ہے

آپ کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، گلشن ادب کے نام جو لائبریری قائم ہوئی تھی، اس کے بانیوں میں آپ بھی شامل تھے، آپ بتاتے ہیں کہ ہم لوگوں نے گلشن ادب کے نام سے ۴۵-۱۹۴۰ء کے دوران ایک لائبریری قائم کی، جو بعد میں شفیع اردو لائبریری کے نام سے موسوم ہوئی، یہ لائبریری پہلے حاجی منیر صاحب کے دروازہ پر تھی، بعد میں مسماۃ حسن بانو کے یہاں منتقل ہوئی۔

آپ کا مدرسہ رحمانیہ سے بھی تعلق رہا ہے، اس کی مجلس منتظمہ کے رکن رہے، اور شاید ایک یا دو میعاد نائب سکریٹری بھی رہے ہیں۔

نیاز احمد نیاز

جناب نیاز احمد صاحب ایک تعلیم یافتہ اور صاحب ثروت خاندان کے چشم و چراغ ہیں، والد محترم کا نام محمد عقیل ہے، جنہوں نے گویا علاقہ میں عصری تعلیم کی شمع روشن کی، اور والدہ ام الفاطمہ تھیں جو مولانا نورالہدیٰ نور بلملی کی ہمشیرہ تھیں، اور جنہوں نے قصبہ میں عورتوں کی تعلیم وثقافت کی طرف پہل کرتے ہوئے ایک اچھی مثال قائم کی۔

مدرسہ رحمانیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں مڈل پاس کیا، اسی سال

محمد شفیع صاحبؒ انتخاب جیت کر وزیر بنے، چنانچہ آپ اپنے چچا محترم کے ساتھ پٹنہ گئے اور وہیں پٹنہ ہائی اسکول سے دسویں پاس کیا، ۵۵ء میں شفیع صاحب کا انتقال ہوگیا، لہذا آپ پٹنہ سے دربھنگہ آگئے اور یہاں مسلم ہائی اسکول سے ۱۹۵۶ء میں فرسٹ ڈویزن سے میٹرک پاس کیا، اس کے بعد سی ایم کالج سے بی ایس سی کیا، بعض وجوہات کی بناء پر آپ کا تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا، چنانچہ آپ نے PWD کے World Bank Project میں asstt Researct کی ملازمت کی، اسی درمیان ۱۹۷۱ء میں فرسٹ ڈویزن سے ایم اے (ریاضی) پاس کیا۔

۱۹۷۴ء میں BPSC کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور Sub Deputy Collector ہوئے، پہلی پوسٹنگ ارریہ (پورنیہ) میں بحیثیت سی او ہوئی، اس کے بعد ٹھاکر گنج، دربھنگہ، آرہ، سیتامڑھی، موتیہاری اور دمکا وغیرہ میں بی، ڈی او، سے ایس ڈی ایم اور اے ڈی ایم کے پوسٹ پر فائز رہے، دوران ملازمت پٹنہ میں وزیر صحت محمد آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے بھی آپ نے کام کیا۔

اس طرح ۳۷ برسوں تک ملازت کی، اس دوران اپنی نیک نیتی اور شرافت کی وجہ سے ہر جگہ نیک نام رہے، ۱۹۹۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ملی وقومی خدمت کا جذبہ آپ کو وراثت میں ملی، اعلیٰ تعلیم مختلف علاقوں میں انتظامی عہدوں پر فائز رہنے، اپنی افتادطبع وبلندی فکر نیز اپنے علاقہ کی زبوں حالی و تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے ہمیشہ ملی اصلاح اور تعلیمی بیداری کے لئے کوشاں رہے، زبان ہوشمند کے ساتھ دل دردمند اور قلب ارجمند کی دولت بے بہا بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشی ہے، چنانچہ معاشرہ کی اصلاح اور مسلمانوں کے تعلیمی ترقی کے لئے ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں، اور اس طرح کی کوششوں میں شریک رہتے ہیں۔

دوران ملازمت ٹھاکر گنج میں وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے ایک کالج کا قیام عمل میں آیا، جس میں نہ صرف آپ شریک رہے بلکہ فعال کردار ادا کیا، یہ

کالج محمد حسین آزاد کے نام سے قائم ہے۔

آپ کی ملی دردمندی کی ایک مثال ’اصلاح معاشرہ کمیٹی‘ کا قیام ہے، جس کے آپ روح رواں تھے، یکہتہ وململ اور مضافات کے مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے ایک جامع منصوبہ بنایا گیا، مارچ ۱۹۹۲ء میں اس کی پہلی کانفرنس ہوئی جس میں اس کا لائحہ عمل طے ہوا، اس تحریک کے جنرل سکریٹری کے لئے جس مرد مجاہد کے نام قرعہ فال نکلا وہ یہی نیاز احمد کی ذات گرامی تھی، یہ تحریک اپنے ابتدائی دور میں ہی دم توڑ گئی، البتہ اس کے بعض اچھے اثرات بھی سامنے آئے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جب قصبہ واپس آئے اور یہاں رہنے لگے تو قصبہ کے ذی ہوش افراد نے گاؤں کی سربراہی آپ کے سپرد کی، بایں طور کہ آپ کو مکھیا منتخب کیا اور اس طرح آپ نے پانچ سال تک گاؤں کی سربراہی کی۔

راقم الحروف نے ۲۰۰۰ء میں مدارس کے طلبہ کی ایک تنظیم بنائی، اس موقعہ پر آپ سے بار بار ملنے کا موقعہ ملا، آپ نے کھل کر ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کی، اور ایسا لگا کہ یہ آپ کی دل کی آواز ہے، دو تین سالوں تک ہماری تنظیم سرگرم رہی، ۲۰۰۲ء میں جب ہم نے اپنی تنظیم کی طرف سے ایک میگزین شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو بہت خوش ہوئے، پھر اس کے رسم اجراء کے موقع پر آپ نے راقم الحروف کے بارے میں جو کچھ کہا وہ ہمیشہ یاد رہے گا، آپ نے کہا کہ ”مولانا آزاد نے اٹھارہ برس کی عمر میں ایڈیٹری کی، ہمارے یہاں بھی ایسے نوجوان ہیں جو اس عمر میں ایڈیٹر بن کر اپنا اور اپنے علاقے کا نام روشن کر رہے ہیں“

اس دوران آپ کے ساتھ تعلیم اور سماجی اصلاح سے متعلق بہت سے خاکوں پر باتیں ہوئیں، آئندہ کے لئے منصوبے بنائے گئے، لیکن بعض حالات کی وجہ سے یہ منصوبے کاغذ سے زمین پر نہ آسکے۔

ان دنوں آپ دربھنگہ میں قیام پذیر ہیں، اور یہاں کی مختلف ملی و تعلیمی تنظیموں سے وابستہ ہو کر مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کے لئے کوشاں ہیں، آپ تعمیر ملت ٹرسٹ کے رکن، صغری

گرلس ہائی اسکول اور مسلم انجمن تعلیم کے سکریٹری ہیں، مسلم انجمن تعلیم کے ذریعہ ملت کالج کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے سرگرم عمل ہیں، دربھنگہ کے سرگرم ملی رہنما ڈاکٹر عبدالوہاب، ڈاکٹر اجیر الحق، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر ضیاء الحق، نور الہدی نور، اور ڈاکٹر عزیز سلفی وغیرہ کے ساتھ آپ یہاں کی سرگرمیوں میں شریک ہیں، ان کے علاوہ آپ شفیع مسلم ہائی اسکول دربھنگہ اور مدرسہ رحمانیہ یکہتہ کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی رہے ہیں، اس طرح آپ کا فیض ملت کو پہونچ رہا ہے۔

لیکن شاید اسے المیہ ہی کہا جائے گا کہ مادر وطن ’یکہتہ‘ کو اپنے ہونہار سپوت سے وہ نہیں مل سکا جو اسے ملنا چاہئے، آپ کی بلندی فکر، دور بینی اور ملی شعور وآگہی مسلم ہے، مسلم مسائل کے تئیں ہمدردانہ جذبات آپ کی باتوں سے جھلکتے نظر آتے ہیں، مگر یہ جذبات ٹھوس تاریخ کا حصہ کیوں نہیں بن پاتے، قصبہ سے اٹھنے والے بادل ملک کے مختلف حصوں کو سیراب کر رہے ہیں، مگر خود یہاں کی زمین مدت سے بوند بوند کو ترس رہی ہے، فروغ تعلیم کی کوششیں یہاں کیوں نہیں ہوتیں؟ اور اگر ہوتی بھی ہیں تو برگ وبار کیوں نہیں لاتیں، ان موضوعات پر کیوں غور نہیں ہوتا! یقیناً ان سوالات کی تہوں میں شدید کرب والم پوشیدہ ہوگا، اور ان کے اسباب کو متعین کرنا اور جواب تلاش کرنا مشکل عمل ہوگا لیکن اب یہ عمل بھی شروع ہونا چاہیے!!

آپ کی دوسری حیثیت شاعر وادیب کی ہے، یہ ذوق بھی آپ کو ورثہ میں ملا ہے، والد محترم اچھے شاعر تھے، ان کا تذکرہ گزر چکا ہے، اور نانیہال ململ جہاں صدیق نیرنگ، عبدالحفیظ حافظ اور مطیع الرحمٰن احقر جیسے اصحاب ذوق شعراء گزرے ہیں، وہاں کے ادبی ماحول میں عمر عزیز کے مختلف مراحل گزرے، ان سب کے اثرات لازمی تھے، چنانچہ آپ کے اندر کا شاعر جاگ اٹھا، اور جب موقع ملا اور طبیعت میں نشاط رہا تو غزلیں ڈھلنے لگیں، پہلے اویس احمد دوراں سے اصلاح لیتے تھے، اب پروفیسر عبدالمنان طرزی اور پروفیسر شاکر خلیق سے اصلاح لیتے ہیں، یہ تینوں بلند پایہ شاعر ہیں اور واقعی استادی کا مقام رکھتے ہیں۔

بحیثیت شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب نے آپ کا تعارف بڑے بلیغ انداز

میں کرایا ہے، ہم انہی کے الفاظ مستعار لیتے ہیں:

ایک فرد باغ و بہار، ایک طبع محبت شعار، ملک وملت کا خادم جانثار، خلوت میں لالہ زار، جلوت میں مشکبار، بارگاہ ایزدی ہوتو دیدہ بار، رزم گاہ حیات ہوتو تبسم فشار، ایک نیاز کی نیاز مندیاں، گویا ایک پیکر کی خوبیاں ہزار، نام نیاز احمد تخلص نیاز۔ (رفتگان وقائماں ص:۳۰۴)

ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے ادبی رسالہ تمثیل نو میں 'اس شمارہ کے مخصوص شاعر' کے عنوان سے آپ کا تعارف کرایا ہے، ڈاکٹر صاحب شعروادب کی دنیا میں ایک شناخت رکھتے ہیں، انہوں نے آپ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ سند کا درجہ رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

شاعر اپنے طور پر جو کچھ محسوس کرتا ہے یا جو کچھ اپنے سماج اور معاشرہ سے حاصل کرتا ہے اسے وہ اپنے اشعار کی شکل میں لوٹاتا ہے، نیاز احمد کے اشعار ان کی رکھتی ہوئی رگوں پر انگلیاں رکھتے ہیں، جو سماج کی کمزوریاں ہیں، انہوں نے ان حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو پردہ خفا میں تھے، نیاز کا طرز اظہار بیباک ہے، لیکن ان میں کہیں تیزی، ترشی یا تیکھا پن نہیں ہے، نیاز نے لفظوں کے انتخاب میں بہت ہی سبک انداز اپنایا ہے، یہ انداز ہی دراصل ان کی پہچان ہے۔ (تمثیل نو دربھنگہ، جولائی ۲۰۰۲ء)

ایک غزل جو پہلے 'تمثیل نو' میں اور پھر 'نشان منزل' میں شائع ہوئی، اس طرح ہے:

جو ہم اپنے سانچے میں ڈھل جائیں گے
تو دل والے کتنے دہل جائیں گے

عقابوں کے بازو ہیں شاہیں کے پر
جلیں ایک تو سو نکل جائیں گے

نشیمن میں ہم قید رہتے نہیں
اڑیں گے، گریں گے، سنبھل جائیں گے

نہ ساحل کی پروا نہ طوفان کا غم
ہیں فانی مگر لم یزل جائیں گے

کسی زور باطل سے ممکن نہیں
ہمارے ارادے بدل جائیں گے

نیاؔز اس طرح مت ہمیں دیکھئے
کیا آپ سب کو نگل جائیں گے

ان کی ایک اور غزل جو نشان منزل کے دوسرے شمارے کی زینت بنی، جس میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے، ملاحظہ کیجئے:

ایسا بھی تو کچھ ہوتا طوفان اٹھا ہوتا
اشعار کی بارش میں گھر بار بہا ہوتا

ہوتے جو اگر شاعر غالب کی طرح ہوتے
رہنے کو نہ گھر ہوتا، دربار لگا ہوتا

سب چاہنے والے ہیں، سب جان چھڑکتے ہیں
اے کاش! مگر کوئی پابند وفا ہوتا

دستور محبت کا وہ نقش بنا لیتے
جو دل کو سکوں دیتا آنکھوں میں سجا ہوتا

احوال رساں تو ہے اے نغمہ دل تو بھی
خوشبو کی طرح لیکن بر دوش صبا ہوتا

بس شکر کی نیت سے نظریں بھی جھکا لیتے
اس طرح بھی احسان کا کچھ حق تو ادا ہوتا

پھر زلف کے سائے میں آرام سے سو جاتے
خوشبو سے اڑی ہوتی موباف کھلا ہوتا

جس کی بھی نظر پڑتی وہ خود بھی نظر آتا
ہر شعر ترا نیازی آئینہ بنا ہوتا

ایک اور غزل کے چند اشعار:

محبت میں حال جنوں دیکھ لیں گے
تڑپ دیکھ لیں گے، سکوں دیکھ لیں گے

کسی صبح پھولوں پہ شبنم کے قطرے
کسی شام سوز دروں دیکھ لیں گے

ذرا صبر نیاز برسنے دو بادل
تو پھر آسماں نیلگوں دیکھ لیں گے

آپ کے شعری ذوق پر پروفیسر عبدالمنان طرزی اور ڈاکٹر امام اعظم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعد کچھ کہنے کی جسارت میرے لئے مشکل ہے، آپ کی غزلیں 'زبان وادب' پٹنہ اور 'تمثیل نو' دربھنگہ جیسے معروف ادبی رسائل میں جگہ پا چکی ہیں۔

مولانا اسلم قاسمی آسؔی

حافظ ادریس صاحب کے فرزند ارجمند مولانا اسلم قاسمی مدرسہ رحمانیہ کے ابنائے قدیم میں سے ہیں، مدرسہ رحمانیہ میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور گئے، وہاں شرح جامی تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، چار سالوں تک اکتساب فیض کرتے ہوئے ۶۸۔۶۷ء میں سند فراغت حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مدرسہ رحمانیہ میں استاد بنے، یہاں آپ کو تفسیر، ہدایہ، عربی ادب، کافیہ جیسی کتابیں پڑھانے کو ملیں، پانچ سال تک تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد بمبئی میں آٹھ سالوں تک تدریس اور امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، دو سال ویشالی کے مدرسہ اسلامیہ میں رہے، اس کے بعد ۸۳ء میں ڈالٹن گنج پلامو میں بہار بورڈ کے مدرسہ میں بحال ہوئے، اور اب تک وہیں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس وقت آپ انچارج ہیڈ مدرس ہیں۔

آپ کی خدمات کی دوسری جہت آپ کی ادبی تخلیقات ہے، دارالعلوم دیوبند میں شعروشاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی، پہلے آپ دوسرے شعراء کے کلام پڑھتے تھے، شاعری کا آغاز ڈالٹن گنج کے زمانۂ قیام میں ہوا، آپ کے اندر کا شاعر اس وقت جاگا جب آپ کو علامہ نادم بلخی (پروفیسر جی ایل اے کالج ڈالٹن گنج) کی صحبت میسر آئی، یہی آپ کے فن شاعری کے استاد ہیں، آپ جن اصناف میں مشق سخن کرتے ہیں ان میں غزل کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، دعا وغیرہ شامل ہیں، ڈالٹن گنج میں ماہانہ طرحی مشاعرہ ہوتا ہے، آپ اس میں شریک ہوتے ہیں، آپ کی بعض غزلیں اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوئی ہیں، اور جھارکھنڈ کے اسپیکر اندر سنگھ نامدھاری کی طرف سے ایک ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

ڈالٹن گنج کے ایک طرحی مشاعرہ کا طرح تھا "آپ کے بھیجے ہوئے تحفے پرانے ہوگئے" اس بحر میں آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بزم گیتی کے لئے موسم سہانے ہوگئے　　تیرگی جاتی رہی روشن زمانہ ہوگئے
جب ہوس حد سے بڑھا اور پھر بلائے ناگہاں　　برکتیں اٹھتی گئیں خالی خزانے ہوگئے
کون رستے پے چل پڑا دور جدید　　آج عزت والے ہی سب کے نشانے ہوگئے
نغمگی سے اب فضاؤں کو معطر کیجئے　　ساز دل کو چھیڑئے، اب کیوں بہانے ہوگئے
آیئے مل کر کریں قائم ایک انجمن　　پرفتن کے دوریوں بھی اب پرانے ہوگئے
دیجئے تحفہ نیا دور تجدد کو جناب　　آپ کے بخشے ہوئے تحفے پرانے ہوگئے

آسیؔ اس حسن جہاں میں گل فشانی کیا کرے　　اس جہاں عشق کے الٹے فسانے ہوگئے

یکجہتی کے عنوان سے آپ نے ایک نظم کہی ہے، جو بہت مشہور ہوئی، آپ نے اپنے کلام کا مجموعہ 'گلدستۂ آسیؔ' کے نام سے مرتب کیا ہے، ابھی اس کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔

شبیر احمد زخمیؔ

آپ ایک انقلابی فکر کے حامل تھے، ملت کی پسماندگی کا بڑا ادراک تھا، جس کے نتیجہ میں ملت کی ترقی کی فکر لے کر اٹھے، اور جو کچھ ممکن ہو سکا کر گزرے، تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ نے 'چلڈرن پبلک اسکول' کے نام سے ایک انگلش میڈیم اسکول قائم کیا اور کئی سال کامیابی سے چلاتے رہے، جس زمانہ میں آپ نے اسکول قائم کیا اس وقت عصری تعلیم کی صدا لگانا واقعی بڑی بات تھی، آپ کے ذہن نے سوچا کہ ملت کی ترقی صرف تعلیم سے ہوسکتی ہیں، چنانچہ آپ نے اس سمت اپنی کوشش اور محنت صرف کی، یہ الگ بات ہے کہ آپ کی کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی، اور یہ اسکول چند سالوں بعد بند ہوگیا۔

آپ نے ملت کمیٹی کے نام ایک تنظیم بنائی، اس کے قیام کا پس منظر دراصل گاؤں کے خاص حالات تھے، لیکن اس کمیٹی کے بعض مثبت فائدے بھی ہوئے، گاؤں میں تعلیم کی طرف توجہ عام ہوئی، اس کے تحت متعدد مکاتب قائم ہوئے، اس کمیٹی کے سرگرم کارکنان میں زخمی صاحب کے علاوہ طاہر حسن، سمیع انور، منت لٹیہارا اور شاہنواز وغیرہ شامل تھے، ملت کمیٹی کے حوالہ سے آپ کی ایک نظم خوب مشہور ہوئی، جس کے اشعار عرصہ تک لوگوں کی زبان پر رہے۔

آپ کو شاعری کا ذوق ملا ہے، اردو، میتھلی کے ساتھ اپنی مادری زبان میں بھی شاعری کرتے ہیں، شاعری کا ذوق کیسے پیدا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں بتاتے ہیں کہ جب وہ مدھوبنی جیل میں تھے وہیں عبدالجبار لطفی نام کے ایک شاعر سے ملاقات ہوئی، ان کی صحبت نے آپ کے ذوق کو نکھارا، لطفی صاحب کی وجہ سے جیل میں مشاعرہ ہوتا تھا، اس کے علاوہ جب آپ پوسا ٹیچر ٹریننگ کالج میں تھے، تو وہاں مسلمان کی بڑی تعداد تھی، وہاں بھی طرحی مشاعرے ہوتے تھے، آپ کو یہاں کی صحبت بھی حاصل رہی، ان سب کے ساتھ سماجی

نا انصافی نے بھی آپ کے جذبات کو مہمیز کیا۔

آپ نے بہت سی غزلیں کہیں، مگر ان کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کبھی نہ رہا، میں نے ان کی یادداشت سے کچھ نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن یہاں بھی ناکامی ہاتھ لگی، البتہ ایک دعائیہ نظم جو پورے قصبہ میں مشہور ہے اور آج بھی اکثر چھوٹے بچے اس کو پڑھتے ہیں، اس کے چند اشعار درج کرتا ہوں:

لو سلام لو سلام اے میرے محسن مہمان
آپ جو آئے یہاں آپ کا ہم پر احسان
جستجو تھی آپ کی اور تمنا دل میں تھی
آپ جو آئے یہاں کھل گئی دل کی کلی
میں ہوں کل کا ڈاکٹر اور میں انجینئر
راکٹوں کی کھڑکیوں سے کہوں گا شب بخیر

میتھلی شاعری کے حوالہ سے یہ بات بہت اہم ہے کہ آپ کی ایک میتھلی نظم انٹرمیڈیٹ درجہ کی نصابی کتاب ''اکچھر چیتنا'' میں شامل ہے، جس کا ایک شعر اس طرح ہے:

ڈھول پیٹ کے باج رہل چھی آر بجا کے تاسا
متھلا دیس نباسی ہم چھی، متھلی ہمر بھاسا

پٹنہ کے آل انڈیا میتھلی کوی سمیلن میں آپ نے شرکت کی اور میتھلی میں نظم پڑھی، جو اس کی میگزین ''اسماریکا'' میں شائع ہوئی ہے، اس سمیلن کا افتتاح اس وقت کے ایجوکیشن منسٹر وودیا کر کوی صاحب نے کی تھی، انہوں نے آپ کی نظم کی خاص طور پر تعریف کی تھی۔

ایک زمانہ میں سیاست میں بھی سرگرم رہے، کانگریس اور کمیونسٹ دونوں پارٹیوں سے تعلق رہا، چلڈرن پبلک اسکول کے قیام کے زمانہ میں آپ نے بچوں کے لئے ڈرامے لکھے، جن میں 'ایک نیم حکیم خطرہ جان' خاص طور پر لوگوں کو یاد ہوگا جو عبدالحق صاحب کے دروازہ پر اسٹیج ہوا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اب جو فرصت ملی تو دل کے جذبات نے پھر کروٹ

لی، اپنے گھر کے بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا، اس احساس کے ساتھ ایک بار پھر ہمت کر کے ۲۰۰۹ء میں اسکول شروع کیا، اب یہ اسکول 'اسلامک چلڈرین پبلک اسکول' کے نام سے جاری ہے، جس میں عصری موضوعات کے ساتھ دینیات بھی شامل ہے۔

آپ کے بارے میں مجھے متضاد تاثرات سننے کو ملے، مگر میرے دل میں اس لحاظ سے آپ کی بڑی قدر رہے کہ آپ نے قصبہ کے عام مسلمانوں کو ہر طرح کی پسماندگی سے نکالنے کے لئے پوری گہرائی سے سوچا اور پھر ہمت بھر تدبیر کی، آپ کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں، اس کے اسباب ہوں گے، مگر سماج کی تبدیلی کے لئے سوچنا اور اقدام کرنا بڑے دل گردہ کا کام ہے، اس لحاظ سے آپ ملت کے محسن تھے، ایسی شخصیات کی قدر کی جانی چاہیے تھی، اگر حالات آپ کے موافق ہوتے اور دوسرے افراد دست و بازو بنتے تو ہمارا معاشرہ تعلیم کے لحاظ سے مزید بلندیوں کو چھوتا۔

آپ حاجی عبدالرؤفؒ کے چشم و چراغ ہیں، ابتدائی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کی، اس کے بعد رحمانیہ سوپول سے فوقانیہ اور شمس الہدی سے عالم اور فاضل کی ڈگری لی، پوسا ٹریننگ کالج میں ٹریننگ کی، اگست ۷۶ء کو ملازمت ملی اور ۲۰۰۶ء میں سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر سلطان احمد

جناب عبدالغفار بابو کے چشم و چراغ سلطان احمد صاحب کی پیدائش ۲۵؍ جولائی ۱۹۴۴ء میں ہوئی، پھلپر اس ہائی اسکول سے میٹرک، ملت کالج سے انٹر، سی ایم کالج دربھنگہ سے بی اے، اور ایم اے اور بہار یونیورسیٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۸۱ء میں ایم ایل ایس ایم کالج دربھنگہ میں بحیثیت لکچرر ملازمت شروع کی، اس دوران پی ایچ ڈی جاری رہی، مشہور علمی شخصیت، ادیب و ناقد اور پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف جناب ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی مرحوم کی نگرانی میں آپ نے ''میر انیس بحیثیت رباعی نگار'' کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، ۹۱ء میں آپ کی پی ایچ ڈی مکمل ہوئی۔

آپ مستقل اسی کالج میں اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتے ہوئے ۲۰۰۴ء میں

ملازمت سے سبکدوش ہوئے،اس درمیان لکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر بھی ہوئے،آپ کی نگرانی میں اب تک چارلوگوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کرڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔

آپ ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں،تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی رہی ہے،زبان وادب سے متعلق مختلف موضوعات پردرجن بھرمقالات ومضامین سپردقلم کر چکے ہیں،اسی طرح آپ نے متعدد ادبی سیمیناروں میں شرکت کی اور مقالات پڑھے،آپ کی کتابوں اور اہم مقالات کی کچھ تفصیل اس طرح ہے:

کتابیں:

۱۔میرانیس بحیثیت رباعی نگار — صفحات ۱۹۰،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،نئی دہلی،۱۹۹۵ء

۲۔فراق گورکھپوری کی رباعی نگاری — صفحات ۱۶۵،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،نئی دہلی،۱۹۹۹

اہم مقالات:

۱۔دہلی اور لکھنؤ دبستان شاعری کا موازنہ — مطبوع: زبان وادب بنگال اردو اکیڈمی

۲۔ریختی کا تنقیدی مطالعہ — مطبوع: زبان وادب بنگال اردو اکیڈمی

۳۔شادعظیم آبادی کی رباعی نگاری — مطبوع: فروغ ادب اڑیسہ اردو اکیڈمی

۴۔اردو مرثیہ برصغیر میں — مطبوع: فروغ ادب اڑیسہ اردو اکیڈمی

۵۔آزادی کے بعد ہندوستان کی اردو شاعری — مطبوع: تعمیر،اترپردیش اردو اکیڈمی

۶۔عصری ادب کا شعور

آپ کی بعض تحریریں مختلف ادبی رسائل کے علاوہ قومی تنظیم،سنگم،راشٹریہ سہارا اور صدائے عام وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں۔

آپ خاموش طبیعت کے مالک اور علم دوست آدمی ہیں،گاؤں کے مسائل سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے ہیں،البتہ علاقہ کی تعلیمی پسماندگی اور دیگر ناخوش حالات سے رنجیدہ رہتے ہیں،مگر یہ باتیں آپ کی مجلس کا عنوان نہیں بن پاتیں،علم وادب کے فروغ کا احساس رکھتے ہیں،اور ایسے لوگوں کی خاموش حوصلہ افزائی کرتے ہیں،راقم کو ایک عرصہ سے نیاز حاصل ہے،

مختلف موضوعات پر آپ سے گفتگو کرنے کا موقع ملا،میں نے آپ کے دل میں ملت کا درد اور آنکھوں میں مسلمانوں کی ترقی کا خواب دیکھا ہے،خدا کرے آپ کی طرح ان تمام لوگوں کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جو ناامیدی میں امید کی قندیل کو روشن رکھتے ہیں اور جو ملت کے تمام مسائل کا حل تعلیم اور صرف تعلیم سمجھتے ہیں۔

عبدالمجید

عبدالمجید صاحب یکہتہ کے معروف شاعر جناب عبدالعزیز مضمحل کے لخت جگر ہیں،ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں اپنی خوبیاں چھپانے کا ہنر خوب آتا ہے،ان کی شرافت سے اکثر لوگ واقف ہیں،مگر کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں،خود میرے سامنے یہ راز اس وقت کھلا جب میں نے ان کے گھر میں رکھی کتابوں کے بنڈل کے بارے میں پوچھا۔

آپ ۱۲اپریل ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے،ابتدائی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں حاصل کی،اس کے بعد ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۹ء مدرسہ محمدیہ استھاواں میں پانچ سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے، بعد ازاں عالم اور فاضل کا امتحان پرائیویٹ سے دیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد تکنیکی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے،۱۹۸۱ء میں غالب اکیڈمی دہلی سے اردو ٹائپ اور اردو شارٹ ہینڈ کا کورس کیا اور امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے۔

۱۷/جولائی ۱۹۸۲ء میں بہار اردو اکیڈمی پٹنہ میں انسٹرکٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی،۲۲/جون ۱۹۹۳ء کو بہار قانون ساز اسمبلی پٹنہ میں اردو ٹائپسٹ کی حیثیت سے تقرر ہوا، جس سے ۳۰/اپریل ۲۰۱۰ء کو سبکدوش ہوئے،اس دوران ۲۰۰۰ء سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول لیگ نئی دہلی کے اردو ٹائپ رائٹنگ نصاب کمیٹی کے رکن رہے،اور اس انسٹی ٹیوٹ کے شائع نصابی کتابوں کی تالیف میں تعاون کیا۔

آپ کی کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔آسان اردو ٹائپ رائٹنگ — اشاعت اول:۱۹۸۳ء،دوم:اکتوبر ۱۹۹۴ء

۲۔آسان اردو شارٹ ہینڈ — اشاعت دسمبر ۱۹۸۵ء

۳۔آسان اردو ہندی لغت　　اشاعت: ۲۰۰۹ء

ان کے علاوہ آسان کتاب الحج، آؤ اردو سیکھیں وغیرہ کتابیں زیر طبع ہیں۔

آپ کی کتاب اردو شارٹ ہینڈ پر بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے انعام بھی ملا ہے۔

آپ کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز اوگانوی لکھتے ہیں:

بہار کے تکنیکی قلم کار گنتی کے چند ایک ہوں تو ہوں، مجھے معلوم نہیں، اگر ہیں تو ان بڑے قلم کاروں میں عبد المجید کا نام سب سے اوپر نہ سہی نیچے بھی نہیں، چونکہ اردو ٹائپ رائٹنگ اور اردو شارٹ ہینڈ ان دونوں کو بہار کی پہلی تخلیق کہی جاسکتی ہے، جسے عبد المجید صاحب نے لکھی، اور اس فن کو صوبہ بہار میں روشناس کرایا، آسان اردو ٹائپ رائٹنگ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی، ۲۱؍اکتوبر ۱۹۸۳ء بروز جمعہ غالب اکیڈمی بستی نظام الدین نئی دہلی میں جناب اے آر آر بھنجی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو اور جناب قاضی سجاد حسین سرپرست ہمدرد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ہاتھوں رسم اجرا ہوا، اور متفقہ طور پر ان دونوں حضرات نے اس بات کی نشاندہی کی کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے، اس سے نئی نسل یقیناً فیضیاب ہوگی، اور اس کی اہمیت ہر دور میں مانی جائے گی، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء میں پاکستان کے ایک طالب علم نے تکنیکی کتابوں پر تحقیق کیا، جس میں عبد المجید کی دوسری کتاب آسان اردو شارٹ ہینڈ کو معتبر جگہ دی، اور کئی ایک صفحات مختص کئے۔

(روزنامہ پندار، پٹنہ، ۲۴؍نومبر ۲۰۱۰ء)

مولانا محمد حسن ندوی

مولانا احمد حسین مظاہری کے فرزند، نوجوان فاضل، مفتی وقاضی اور متعدد کتابوں کے مصنف جناب مولانا محمد حسن ندوی (طوفانپور) نے ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ طوفانپور میں حاصل کی، یہیں حفظ قرآن کی تکمیل کی، فوقانیہ درجہ کی تعلیم مدرسہ رحمانیہ میں ہوئی، اس کے بعد

اعلیٰ تعلیم کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا جہاں عالمیت اور فضیلت (اختصاص فقہ) کی سند حاصل کی، اس طرح متعدد سال ندوہ کے علمی وادبی فضا میں رہنے اور اپنے دامن کو علم وفقہ کی دولت سے بھرنے کا موقع ملا، فقہ سے شغف وشوق نے المعہد العالی پٹنہ پہونچایا جہاں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ کی تربیت میں افتاء وقضاء کی تکمیل کا موقع ملا۔

جامعہ الرشاد اعظم گڑھ سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، یہاں آپ قضاء اور افتاء کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، گیارہ سال آپ نے یہاں خدمت انجام دی، گذشتہ سالوں سے دار العلوم ماٹلی والی گجرات میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

آپ تصنیف وتالیف کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں آپ کے قلم سے وجود میں آچکی ہیں، جن میں البلاغۃ القرآنیہ، اسلام میں دعاء کا نظام مع مسائل و احکام، روزمرہ کے مسائل، نقوش رمضان قابل ذکر ہیں، ان کتابوں پر مولانا نعمت اللہ اعظمی استاذ دار العلوم دیوبند، ڈاکٹر سلمان ندوی فرزند علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مجیب اللہ ندویؒ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا محمد قاسم مظفرپوری جیسے اہل علم واصحاب تحقیق کی تاثراتی تحریریں شامل ہیں، جن سے ان کتابوں کے استناد وافادیت کا پتہ چلتا ہے۔

سماجی وسیاسی شخصیات

انیس احمد

شفیع صاحب کے خاندان کے عظیم فرزند،آپ کے بھتیجے اور شاہ عقیل احمد مرحوم کے چشم وچراغ جناب انیس احمد صاحب علاقہ کی سیاسی سرگرمیوں کا جلی عنوان ہیں،آپ کا شمار علاقہ کے مشہور ومحبوب لیڈروں میں ہوتا ہے،پورے علاقہ میں چچا انیس کے نام سے جانے جاتے ہیں،پوری زندگی سیاست کے میدان میں سرگرم رہے،اور آج بھی جبکہ وہ اپنی زندگی کی ۷۵ بہاریں دیکھ چکے ہیں،قومی وملی خدمات میں مصروف ہیں۔

۱۹۳۸ء میں آپ نے ایک تعلیم یافتہ اور باشعور خانوادہ میں آنکھیں کھولیں،ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی،۱۹۵۰ء میں گاؤں کے اسکول سے مڈل پاس کیا،ہائی اسکول پھلپراس سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک،۵۸ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۶۲ء میں بہار یونیورسیٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

جس گھرانے میں آپ کی پرورش وپرداخت ہوئی اور جہاں عنفوان شباب کے مراحل کو طے کیا وہاں ایک طرف والد محترم جناب عقیل صاحب کی شخصیت تھی،تو دوسری طرف شفیع بیرسٹر صاحب جیسے قوم وملت کے بے لوث خادم،والد صاحب اگر تعلیم اور شرافت کے عنوان تھے تو بیرسٹر صاحب کی حیثیت چراغ راہ کی تھی،ان سب کے ساتھ گھر کی فارغ البالی اور قیادت کا سلسلہ،یہ وہ اسباب تھے جہاں آپ کو اپنے میدان کار کا انتخاب کرنا تھا،چنانچہ آپ نے اپنے اسلاف کی روش پر چلتے ہوئے قومی وملی خدمت کا انتخاب کیا،اور اس طرح نوجوانی سے ہی قومی وسیاسی میدان میں سرگرم ہوگئے۔

تعلیم کے فوراً بعد یعنی ۶۲ء میں آپ نے باضابطہ سیاست کے میدان میں قدم رکھا،اسی

سال سوتنتر پارٹی سے اپنے حلقہ لوکہا لوکہی کے لئے امیدوار بنے،راجہ گوپال اچاریہ نے یہ پارٹی بنائی تھی،اور بہار یونٹ کے ذمہ دار راجہ کمکھیا نارائن سنگھ تھے،آپ کی انتخابی مہم میں راجہ کمکھیا نرائن اور ان کی رانی یکہتہ آئے،یہ پہلا موقعہ تھا جب گاؤں کے افراد ہیلی کوپٹر کو اترتے دیکھتے،چنانچہ لوگوں کا ایک ازدحام امنڈ پڑا،کہ جہاں راجہ رانی کو پہلی بار قریب سے دیکھنے کا شوق تھا وہیں ہیلی کوپٹر کو دیکھنے کی تمنا بھی تھی،مگر سوئے اتفاق کہ بے قابو مجمع کو دیکھ ہیلی کوپٹر ہیلی پیڈ کے قریب آکر واپس دوبارہ محو پرواز ہوگیا،راجہ رانی کے آنے کا واقعہ آج بھی بوڑھے پرانے لوگوں کی زبانوں پر ہے۔

اس اسمبلی انتخاب میں آپ بہت کم ووٹوں سے شکست کھائے،اس کے بعد ۶۴-۶۵ء یہ پارٹی کانگریس میں ضم ہوگئی،اسی سال پنچایت کا الیکشن ہوا،اور آپ گاؤں کے مکھیا منتخب ہوئے،۶۴ء سے ۷۸ء تک آپ مکھیا رہے،اس طویل عرصہ میں آپ نے کیا کیا کام کئے،جب میں نے یہ سوال آپ کے سامنے رکھا تو آپ نے اس زمانہ کی بہت سی خدمات کا تذکرہ کیا،جس میں سڑکیں،ٹیوب ویل،اسکول کی عمارت وغیرہ شامل ہیں،آپ نے یہ بھی کہا کہ اس زمانہ میں آج کی طرح مکھیا کے اختیارات نہیں تھے،اور نہ سرکاری فنڈ ہوتا،ہاں بحیثیت مکھیا گاؤں والوں کی جو خدمت مجھ سے ممکن ہوئی میں نے کی،کبھی اس میں کوتاہی نہیں کی۔

سوتنتر پارٹی کے کانگریس میں ضم ہونے کے بعد آپ بھی کانگریس پارٹی سے متعلق ہوگئے،۷۵ء میں آپ ضلع کانگریس کے ممبر بنے،اور ۹۰ء تک اسی پارٹی سے وابستگی رہی،اس درمیان متعدد کونسلوں اور کمیٹیوں کے ممبر رہے،جس میں کانگریس کی مائناریٹی سیل کی ممبری (۱۹۷۵ء) اور ضلع کسان کانگریس کی صدارت (۱۹۸۰ء) قابل ذکر ہے،۱۹۹۰ء میں کانگریس سے مستعفی ہوکر جنتا دل میں شریک ہوئے اور پھر پارٹی کی تقسیم کے بعد راشٹریہ جنتا دل میں لالو پرسا دیادو کے ساتھ رہے،اس پارٹی سے تعلق ۲۰۱۰ء تک ہی رہا،اس درمیان بھی مختلف کمیٹیوں کے ممبر رہے،۲۰۰۰ء میں آپ ضلع پریشد کے انتخاب میں کامیاب ہوئے اور اس عہدہ پر پانچ سال تک فائز رہے۔

اس دوران آپ کئی مرتبہ اسمبلی انتخاب کے امیدوار بنے، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، زندگی بھر غیروں کے تعصب کے ساتھ اپنوں کے تلخ رویوں کا غم جھیلتے رہے، ممکن ہے اس کے کچھ اسباب ہوں، مگر میرے خیال میں یہ ہماری قومی بدقسمتی ہے، یہ ملی شعور کی کمی کی علامت ہے، معلوم نہیں کب انفرادی اور خودساختہ گھروندوں سے ہم نکلیں گے، ہمارا ملی شعور کب بیدار ہوگا، میری یادداشت بتاتی ہے کہ سن شعور کو پہونچنے کے بعد سب سے پہلے بحیثیت مسلم لیڈر راسی موصوف کا نام سنا، اور بڑے شوق سے ایک ریلی میں لوکہی گیا بھی، وہاں عبدالحی پیامی کا نام سنا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ آپ کے مدمقابل ہیں، اس کے بعد ثقہ لوگوں سے سنا کہ آپ کو ہرانے میں اکثر مسلمانوں کا دخل رہا ہے، بلکہ ایک صاحب کے بارے میں سنا کہ ان کے امیدوار بننے کا مقصد یہی تھا کہ فلاں ہار جائے، خدا معلوم مسلمانوں کی یہ ذہنیت کب ختم ہوگی !!

بہرحال قسمت آپ پر مہربان ہوئی اور تیرہویں اسمبلی الیکشن ۲۰۰۵ء میں آپ کامیاب ہوئے، یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تھی، مگر سوئے قسمت کہ بعض لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے اسمبلی تحلیل کردی گئی، دوبارہ انتخاب ہوا، لیکن اس بار معمولی ووٹوں سے ہار گئے، اور اس طرح خوشی بہت قریب آکر دور چلی گئی، کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ تیرہویں اسمبلی الیکشن کے کامیاب امیدواروں کو حکومت نے تسلیم کرلیا ہے، اور انہیں سابق ممبر اسمبلی (ایم ایل اے) کی سہولیات دی جائے گی، اس طرح ’سابق ایم ایل اے‘ آپ کے نام کا جزء تو بن گیا مگر وہ بات کہاں، ہاں تاریخ میں یہ بات ضرور لکھی جائے گی کہ شفیع صاحب کے بعد اسمبلی سطح کا مسلم لیڈر کہیں اور سے نہیں اسی گاؤں کی خاک سے اٹھا۔

سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ گاؤں کی دینی اور تعلیمی سرگرمیوں میں آپ کا قابل ذکر حصہ رہا ہے، تقریباً ۲۴ سالوں تک مدرسہ رحمانیہ کے سکریٹری رہے، اس طویل مدت میں مدرسہ نے ترقی کی جو منازل طے کی ہے ان میں یقیناً آپ کا بھی حصہ ہے۔

گاؤں کی ادبی سرگرمیوں میں بھی آپ شریک رہتے ہیں، آپ بتاتے ہیں کہ میرے بچپن میں کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے، طرحی مشاعرے اسی دور میں ہوئے، ان نشستوں

میں آپ شریک ہوتے، بچپن سے ہی خوش گلو رہے ہیں، بڑے مترنم انداز میں پڑھتے ہیں، آج بھی جب کوئی غزل پڑھنا شروع کرتے ہیں تو خاص سماں بندھ جاتا ہے، ابھی عید میں ’یاد حبیب‘ کے عنوان سے جو مشاعرہ ہوا اس میں بشیر بدر کی ایک غزل آپ کی زبان سے سننے کو ملی، میرے ساتھ خوش مزاج سامعین نے اس کا لطف لیا، آپ عموماً دوسروں کا کلام پڑھتے ہیں، کبھی کبھی کچھ مصرعے یا غزلیں بھی موزوں ہو جاتی ہیں، ہاں سخن فہم اور سخن شناس تو یقیناً ہیں۔

ڈاکٹر بیلٹ پاسوان بہنگم

یکہتہ کی خاک سے اٹھنے والی ایک اہم ہستی جو سیاست اور ادب کی دنیا میں بلند مقام رکھتی ہے، اور جو ترقی کے منازل طے کر کے بڑی شہرت و ناموری حاصل کرچکی ہیں، دنیا انہیں پدشری ڈاکٹر بلیٹ پاسوان بہنگم کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔

پسماندہ طبقہ ’’دوسادھ‘‘ خاندان میں کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا کہ ایک عام گھرانے میں پیدا ہونے والا بچہ آگے چل کر وزارت کی کرسی پر متمکن ہوگا اور پدمشری کے معزز لقب سے سرفراز کیا جائے گا، اسی ہونہار اور خوش قسمت بچہ کا نام بیلٹ پاسوان اور تخلص بہنگم ہے، والد کا نام بٹائی پاسوان ہے، یکم اپریل ۱۹۴۱ء میں اسی قصبہ میں پیدا ہوئے۔

آپ کی سیاسی زندگی ۱۹۶۷ء سے شروع ہوتی ہے جب مدھوبنی ضلع کے راج نگر اسمبلی حلقہ سے الیکشن میں کھڑے ہوئے، کامیابی حاصل کی اور ڈپٹی منسٹر بنائے گئے، اس کے بعد کامیابی کا یہ سفر جاری رہا، ۶۷ تا ۷۷ء اور ۸۵ء تا ۹۵ء چار بار رکن اسمبلی (M.L.A) منتخب ہوتے رہے، آپ کیبینیٹ منسٹر بھی رہے، ۸۰ء تا ۸۵ء بہار لوک سیوا آیوگ (B.P.S.C) کے ممبر رہے، آپ اکھل بھارتی ہریجن آدیواس وکاس سنگ کے قومی صدر بھی ہیں۔

تعلیمی لحاظ سے آپ کا قد بہت اونچا ہے، بہار یونیورسیٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد ہندی ساہت سمیلن الہ آباد سے ساہتیہ رتن (M.A) اور سنسکرت یونیورسیٹی وارانسی سے ودیا وارِدھی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی، اس کے علاوہ میتھلی وشوودیاپیٹھ سے ودیا واچسپتی (D.Litt) کی ڈگری سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔

آپ ادب اور شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں، میتھلی کے اچھے شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے، نظم ونثر دونوں صنف میں ایک درجن سے زائد کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں بھیروی، ورت ویاس، چینیکا، رب بھیری، سلہیے ساین مہا کاویہ، سلیش چالیسہ، پروندھک مہا کاویہ اور آ گی بھرل زنگی قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ بھی کتابیں ہیں، یہ ساری کتابیں میتھلی زبان میں ہیں، آپ کی غزلیں، کہانیاں، ہندی کے مشہور اخبارات مثلاً کادینی، ہندوستان، آج، آریہ ورت وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اب تک متعدد ایوارڈ اور اعزازات سے سرفراز ہوچکے ہیں، جن میں سب سے اہم اور قابل فخر اعزاز پدمشری ہے، ادبی اور سماجی خدمات کے لئے ۲۰۰۵ء میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام صاحب کے ہاتھوں یہ ایوارڈ ملا تھا۔

جائے وطن آپ کی توجہ کا مرکز کبھی نہیں بن سکا، ممکن ہے اپنی برادری کے افراد کو اونچا اٹھانے کے لئے بہت کچھ کیا ہو، مگر عمومی طور پر یہ سرزمین اپنے فرزند کی توجہ وعنایت سے محروم ہی رہی، البتہ اپنے حلقۂ اسمبلی راج نگر، کھجولی میں آپ نے بہت سے رفاہی اور سماجی کام کئے، وہاں متعدد اسکول اور کالج آپ کی یادگار ہیں۔

آپ کی زندگی اور کارناموں پر ڈاکٹر مدن کمار پاسوان نے ایک کتاب بھی لکھی ہے، جس کا نام ''بلیٹ پاسوان بہنگم: شخصیت اور کارنامے'' ہے، یہ کتاب متھلا یونیورسیٹی سے شائع ہونے والی ہے۔

(آ گی بھرل زنگی، ص: ۱۷، مضمون: پدمشری ڈاکٹر بلیٹ پاسوان بہنگم۔ ایک نظر میں، از: راج منی رائے منی)

رزیق احمد علیگ

بچپن میں ہمارے کان سب سے پہلے جس علیگ سے آشنا ہوئے وہ یہی رزیق احمد علیگ ہیں، اور اسی لفظ سے ہم نے علی گڑھ اور بعدہ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کو سمجھا، تقریباً پچیس تیس سال قبل نہ جانے کیسے اس قصبہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کا چرچہ ہوا، اور چند طلبہ نے وہاں کا رخ کیا، جن میں ایک رزیق احمد صاحب بھی تھے، بعد میں یہاں کے طلبہ میں علی گڑھ جانے کا

رجحان تو نہیں رہا، البتہ ان علیگیوں کی وجہ سے قصبہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کا نام کبھی کبھی گشت کرتا رہا۔

آپ نے سسوار ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی میں داخلہ لیا، جہاں انٹر سے ایم اے تک کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد متھلا یونیورسیٹی سے بی ایڈ کیا، ان ڈگریوں کے بعد بھی سرکاری ملازمت آپ سے کوسوں دور رہی، اس دوران آپ نے چند سال مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت بھی انجام دی۔

چند سال قبل آپ نے سیاست کی وادی میں قدم رکھا اور سماجی خدمت کو اپنا مشن بنایا، اس میدان میں بہت جلد آپ کی کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی، ۲۰۱۱ء میں پنچایت کے الیکشن میں مکھیا کے امیدوار بنے اور فاتح کہلائے۔

آپ ان دنوں اپنی زندگی سماجی خدمت کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں، اس قلیل مدت میں آپ نے بہت سے کام کئے، مگر آپ کا سب سے بڑا کارنامہ گاؤں میں وزیر اعلی کی آمد اور استقبال ہے، جس کے نتیجہ میں گاؤں والوں کی سب سے دیرینہ خواہش ہائی اسکول کی شکل میں پوری ہوئی، ساتھ ہی مختلف کاموں کے لئے بھی فنڈ ملے، وزیر اعلی اپنے سیوا یاترا میں یہاں آئے اور اپنی خواہش پر آئے، لیکن ان کی آمد، آمد بہار ثابت ہوئی، اور یکہتہ کی سرزمین وزیر اعلی کی نوازشات سے پر بہار بن گئی، اس تقریب کے انعقاد میں گاؤں کے تمام اہل علم واہل دانش کی شرکت رہی، خاص طور پر جناب انیس احمد اور جناب رزیق احمد نے اس سلسلہ میں بڑی محنت کی، اس کامیابی کا سہرا ان ہی دونوں کے سر ہے۔

آپ گاؤں کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں، اس وقت سب سے اہم مسئلہ وزیر اعلی کے ذریعہ اعلان کئے گئے وعدوں کو کاغذ سے زمین پر لانے کا ہے، اس کام میں ہمارے رزیق صاحب پوری طرح سرگرم ہیں، خدا وہ دن جلد لائے جب یہ خواب حقیقت بن کر سامنے آئے، اور گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو تعلیم کے لئے در بدر نہ بھٹکنا پڑے۔

آپ اس وقت جدیو کے اقلیتی سیل بہار کے جنرل سکریڑی کے ساتھ جدیو ضلع کے بھی

جنرل سکریٹری ہیں۔

مشتاق علی فہمی

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کے فرزند ارجمند جناب مشتاق علی فہمی صاحب نہایت متحرک وفعال، خداداد ذکاوت وذہانت کے حامل، اور ملی کاموں میں سرگرم رہنے والے ،سماجی وملی کارکن ہیں، مدرسہ رحمانیہ کے چشمۂ فیض سے جہاں خود فیضیاب ہوئے وہیں بحیثیت مدرس اور رکن مجلس منتظمہ کے اس کی خدمت کا بھی موقع ملا، اس طرح تین حیثیتوں سے آپ کا مدرسہ رحمانیہ سے تعلق رہا ہے۔

۲/اگست ۱۹۶۸ء آپ کی تاریخ پیدائش ہے، حفظ کے ساتھ فاضل درجہ تک کی تعلیم مدرسہ رحمانیہ سے حاصل کی، ۹۲ء میں فاضل کی ڈگری حاصل کی، ساتھ ہی ۱۹۸۵ء میں سی ایم جی کالج کھٹونہ سے گریجویشن اور ۸۷ء میں گھوگھڈیا ٹریننگ کالج سے B.B.T پاس کیا۔

۱۹۸۸ء میں آپ نے مدرسہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی، جس کا سلسلہ ۹۳ء تک جاری رہا، اسی سال آپ کو ہائی اسکول کی ملازمت ملی، پہلے رہتاس میں رہے، پھر کشیشور استھان ہائی اسکول میں رہے، اس وقت لوکہی بلاک کے مریابلوا گاؤں کے ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اسکول میں اچھی کارکردگی کی بنیاد پر ضلع ایجوکیشن افسر کی طرف سے اعزازی سرٹیفیکٹ سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔

آپ کا اصل میدان اور آپ کے مزاج سے ہم آہنگ کام ملی وسماجی سرگرمیاں ہیں، آپ نے بلا کی ذہانت کے ساتھ متحرک طبیعت بھی پائی ہے، چنانچہ ہمیشہ آپ کے ذہن میں کام کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں، آپ کی سرگرمیوں کا میدان زیادہ تر مدرسہ رحمانیہ اور قصبہ رہا ہے، سیرت کمیٹی کنونشن ہو یا مدرسہ کا کوئی سالانہ جلسہ، مدرسہ میں بنات سیکشن کے قیام اور اس کے نصاب کی بات ہو، یا کمپیوٹر سیکشن اور دار القضاء کے قیام کا مسئلہ، ہر جگہ اور ہر موقع پر آپ سرگرم نظر آتے ہیں، اور کام کو گویا اپنے سر اوڑھ لیتے ہیں، ایک میعاد تک مجلس منتظمہ کے رکن بھی رہے ہیں، اس وقت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت جاری مدرسہ میں کمپیوٹر سنٹر

کے انچارج ہیں۔

آپ مختلف ملی تحریکوں میں شامل رہے ہیں، قومی تحریک کے توبانیوں میں سے تھے، اس کے علاوہ اصلاح معاشرہ کمیٹی میں بھی سرگرم رہے، شفیع اردو لائبریری کے سکریٹری اور صدر رہے، ۸۵ء سے ۹۰ء تک قومی تنظیم بہار ضلع مدھوبنی کے کنوینر رہے، چار سال کانگریس بلاک یوتھ کھٹونہ کے جنرل سکریٹری رہے، اس وقت آل انڈیا ملی کونسل اور ضلع مدھوبنی تعلیمی صلاح کار کمیٹی کے رکن ہیں۔

اس طرح ایک سماجی اور سیاسی وملی کارکن کی حیثیت سے ہمیشہ سرگرم اور قصبہ وعلاقہ کی تعلیمی وسماجی فلاح کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں، اس حوالہ سے گاؤں کی تاریخ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

دیگر

ان حضرات کے علاوہ قصبہ اور مضافات کے تمام گاؤں میں متعدد حضرات سماجی اور رفاہی کاموں میں لگے ہوئے ہیں، اپنے اپنے دائرہ میں اور اپنی اپنی سطح کے مطابق یہ افراد عوام الناس کو فائدہ پہونچاتے ہیں، اور اسی لحاظ سے عوام میں ان کا تعارف بھی ہے۔

تعلیمی، ادبی اور ملی سرگرمیاں

دینی دانشگاہیں

مدرسہ رحمانیہ

مدرسہ رحمانیہ تعلیم کا وہ عظیم مرکز ہے جس نے بلاشبہ علاقہ میں تعلیمی بیداری کی غیر معمولی خدمت انجام دیا، ابتدائی مکتب کی شکل میں علم کا جو ننھا پودا لگایا گیا وہ ذمہ داروں کے اخلاص اور ان کی قربانیوں کی بدولت ترقی کے منازل طے کرتا ہوا ایک شجر سایہ دار کی شکل اختیار کر گیا، جس سے نہ صرف بڑی تعداد میں لوگوں نے فائدہ اٹھایا بلکہ اس کے ذریعہ علم کی باد بہاری چل گئی، یہ علم کا ایسا چشمۂ حیواں ثابت ہوا جس نے ہزاروں تشنگان علوم کی علمی پیاس بجھائی، مدرسہ کا سب سے بڑا کارنامہ علاقہ میں دینی تعلیم کی اشاعت ہے، آج سے سوا سو سال قبل جب جہالت کی تاریکی میں لوگ ڈوبے ہوئے تھے، مدرسہ رحمانیہ کی شکل میں گویا روشنی کی ایک شمع جلائی گئی، جس کی روشنی پھیلتی گئی اور اجالے بڑھتے گئے، علاقہ کی تعلیمی بیداری اسی مدرسہ رحمانیہ کی رہین منت ہے، یہ اس کی ایسی خدمت ہے جس میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔

یہ علاقہ کا پہلا دینی ادارہ تھا، اسی کے ذریعہ علاقہ میں علم کی روشنی پھیلی، چنانچہ علم کے پروانے چہار جانب سے لپک لپک کر آنے لگے، اور جلد ہی اس کی شہرت قصبہ سے باہر دور دراز علاقوں تک پہونچنے لگی، مدرسہ عروج کے منازل طے کرتا رہا، یکے بعد دیگرے نئے درجات کھلتے رہے اور بالآخر ایک وقت آیا کہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے اس سر زمین کے بام و در گونجنے لگے، یہ مدرسہ کا سب سے زریں دور تھا، اس تعلیمی ترقی کے نتیجہ میں مدرسہ اور مدرسہ کی وجہ سے اس قصبہ کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔

مدرسہ کے قیام کو صدی سے زائد عرصہ بیت چکا ہے، اس دوران مدرسہ مختلف نشیب و فراز سے گزرا، عروج و زوال کی داستانیں بھی رقم ہوئیں، حالات و مسائل بھی آئے، ان سب کے

باوجود مدرسہ قائم رہا اور علم کی شمع کو فروزاں رکھا۔

اس طرح مدرسہ کی ایک طویل تاریخ ہے، اس کی ایک داستان ہے، جو خوش کن بھی ہے اور المناک بھی، یہ ایسی داستان ہے جس میں نہ صرف قصبہ بلکہ علاقہ کی تصویر دیکھی جا سکتی تھی، مگر افسوس کہ اس عظیم تاریخ کو بتانے والا کوئی نہیں، اس حسین داستان کا کوئی راوی نہیں، تاریخ بنانے والے اپنے خون سے تاریخ رقم کر کے چلے گئے، مگر کسی نے اس تاریخ کو الفاظ کا پیکر دینے کی کوشش نہیں کی، اسلاف کے اس عظیم الشان کارنامے کو دیکھ کر ہر سلیم الفطرت شخص کا جبینِ نیاز فرطِ عقیدت سے جھک جاتا ہے، مگر جب وہ اس کی تاریخ جاننا چاہتا ہے تو سوائے شرمساری کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہمارے بڑوں نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی، یا اسے اخلاص کے خلاف سمجھا، یا پھر وہ اس ذوق کے نہیں تھے، جس کی وجہ سے اس اہم کام کی طرف توجہ نہیں ہو سکی، حالانکہ اس ضرورت کا احساس باشعور اہل علم کو بخوبی تھا، معائنہ رجسٹر میں ہمیں ایجوکیشن افسر صفات احمد صاحب کی ایک تحریر ملتی ہے جس میں مدرسہ کی تاریخ محفوظ کرانے کی تجویز تک درج ہے، مگر بعد کے صفحات میں یا کاروائی رجسٹروں میں اس سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں ملتی ہے۔

سن قیام اور ابتدائی پس منظر

قصبہ یکہتہ کی آبادی بہت قدیم ہے، پرانی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں باشعور افراد زمانہ قدیم سے پیدا ہوتے رہے ہیں، چنانچہ یہ ماننا پڑے گا کہ تعلیم کا کوئی نہ کوئی نظام پرانے زمانہ میں بھی ضرور رہا ہوگا، البتہ تعلیم کی کیا شکل تھی اور کس معیار تک تعلیم ہوتی ہوگی؟ ان باتوں کی تعیین مشکل ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھریلو تعلیم یا مکتب کا نظم رہا ہوگا، اہل ثروت اور رؤساء کے دروازوں پر تعلیم دینے کی کوئی نہ کوئی شکل رہی ہوگی، جس کو مدرسہ یا مکتب کا نام نہ دیں مگر اس زمانہ میں تعلیم کا یہی کوئی طریقہ رائج ہوگا۔

مدرسہ رحمانیہ سے پہلے بھی یہاں مکتب جاری تھا، ممکن ہے مکتب ہی ترقی کر کے مدرسہ کی

شکل اختیار کر گیا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسہ یا مکتب کے نام سے باضابطہ ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی گئی ہو، مدرسہ کی تاریخ سے متعلق ایک پرانی تحریر اس دوسرے خیال کی تصدیق کرتی ہے، مدرسہ کے ابتدائی دور کی تاریخ پر مشتمل کاپی میں مدرسہ کا پس منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> مدرسہ رحمانیہ یکہتہ کی بنیاد ۱۸۸۰ء میں پڑی، قبل اسکے یہ مدرسہ مکتب کی شکل میں تھا، مکتب سے پہلے یہاں کوئی مدرسہ نہیں تھا، یہاں سے لوگ بغرض تعلیم دربھنگہ اور مظفرپور جاتے تھے، کیونکہ اس علاقہ کے لوگوں کے لئے یہی دو شہر قریب کا علمی گہوارہ تھا۔
>
> ۱۸۸۰ء سے متعدد سال قبل جبکہ حاجی مولا بخش مرحوم جد امجد حاجی عبدالحق صاحب رئیس یکہتہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب نور اللہ مرقدہ کی معیت میں بیت اللہ شریف جا رہے تھے، اثناء راہ میں حضرت کی تحریک ہوئی کہ موضع یکہتہ میں ایک دینی مکتب کی بنیاد ڈالی جائے، چنانچہ حج سے واپسی پر حضرت مولانا سید سلیمان پھلواری وسید شاہ احمد اللہ صاحب جد امجد حافظ رحمت اللہ صاحب مظفرپوری کی تحریک پر ایک مکتب کی بنیاد ڈالی گئی، اور چونکہ اس وقت مدرسہ کا کوئی مکان نہیں تھا، لہذا اسی جامع مسجد میں بچوں کو تعلیم دی جانے لگی، اس مکتب کے پہلے مدرس حافظ عبدالرحمٰن صاحبؒ دربھنگوی ہوئے، حافظ صاحب موصوف کے وصال کے بعد حافظ امیر الدین ململیؒ مدرس ہوئے، یہ جگہ جہاں پر مدرسہ کی عمارت ہے ایک بڑا اگڑھا تھا، جناب رحمٰن بخش مرحوم جد امجد آنریبل منسٹر پی ڈبلو ڈی بہار اسٹیٹ مسٹر محمد شفیع صاحب زاد مجدہ کی تحریک پر ساکنان بستی نے اس گڑھا کو بھر دیا، اس کے بعد ایک کھپر پوش مکان کی تعمیر کی گئی، چنانچہ انہی کے اسم گرامی پر اس مدرسہ کا نام مدرسہ رحمانیہ رکھا گیا، حافظ امیر الدین کے وصال کے بعد حافظ رمضان علی صاحب مظفرپوری اور مولوی عبدالمجید صاحب مظفرپوری مدرس ہوئے،

زیادہ تراس زمانہ میں حفظ قرآن کی طرف گارجین کا خیال تھا۔

اس تحریر میں سن قیام ۱۸۸۰ء درج ہے، گویا اس نئے مکتب یا مدرسہ کی بنیاد ۱۸۸۰ء میں پڑی، مدرسہ کی طرف سے شائع ایک تعارف نامہ میں سن قیام ۱۸۸۴ء لکھا ہے، اس وقت یہی تاریخ معروف ہے، مدرسہ کے جملہ کاغذات میں بھی سن قیام یہی لکھا جاتا ہے، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب دامت برکاتہم نے اپنی یادداشت میں سن قیام ۸۰ء لکھوایا ہے، ایک بار راقم کے پوچھنے پر مولانا نے بتایا کہ سن قیام ۸۰،۸۲ء کے بعد تقریباً ۸۵،۸۶ء ہے، مولانا اس کی وجہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ شکری کے ایک شخص مولانا سے ملے اور انہوں نے بتایا کہ ۱۸۹۰ء میں اس نے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔

اس طرح سن قیام کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: ۸۰ء یا ۸۰ء کے بعد ۸۳،۸۴ء، ۸۵،۸۶ء، مذکورہ تحریر چونکہ سب سے پرانی ہے، اور مولانا بھی اسی کے قائل ہیں، اس لئے ۸۰ء زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے، مدرسہ کے کاغذات میں ۸۴ء کو کس بنیاد پر راجح قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں کوئی معلومات نہیں مل سکی ہے۔

رحمانیہ کے بانی

مدرسہ کے بانی کون ہیں اور رحمانیہ کی نسبت کس کی طرف ہے؟ اس سلسلہ میں بھی کوئی مستند بات نہیں ملتی ہے، مذکورہ تحریر میں صراحت ہے کہ مدرسہ کے بانی رحمٰن بخش ہیں، جو قصبہ کے رئیس تھے، اور انہی کی طرف نسبت کر کے رحمانیہ نام رکھا گیا، دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی نسبت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی طرف ہے، جو مولانا محمد علی مونگیری کے پیر تھے، اور تیسری رائے یہ ہے کہ مدرسہ کے بانی مولانا زین الدین صاحب ہیں، جو قصبہ کے پہلے فارسی داں عالم تھے۔

یہ تیسری رائے قاری ذوالفقار صاحب کی ہے، ان کے بقول:

> مولانا (مولانا زین الدین صاحب) اپنے دروازے پر طلبہ کو درس دیا کرتے تھے، اس وقت باضابطہ کوئی مدرسہ نہیں تھا، جب طلبہ کی تعداد بڑھنے

> لگی تو انہوں نے جامع مسجد سے متصل جانب شمال اپنی زمین میں ایک جھونپڑی بنوایا، جس کا نام اپنے پیرومرشد حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے نام سے مدرسہ رحمانیہ رکھا۔
>
> (ملخص از: یکہتہ تاریخ کے آئینہ میں ص: ۱۵)

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب فرماتے ہیں:

> جہاں تک میری معلومات ہیں، مدرسہ رحمانیہ کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد ہی ۱۸۸۰ء میں پڑی، اس کے بانی جناب رحمٰن بخش تھے جو کہ مسٹر شفیع بیرسٹر کے والد محترم تھے، اسی بناء پر مدرسہ کا نام مدرسہ رحمانیہ پڑا، دوسرا قول یہ ہے کہ مدرسہ رحمانیہ کا نام رحمانیہ اس لئے پڑا کہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مرید ومسترشد حضرت مولانا محمد علی مونگیری (بانی ندوۃ العلماء) ۱۹۲۰ء میں یکہتہ تشریف لائے تھے، اپنے پیر کے نام پر اس کا نام رکھا، یہ دوسرا قول حافظ محمد فقیر ساکن بھلنی کا ہے، جو ۱۹۲۰ء میں مدرسہ رحمانیہ میں زیر تعلیم تھے، جب حضرت مولانا مونگیری تشریف لائے تھے، ان ہی کی زبان سے مجھے یہ معلوم ہوا۔ (یادداشت)

مولانا زین الدین صاحب سے پہلے اگر یہاں باضابطہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا تو ظاہر بات ہے کہ وہ اس کے بانی نہیں ہو سکتے، انہوں نے اس وقت کی تعلیم یعنی مکتب یا مدرسہ کے ابتدائی نظام کو منظم کیا ہوگا، اور ان کی کوششوں سے تعلیمی ترقی ہوئی ہوگی، مدرسہ سے متعلق پرانی تحریر اور مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب کی یادداشت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیری صاحب ۱۹۲۰ء میں یہاں تشریف لائے، ان کی آمد سے پہلے یہاں کے متعدد افراد سے ان کا گہرا رابطہ وتعلق تھا، گاؤں کے لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی، ظاہری بات ہے کہ اس وقت کے ذی شعور طبقہ کا ضرور آپ سے تعلق رہا ہوگا، اس لحاظ سے اس زمانہ میں قائم ہونے والے ادارہ کی نسبت حضرت والا کی طرف کرنا بھی

قرین قیاس نظر آتا ہے، پھراس رائے کوتقویت اس سے ملتی ہے کہ صوبہ بہار میں اورکئی ادارے رحمانیہ کے نام سے ہیں اورسب کی نسبت حضرت کے پیرمولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی طرف کی جاتی ہے۔

حسن اتفاق کہ بیک وقت یہ دونوں رائیں ممکن ہیں، میرے ناقص خیال میں مدرسہ رحمانیہ کی باضابطہ بنیادنہیں ڈالی گئی، بلکہ یہ پہلے سے قائم مکتب کی ترقی یافتہ شکل ہے، اسی لئے سن قیام کی کوئی ایک تاریخ نہیں بیان کی جاتی ہے، البتہ جب مکتب کی تعلیم میں اضافہ ہوا اوراس کی شہرت بڑھنے لگی تب اس کے نام کی ضرورت پیش آئی ہوگی، چنانچہ اس وقت کے اصحاب علم واہل فہم حضرات نے ایسانام متعین کیا جس میں بیک وقت دونوں نسبتوں کی گنجائش ہو، رحمٰن بخش کی طرف نسبت اس لئے کہ وہ اس وقت کے رئیس تھے، مکتب یا مدرسہ کے قیام میں ان کا بڑا تعاون شامل رہا ہوگا، اورمولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی طرف نسبت اس لئے کہ اس وقت وہی شخصیت لوگوں کا مرکز عقیدت تھی۔

مدرسہ جس زمین پر اولاً قائم ہوا وہ زمین مسماۃ زیب النساء (دستاویز میں مسماۃ زیبن لکھا ہے) کی وقف کردہ ہے، جوشمشیرعلی ادھیکاری کی زوجہ تھی، مدرسہ کے ریکارڈ میں اس کی صراحت موجود ہے، اس زمین کا رقبہ ایک کٹھا سترہ دھور ہے۔

رحمانیہ کا پہلا دور

مدرسہ کے قیام کے بعد باضابطہ تعلیم شروع ہوئی، جس کا ذکر اوپر گزرا، شروع میں حفظ کی طرف توجہ تھی، البتہ جب مولانا زین الدین صاحب آئے توانہوں نے اس مدرسہ کوترقی دینا شروع کیا، وہ خود بڑے فارسی داں تھے، چنانچہ اس وقت کی ضرورت کے مطابق فارسی پڑھنے کے لئے ان کی طرف بڑا رجوع ہوا، اس طرح مدرسہ کی شہرت ہونے لگی، اور دور دراز سے طلبہ یہاں آنے لگے، اس دور کی تفصیل پرانی کاپی میں کچھ اس طرح درج ہے:

> اس دور کے بعد حضرت مولانا ومولوی زین الدین صاحب طاب مثواہ یہاں کے مدرس اول بنائے گئے، اوران کی سرکردگی میں دواورمدرسین حافظ عبداللہ

> صاحب مرحوم اور حافظ عبدالمجید صاحب ململی بحال کئے گئے، یہ دور مدرسہ کا بہترین دورتھا، کیونکہ اس زمانہ میں مدرسہ کا ستارہ اقبال اوج پر جاپہونچا تھا، اطراف وجوانب کے علاوہ ضلع مالدہ، پورنیہ، بھاگلپور، مظفرپور کے طلبہ تعلیم پاتے تھے، ہمارے بزرگوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں بیرونی طلبہ کی تعداد ساٹھ ستر سے زیادہ تھی، ان طلبہ کے اکل وشرب کے انتظام اہالیان بستی ہی کرتے تھے، اس زمانہ میں یہاں کی فارسی تعلیم فقیدالمثال تھی، حضرت مولانا زین الدین صاحب زبان فارسی کی تعلیم وتعلم میں یدطولی رکھتے تھے، چنانچہ ان کی فارسی دانی کی شہادت ان کے شاگردان باکمال دے رہے ہیں، حضرت مولانا نے بڑی ہی جانفشانی وتندہی سے مدرسہ کوترقی کے راستہ پر گامزن کیا، اسی دور کا فیض ہے کہ اس بستی میں حفاظ وفارسی دانوں کی کثرت ہے، اس بستی میں جولوگ حافظ قرآن وفارسی داں معمر وسن رسیدہ ابھی نظر آتے ہیں اسی مدرسہ کے فیض یافتہ ہیں، اگراس دورکو Golden Age کہا جائے توبے جانہ ہوگا"

مولانا ممتازعلی مظاہری صاحب اپنی یادداشت میں لکھواتے ہیں:

> حضرت مولانا زین الدین صاحب مدرسہ رحمانیہ میں تاحیات درس وتدریس اورمدرسہ کے اہتمام کے فرائض انجام دیتے رہے، وہ میرے بھی استاذ تھے، ۱۹۳۷ء میں جب یکہتہ میں زبردست ہیضہ پھیلا ہوا تھا ان کا انتقال ہوا، اللہ غریق رحمت کرے، مولانا کے دور میں بیرونی طلبہ سہرسہ، بھاگلپور، پورنیہ ضلع سے کافی تعداد میں فارسی اورحفظ کی تعلیم کے لئے یہاں آتے تھے، اس وقت مطبخ کا کوئی انتظام نہیں تھا، مقامی لوگ ان کے قیام وطعام کا نظم کرتے تھے، ایک ایک صاحب کے یہاں تین تین، چار چار طلبہ کا قیام وطعام ہوتا تھا۔

قاری ذوالفقار صاحب نے بھی اپنے دادا مولانا زین الدین صاحب کے تذکرہ میں

اسی طرح کی بات لکھی ہے۔

اس دور میں لڑکیوں کے پڑھنے کا بھی انتظام تھا،لڑکیاں بھی حفظ کرتی تھی،قاری ذوالفقار صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا زین الدین صاحب کی دوصاحبزادیاں حافظ تھیں،اور یہ دونوں گھر پرلڑکیوں کوتعلیم دیا کرتی تھیں۔

بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کے لئے مدرسہ میں کوئی انتظام نہیں تھا،قصبہ کے لوگ ان مہمانان رسول کے لئے اپنی سطح کے مطابق کھانے اور رہنے کا انتظام کرتے تھے،اسی طرح اس دور میں مدرسہ کی کمیٹی یا ذمہ داران کی تفصیل بھی نہیں ملتی ہے،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا زین الدین صاحب ہی سب کچھ تھے،استاد بھی،مربی بھی اور منتظم بھی۔

اس دور میں مدرسہ کی ساری ترقی دراصل مولانا کی کوششوں کا مرہون منت تھیں،آپ کی زندگی تک تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رہا،اس کے بعد پھر تعلیم مکتب کی سطح پر آگئی،پرانی تحریر میں درج ہے:

> ......مگر فطرت کے قانون کے مطابق ہر کمالے را زوال اور ہر زوالے را کمال، اس مدرسہ کے اوپر بھی حضرت مولانا زین الدین صاحب نوراللہ مرقدہ کے وصال کے بعد بادخزاں کے مسموم جھونکے آپڑے،جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی وعربی کی تعلیم بالکل ختم ہوگئی،صرف حفظ کی تعلیم رہ گئی،بفضلہ تعالی مدرسہ کا وجود کبھی کالعدم نہیں ہوا لیکن وہ اوج جو مولانا کے دور میں تھا وہ ختم ہو گیا،اس مدرسہ میں مدرسین برابر پانچ چھ کام کرتے تھے،اور حفظ قرآن کی تعلیم دیتے رہے،اسی مدرسہ کا فیض تھا کہ اس دور میں یہاں متعدد حافظ قرآن عورتیں بھی ہوئیں۔

مولانا زین الدین صاحب کا انتقال ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۷ء میں ہوا ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ کا دور عروج ۳۰ء یا ۱۹۳۷ء تک جاری رہا،اس دور کے فیض یافتگان کے نام تاریخ میں محفوظ نہیں رہے،البتہ اس فہرست میں صرف ایک نام ہی ایسا ہے جو اس دور کو یاد رکھنے کے

لئے کافی ہے،یہ نام مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کا ہے،آپ اسی زمانہ کے فیض یافتہ ہیں،مولانا زین الدین صاحب سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے،آپ نے مولاناؒ سے فارسی کی پہلی اور آمدنامہ وغیرہ پڑھی ہے۔

نشاۃ ثانیہ اور تعلیمی ارتقاء

مدرسہ کا دوسرا دور ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے،یہ دور بھی سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے، پہلا دور اگر فارسی کی تعلیم کے لئے مشہور ہے تو یہ دور عربی اور درس نظامی کے نام سے شہرت رکھتا ہے،اس دور میں مدرسہ نے ہر اعتبار سے ترقی کے منازل طے کئے،تعلیم اور تعمیر دونوں اعتبار سے مدرسہ نے قابل ذکر بلندیاں حاصل کیں،مدرسہ کا انتظام وانصرام بڑے منظّم انداز میں چلتا رہا،اس دور کی پوری تفصیلات مدرسہ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

۱۹۴۶ء میں مولانا ممتاز علی صاحب نے مدرسہ رحمانیہ میں تدریس شروع کی،آپ کے آنے کے بعد تین اساتذہ اور بحال کئے گئے اور اس طرح آپ کی سرکردگی میں تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوئیں،جس میں روزافزوں ترقی ہوتی رہی۔

کاروائی رجسٹروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مدرسہ کی باضابطہ کمیٹی تشکیل پا چکی تھی،جو صدر،سکریٹری (ناظم) نائب ناظم اور اراکین پر مشتمل تھی،مدرسہ کا پورا نظام بڑے منظّم انداز میں چلتا رہا،اور سارے امور اراکین مجلس منتظمہ کے فیصلے سے انجام پاتے تھے۔

مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب کے آنے سے گویا مدرسہ میں بہار آگئی،ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی،آپ نے تعلیم سے پوری دلچسپی لی،اور تعلیم کو آگے بڑھانے میں اپنی پوری توانائی صرف کردی،مولانا کے دھن،لگن اور مجلس منتظمہ کے قدم بقدم تعاون کے نتیجہ میں مدرسہ ترقی کے منازل طے کرنے لگا،۱۹۵۲ء میں جناب محمد شفیع بیرسٹر صاحب کی کوشش سے مدرسہ کا الحاق وسطانیہ تک ہوا۔

جب تعلیم وسطانیہ چہارم تک پہونچ گئی تو مولانا کو آگے کی تعلیم کی فکر ہوئی،چنانچہ

مولانا نے فوقانیہ کا درجہ کھولنے کی کوشش شروع کی، مجلس منتظمہ کی میٹنگ منعقدہ ۲۰/دسمبر ۱۹۵۲ء میں مولانا نے یہ تجویز پیش کی، کاروائی رجسٹر میں آپ کی تقریر اس طرح درج ہے:

> مولانا ممتاز علی صاحب نے فوقانیہ کھولنے کی اشد ضرورت بتلاتے ہوئے کہا کہ اس علاقہ میں وسطانیہ سے اوپر کلاس کا کوئی مدرسہ نہیں ہے، اور نہ اس علاقہ کے قرب وجوار میں کوئی مسلم ہائی انگلش اسکول ہے، متعدد ہندی ہائی انگلش اسکول اگر ہے بھی تو مسلمان اپنی غربت وافلاس کے باعث لڑکے کو ان اسکولوں میں پڑھانے سے معذور ہیں، ایسی صورت میں اگر یہی مدرسہ فوقانیہ کلاس تک کھول دیا جائے تو بستی واطراف کے لڑکے کم اخراجات میں علوم دین ودنیوی سے کماحقہ مستفیض ہوسکتے ہیں، اگر فوقانیہ کلاس نہ کھولا گیا تو علاقہ کے لڑکے اپنی اقتصادی زبوں حالی کے باعث کسی دوسرے مدارس میں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ فوقانیہ کلاس ۵۳ء سے ضرور کھول دیا جائے، تاکہ وہ لڑکے جو وسطانیہ اکزامینیشن میں شریک امتحان ہوچکے ہیں انہیں اور دوسرے طلبہ کو تعلیم جاری رکھنے میں سہولت ہو۔ (کاروائی رجسٹر ۵۲ء تا ۶۴ء)

اراکین انتظامیہ نے مولانا کی اس رائے سے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سال ۱۹۵۳ء میں فوقانیہ کا درجہ شروع کردیا جائے، چنانچہ ۵۳ء میں فوقانیہ اول اور ۵۴ء میں فوقانیہ دوم کا درجہ شروع ہوا۔

نئے درجات کے ساتھ اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا، اب کل سات اساتذہ درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، عربی تعلیم کا شہرہ سن کر بیرونی طلبہ کی آمد ہونے لگی، معائنہ رجسٹر میں ۵۳ء میں اساتذہ کی تعداد ۶ اور مقیم طلبہ کی تعداد ۲۰، اور ۵۴ء میں اساتذہ کی تعداد ۷ اور مقیم طلبہ کی تعداد ۱۳ لکھی ہوئی ہے، اسی زمانہ میں مطبخ بھی شروع ہوا ہے، معائنہ رجسٹر میں یہ بھی لکھا ہے کہ ۴/طلبہ کو مدرسہ سے اور بقیہ طلبہ کو گاؤں سے کھانا ملتا ہے۔

۱۶/جنوری ۶۱ء کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں مولوی درجہ تک مدرسہ کے الحاق پر غور ہوا، ۸/اکتوبر ۶۱ء کی میٹنگ میں طے پایا کہ مولوی کا درجہ کھول دیا جائے، اگلے سال مناسب استاد کے نہ ملنے اور مالی پریشان حالی کی وجہ سے اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہوا، اس کے بعد یہ درجہ شروع ہوگیا۔

۲۲/جون ۶۹ء کو عالم درجہ کھولنے کی درخواست دینے کی تجویز مجلس منتظمہ میں منظور ہوئی، ۱۹۷۰ء میں عالم درجہ کا الحاق ہوا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ان درجات کی تعلیم ہورہی تھی، اس کے بعد ۷۳ء میں فاضل حدیث، ۸۷ء میں فاضل اردو وفارسی اور ۱۹۸۷ء میں عالم آنرس کا الحاق ہوا۔

ان درجات میں عملی طور پر کب تک تعلیم ہوتی رہی، اس کو معلوم کرنے کے لئے ہم نے مدرسہ کے داخلہ ریکارڈ کا جائزہ لیا، جس سے یہ بات سامنے آئی کہ الحاق کے بعد سے ۸۱ء تک مولوی، عالم درجہ تک تعلیم مسلسل ہوئی ہے، ۸۲ء سے ۹۳ء تک وسطانیہ اول، دوم، سوم کی تعلیم ہوئی ہے، ۹۲ء میں ایک بار پھر عالم اور فاضل اردو، فارسی تک طلبہ کا داخلہ ہوا، لیکن یہ عروج زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوسکا، ۹۴ء میں پھر تعلیم وسطانیہ دوم تک آ گئی، اس کے بعد دوبارہ عروج اب تک نصیب نہیں ہوا۔

تعمیرات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ۵۰ء میں مدرسہ جھونپڑی کی شکل میں تھا، جب تعلیم آگے بڑھی تو عمارت کی تعمیر بھی ناگزیر ہوا، چونکہ قدیم مدرسہ کی جگہ کم تھی اور وہاں توسیع کی گنجائش بھی نہیں تھی، چنانچہ پہلی توسیع اس طرح ہوئی کہ اس کے قریب ہی ایک جگہ پر مدرسہ کی نئی عمارت بنائی گئی، جب یہ جگہ بھی تنگی کا شکوہ کناں ہونے لگی تو ارباب مدارس نے گاؤں سے باہر ایک بڑا قطعہ اراضی حاصل کی، جس پر ۱۹۸۲ء میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے خلیفہ مولانا منور حسنؒ کے ہاتھوں جدید عمارت کی بناء رکھی گئی، جو اب ایک پرشکوہ عمارت کی شکل میں مدرسہ کے شاندار ماضی کی گواہ بنی ہوئی ہے، اسی موقع پر مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ کے لئے ایک مسجد کی بھی بنیاد رکھی گئی جو اب مسجد رحمانی کے نام سے موسوم ہے۔

مدرسہ کے عروج کی تاریخ لکھتے ہوئے معین عاجزؔ کے اشعار جوانہوں نے مدرسہ کے بارے میں کہے ہیں، یاد آرہے ہیں:

علم کا مہر درخشاں مدرسہ رحمانیہ
دین کی شمع فروزاں مدرسہ رحمانیہ
جہل کے گہرے اندھیرے میں ہدایت کا چراغ
ہے فروغ دین کا ساماں مدرسہ رحمانیہ
منبع علم اور عرفان مدرسہ رحمانیہ
مرکز تسلیم قرآن مدرسہ رحمانیہ
علم وفن کا اک مکان ہے مدرسہ رحمانیہ
دین حق کا پاسباں ہے مدرسہ رحمانیہ
بڑھ رہا ہے سوئے منزل اپنے سینے میں لئے
جذبہ دین درد ملت مدرسہ رحمانیہ
یہ تو ہے ممتاز صاحب کی آخرت کا اہتمام
دولت ارض وسما ہے مدرسہ رحمانیہ

ابتدائی معماران

۵۰ء سے قبل مدرسہ کا انتظام کس طرح چل رہا تھا، اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ قصبہ کے اہل ثروت کی نگرانی میں اور انہی کی توجہ سے اس کا انتظام وانصرام ہوتا ہوگا، ۵۰ء کے بعد کی تمام تفصیلات مدرسہ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں، اس ریکارڈ کی روشنی میں ہم مدرسہ کے منتظمین، معاونین اور اس کے اصلی معماران پر روشنی ڈالیں گے۔

مدرسہ کو جن حضرات نے اپنے خون پسینہ سے سینچا، اور واقعی جن کی محنت، لگن، اور بے لوث قربانیوں کے نتیجہ میں مدرسہ کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوا، ان کی اگر فہرست

بنائی جائے تو اس میں درج ذیل شخصیات سب سے نمایاں نظر آئیں گی:

۱۔ مولانا ممتاز علی مظاہری — ۲۔ حاجی عبدالحق بابو
۳۔ عبدالغفار بابو — ۴۔ سمیع الدین بابو
۴۔ محبّ الحسن بھولا بابو — ۵۔ حاجی منیرالدین
۶۔ حاجی عبدالرؤف — ۷۔ ڈاکٹر عبدالقدوس

ان حضرات کی کوششیں اس لحاظ سے بھی ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی کہ مولانا ممتاز علی مظاہری کے علاوہ بقیہ حضرات مدرسہ کے ملازم نہیں تھے، اعزازی ذمہ دار تھے، مگر اس کے باجود مدرسہ سے ان کا تعلق جس قدر گہرا تھا اور جس طرح اس سے محبت وفدائیت کا رشتہ رکھتے تھے وہ ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

حضرت مولانا ممتاز علی مظاہری کی حیثیت گل سرسبد کی ہے، مدرسہ کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، وہ پورے علاقہ میں تعلیم کے پیامبر تھے، آج تعلیم کا جو رجحان ہے اور جس طرح قصبہ کے اطراف اور علاقہ میں دینی تعلیم کی طرف توجہ ہو رہی ہے ان سب کے پیچھے مولانا دامت برکاتہم کی محنت کا عکس کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا۔

۱۹۶۱ء میں مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے بعض وجوہ کی بنیاد پر استعفا دینا چاہا، اس موقع پر کاروائی رجسٹر میں آپ کی خدمات کا جس طرح اعتراف کیا گیا اس سے آپ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، کاروائی رجسٹر میں درج ہے:

> سب سے پہلے جناب مولوی ضیاء اللہ صاحب نے حاضرین کے سامنے مولوی ممتاز علی صاحب کے استعفا کی درخواست کے سلسلہ میں اراکین مدرسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا موصوف مدرسہ رحمانیہ کی نشاۃ ثانیہ کے معمار اول ہیں، انہی کی جدوجہد اور سعی دوام کا نتیجہ ہے کہ مدرسہ یوماً فیوماً ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا جا رہا ہے، لیکن اب جبکہ مولانا نے استعفا دیدیا ہے اور ۳۱ر جولائی کے بعد وہ مدرسہ کو خیر آباد کہہ دیں گے تو ایسی صورت میں

میرا خیال ہے کہ ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جس کا پر ہونا مستقبل قریب میں
ناممکن ہی نہیں بلکہ محال نظر آتا ہے، لہٰذا میں اراکین مدرسہ سے عرض کر رہا
ہوں کہ وہ ان وجوہات کی تشریح کریں جن کی بناء پر مولانا مدرسہ چھوڑنے پر
مجبور ہوئے ہیں......اخیر میں مولانا نے قہر درویش بر جان درویش کے مقولہ
کے مطابق حاضرین کی التماس کو السکوت نیم رضا کے مطابق شرف قبولیت
سے نوازا۔ (کاروائی رجسٹر)

اسی طرح ۶۵ء کے اوائل میں مولانا نے اپنی علالت اور بینائی کی کمی کی وجہ سے صدر مدرسی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہا، مگر کمیٹی نے اسے کسی قیمت پر منظور نہیں کیا، بلکہ میٹنگ میں آپ کو معاون دینے کی بات طے ہوئی، اس میٹنگ کی روداد اس طرح ہے:

......کافی دیر تک بحث و مباحثہ ہوا، اور تمام اراکین نے بیک زبان کہا کہ آپ
کا اس عہدہ پر فائز رہنا از بس ضروری ہے، کیونکہ اگر آپ اس جلیل القدر
عہدہ سے سبکدوش ہو گئے تو مدرسہ کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور آئندہ
کا جو منصوبہ ہم لوگوں کے سامنے ہے اس کا پایہ تکمیل کو پہونچنا مشکل ہو
جائے گا۔ (کاروائی رجسٹر ۱۵، ص: ۷، تاریخ ۲۹/ مارچ ۶۵ء)

حاجی عبدالحق اور عبدالغفار بابو کی حیثیت مدرسہ کے سرپرست کی رہی ہے، ان حضرات نے ہمیشہ مدرسہ کی خدمت کی، مدرسہ سے تعلق رکھا اور اس کی ترقی کے لئے فکرمند رہے۔

مدرسہ کے ریکارڈ میں خاص طور پر دو حضرات کا ذکر بہت ملتا ہے، ان دونوں کی قربانیوں کے تذکرہ سے صفحات کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، ان دونوں کی کوششوں کا جس طرح تذکرہ ملتا ہے وہ ان کی للّٰہیت، خلوص اور مدرسہ کے تئیں جانثاری و فدائیت کا ایک پختہ ثبوت ہے، سچی بات یہ ہے کہ مدرسہ کی تاریخ ان کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی، قصبہ کے یہ عظیم سپوت ہیں سمیع الدین بابو اور محبّ الحسن بھولا بابو، ان دونوں حضرات نے ابتدائی دور میں مدرسہ کی باگ ڈور سنبھالی، دونوں ایک زمانہ تک سکریٹری رہے، مدرسہ کے لئے یہ دونوں حضرات کس

قدر اہم تھے، اس کا اندازہ کاروائی رپورٹ کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک بار جناب محبّ الحسن صاحبؒ نے سکریٹری کے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا، چنانچہ مدرسہ میں میٹنگ ہوئی، جس میں طے پایا کہ اراکین ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس جائیں اور آپ سے اس عہدہ کو نہ چھوڑنے کی منت سماجت کریں، چنانچہ یہ وفد ان کی خدمت میں پہونچا:

اولاً انہوں نے انکار کیا، لیکن بعد میں تمام حاضرین نے معذرت کی اور کہا کہ
کم از کم تین سال تک کے لئے اس ذمہ داری کو آپ ضرور قبول کریں، تاکہ
مدرسہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے، ناظم مدرسہ نے اراکین وفد کے التماس کو
شرف قبولیت سے نوازا......اور وفد کے اراکین خوشی خوشی اپنے گھر لوٹے۔
(کاروائی رجسٹر)

کچھ دنوں کے بعد آپ نے پھر اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذرت کر دی، اس میٹنگ کی کاروائی کے الفاظ:

اراکین مدرسہ نے بڑی ہی لجاجت کے ساتھ التماس کیا کہ مدرسہ کی نظامت
سے آپ علیحدہ نہ ہوں، ورنہ مدرسہ کے کاموں میں ایسی گڑبڑی ہوگی جس کی
تلافی مستقبل میں ناممکن ہوگی، ناظم مدرسہ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے مزید
توفیق دی، اور ممبران کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا، الحمد للہ علی
ذالک، مدرسہ کا ایک بڑا مسئلہ طے پا گیا۔ (کاروائی رجسٹر)

حاجی عبدالرؤف اور حاجی منیرالدین مدرسہ کے خاص معاونین میں سے تھے، ابتدائی دور میں ان حضرات کا تعاون مدرسہ کی ترقی میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

مدرسہ کے معاونین میں دو خواتین کا ذکر بیحد ضروری ہے، مدرسہ کی ترقی میں ان دونوں کی خدمات غیر معمولی اور مثالی ہیں، یہ ہیں مسماۃ زیب النساءؒ زوجہ شمشیر علی ادھیکاری اور مسماۃ حسن بانوؒ، مسماۃ زیب النساء کا نام اسلئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ قدیم مدرسہ کی زمین انہی کی

وقف کردہ ہے، اور جہاں تک دوسری مسماۃ کی خدمات کا تعلق ہے تو ان کے لئے ریکارڈ کا ایک جملہ ہی کافی ہے کہ

''مدرسہ کا آدھا خرچ مسماۃ صاحبہ کے تعاون سے پورا ہوتا ہے''

مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ مدرسہ کے معاونین اور منتظمین کی ایک طویل فہرست ہے، اسی طرح مدرسہ کی مجلس منتظمہ میں شامل افراد ہر دور میں مدرسہ کی حتی الامکان خدمت کرتے رہے ہیں، ان سب کی خدمات قابل قدر اور لائق صد ستائش ہیں، مدرسہ کے ریکارڈ میں ان میں سے اکثر کے اسمائے گرامی محفوظ ہیں۔

اہم اور مخلص اساتذہ کرام

مدرسہ کی ترقی میں ذمہ داران کے ساتھ یہاں کے اساتذہ کی محنت و لگن کا بڑا دخل ہے، بلکہ مدرسہ کی اصل رونق تو طلبہ اور اساتذہ ہی ہوتے ہیں، اس طویل مدت میں بہت سے اساتذہ نے یہاں تدریس و تربیت کی خدمت انجام دی، ان سب کی خدمات قابل تحسین اور قابل قدر ہیں، نہ صرف مدرسہ بلکہ پورا قصبہ اور علاقہ ان کے احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا، ان اساتذہ کی بڑی فہرست ہے، البتہ ان میں چند نام ایسے ہیں جو اپنی مخلصانہ محنت، لگن، علمی لیاقت کے لئے ہمیشہ معروف رہے، مولانا قاری صابر صاحبؒ، مولانا نظر الاسلام (سمستی پور) مولانا ہارونؒ (مظفر پور) مولانا یعقوب (سمستی پور) مولانا عبدالوہاب (دربھنگہ) مولانا محبّ رسول (دربھنگہ) مولانا احمد اللہ، حافظ مجیب الحسن، مولانا احمد اللہ، قاری داؤد، مولانا ظفر شبیر (یکہتہ) اور ماسٹر غلام صاحب (حاجی پور) انہی اساتذہ میں تھے، مدرسہ میں ان حضرات کی ایک حیثیت تھی، مولانا ہارون صاحب نے تدریس کے ساتھ علاقہ سے بدعات و ہندوانہ رسومات ختم کرنے کی بڑی جدوجہد کی، میلاد اور قیام کے موضوع پر ان کا ایک رسالہ بھی ہے، جو مدرسہ سے شائع ہوا تھا، ماسٹر غلام صاحب نے اپنی ذات کو مدرسہ میں گویا گم کر دیا تھا، وہ رسمی طور پر انگریزی کے استاذ تھے، مگر مدرسہ کے لئے ان کی فکرمندی بعض ذمہ داروں سے بھی زیادہ تھی، مدرسہ کے ریکارڈ میں ان کی بحالی کی تاریخ ۴؍اپریل ۶۰ء درج ہے۔

سالانہ جلسے اور اکابر علماء کی تشریف آوری

مدارس میں سالانہ جلسوں کی دیرینہ روایت رہی ہے، یہ سلسلہ یہاں بھی جاری رہا، اس طویل عرصہ میں متعدد جلسے ہوئے، کئی جلسے دستار بندی کے عنوان سے بھی ہوئے، ان جلسوں میں ملک کے اکابر علماء کی آمد ہوتی، مولانا منت اللہ رحمانیؒ متعدد باران جلسوں کی زینت بنے، مدرسہ کے ریکارڈ میں درج ہے کہ ۹؍اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مدرسہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا قریش صاحب کلکتہ نے شرکت کی۔

۱۹۸۸ء میں جدید عمارت کی سنگ بنیاد کا جلسہ ہوا، اس میں مولانا زکریاؒ کے خلیفہ مولانا منور حسینؒ شریک ہوئے اور اپنے دست مبارک سے عمارت کی پہلی اینٹ رکھی۔

اسی طرح مدرسہ کا سولہواں جلسہ بنام جلسہ سیرۃ النبی و دستار بندی ۱۷/۱۸ مئی ۲۰۰۱ء کو مدرسہ کے احاطہ میں منعقد ہوا، جس میں حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب دامت برکاتہم جلسہ کے رونق محفل تھے۔

ان کے علاوہ مولانا عثمانؒ، مولانا شمس الہدیٰؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ و دیگر شخصیات کی آمد ہوتی رہی ہے۔

سچر کمیٹی کنونشن

مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی صورت حال کے جائزہ کے لئے قائم جسٹس راجندر سچر کی رپورٹ جب منظر عام پر آئی تو پورے ملک میں ایک ہنگامہ سا وپا ہو گیا، ہر جگہ اس موضوع پر پروگرام منعقد ہوئے، سیمینار اور سمپوزیم ہوئے، اسی بیداری مہم کے تحت طے پایا کہ قصبہ میں بھی اس موضوع پر پروگرام منعقد کیا جائے، تا کہ اس کمیٹی کے مضمرات سے یہاں کے لوگ بھی واقف ہوں، چنانچہ ۶؍جون ۲۰۰۷ء اس موضوع پر مدرسہ رحمانیہ کے احاطہ میں ایک کنونشن منعقد ہوا، جس میں مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ناظم امارت شرعیہ، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت، علی اشرف فاطمی وزیر فروغ انسانی وسائل، ڈاکٹر شکیل احمد وزیر مواصلات، دیوندر پرساد یادو ایم پی کے علاوہ دیگر حضرات شریک ہوئے، اس پروگرام کے صدر استقبالیہ جناب

انیس احمد صاحب اور کنوینر مولانا وجیہ الحسن صاحب تھے، جبکہ مشتاق علی فہمی صاحب نے سرگرم رول ادا کیا تھا۔

اس پروگرام میں سیاسی لیڈران نے اس موضوع پر اظہار خیال کے ساتھ اپنی اپنی وزارت کی طرف سے بعض اعلانات بھی کئے جس میں فروغ انسانی وسائل کی طرف سے کمپوٹر سینٹر کا قیام اور وزیر مواصلات کی طرف سے بی ایس این ایل کا ٹاور خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ دونوں چیزیں گاؤں کو حاصل ہو چکی ہیں۔

کمپوٹر سینٹر کا قیام

سچر کمیٹی کنونشن کا سب سے بڑا فائدہ گاؤں کو فروغ انسانی وسائل کی طرف سے کمپوٹر سیکشن کی شکل میں ہوا، اشرف علی فاطمی صاحب نے اپنی وزارت کے تحت فروغ اردو کونسل کا ایک شعبہ مدرسہ میں قائم کرانے کی منظوری دی، پروگرام کے روح رواں مشتاق علی فہمی صاحب اپنی محنت اور لگن سے اس اعلان کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوئے اور مدرسہ میں یہ سنٹر قائم ہوا، جولائی ۲۰۰۸ء کو اس کا آغاز ہوا، اس کے انتظام کے لئے سات رکنی مانیٹرنگ کمیٹی بنائی گئی، اور مشتاق صاحب کو سنٹر انچارج مقرر کیا گیا۔

موجودہ وقت میں کمپوٹر کی کیا حیثیت ہے، اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، اس لحاظ سے یہ کمپوٹر سنٹر گاؤں کے لئے بہت بڑی چیز تھی، لیکن میرے خیال سے اس سے جس طرح فائدہ اٹھایا جانا چاہیے وہ نظر نہیں آرہا ہے، میری معلومات کے مطابق مسلم بچوں کا رجحان اس کی طرف نہیں ہے، وہیں دوسرے طلبہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، سینٹر کے استاد عزیزی محمد شارق کے مطابق اب تک اس کے چار بیچ نکل چکے ہیں، جس میں تقریباً سو سے زائد لڑکوں نے فائدہ اٹھایا۔

دارالقضاء کا قیام

مسلمانوں کے عائلی ومعاشرتی مسائل کے حل کے لئے دارالقضاء کا نظام ہے، جہاں عورتوں کے مسائل شریعت کی روشنی میں حل کئے جاتے ہیں، اس نظام کی ضرورت ہر مسلم

آبادی کو ہے، اس علاقہ میں ایسا کوئی نظام نہیں تھا جس کے ذریعہ مظلوم عورتوں کو انصاف ملے، اس ضرورت کا احساس حضرت مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب کو بخوبی تھا، کیونکہ آپ خود مسلمانوں کے ملی وسماجی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی فکر رکھتے تھے اور آپ سے جو ممکن ہوتا، کوشش بھی فرماتے تھے۔

مدرسہ کے ایک سالانہ جلسے کے موقعہ پر جب حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ یہاں تشریف لائے تو آپ نے ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، حضرت قاضی صاحب نے امارت شرعیہ پٹنہ کے تحت یہاں دارالقضاء قائم کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ مولانا ممتاز علی صاحب نے اس سلسلہ میں پیش رفت کرتے ہوئے امارت کے ذمہ داران سے رابطہ کیا اور پھر تین سو اہل علم کے دستخط سے مزین ایک درخواست بھی دارالقضاء کے قیام سے متعلق امارت کو روانہ کیا، اس کے بعد اس سلسلہ میں خاموشی رہی، اس دوران مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری جب بھی تشریف لاتے تو دارالقضاء کی ضرورت کا احساس دلاتے، ۲۳/جون ۲۰۰۱ء کی میٹنگ میں مدرسہ میں دارالقضاء کی قیام کے تجویز بھی موجود ہے، مگر اس سمت کسی قابل ذکر پیش رفت کی خبر نہیں ملتی ہے۔

۲۰۰۸ء میں راقم کے والد محترم حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، اس مناسبت سے میں پٹنہ حاضر ہوا، میرا قیام امارت میں ہی تھا، یہیں ایک ملاقات میں مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب ناظم امارت شرعیہ نے مجھے قصبہ میں قائم ہونے والے دارالقضاء کے سلسلہ میں متوجہ کیا، اور فرمایا کہ آپ لوگ کوشش کیجئے، آپ کے یہاں کے لئے دارالقضاء منظور ہے مگر کوئی کوشش نہیں ہورہی ہے، اس سال قصبہ کے تقریباً دس سے زائد افراد حج بیت اللہ کے لئے جا رہے تھے، چنانچہ ڈاکٹر عتیق صاحب کے مکان پر جمع ان عازمین بیت اللہ کی دعوت تھی میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت ناظم صاحب کی بات سنائی، حسن اتفاق کہ اس مجلس میں حضرت مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب بھی تشریف فرما تھے، میری بات سن کر سبھوں نے بھرپور تائید کی اور اس سلسلہ میں کوشش کرنے کی تائید کی۔

حج سے واپسی کے موقعہ پر ایک بار پھر امارت حاضری ہوئی، اس موقعہ پر ناظم امارت سے دوبارہ اس موضوع پر گفتگو ہوئی، میرے ایماء پر انہوں نے مدرسہ رحمانیہ کے اراکین کے نام ایک خط دیا، قصبہ پہونچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب کو اس کی اطلاع دی، پھر مدرسہ پہونچا اور پرنسپل صاحب کو خط حوالہ کیا، انہی دنوں مدرسہ کے مجلس منتظمہ کی نشست ہونے والی تھی، چنانچہ میٹنگ میں اس خط کی روشنی میں دارالقضاء کے قیام پر غور ہوا، دارالقضاء سبھوں کے دلوں کی دیرینہ آرزو تھی، چنانچہ مدرسہ کی طرف سے دارالقضاء کے قیام اور انتظام کے بارے میں امیر شریعت کو اطلاع دی گئی اور اس کے قیام کے اعلان کے لئے امیر شریعت کو یہاں تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔

پھر کیا تھا، امیر شریعت کے حکم سے ۲۲/اپریل ۲۰۰۸ء کو دارالقضاء کے افتتاح کے سلسلہ میں جلسہ عام کی تاریخ طے ہوئی، مدرسہ کے وسیع احاطے میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ناظم امارت شرعیہ، مولانا مفتی ثناء الہدی قاسمی نائب ناظم امارت، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد قاسم صاحب مظفرپوری اور دیگر علماء کرام زینت اسٹیج تھے، حضرت ناظم صاحب نے امیر شریعت کے حکم پر دارالقضاء کا اعلان فرمایا اور بحیثیت قاضی مولانا رضوان مظاہری کے سر پر دستار باندھی، یہ موقع بھی بڑا دلفریب تھا، اسٹیج پر جہاں علوم نبوت اور اسرار شریعت کے حاملین جمع تھے وہیں سامنے سامعین کا بڑا مجمع تھا، اطراف وجوانب کے علاوہ نیپال تک سے جمع ہوئے تھے، راقم کو بھی اس اہم اور تاریخی جلسہ میں شریک ہونے اور نظامت کی ذمہ داری ادا کرنے کی توفیق حاصل رہی۔

اسی وقت سے یہ دارالقضاء اپنے میدان میں سرگرم عمل اور اپنے مفوضہ کام کی انجام دہی میں مصروف ہے، یہ مرکزی دارالقضاء امارت شرعیہ کے تحت چلتا ہے، عملی انتظام مدرسہ رحمانیہ کے ذمہ ہے، مسلمانوں کی خاصی تعداد اپنے معاشرتی مسائل کو حل کرانے کے لئے اس کی طرف رجوع کر رہے ہیں، ہر سال تقریبا دس پندرہ کی تعداد میں مقدمات داخل ہوتے ہیں، اسی طرح اب تک ۷۰ مقدمات فیصل ہو چکے ہیں۔

برادرم مولانا قاضی رضوان مظاہری دارالقضاء کے ساتھ دارالافتاء کی ذمہ داری بھی سنبھال رہے ہیں، انہوں نے اس شعبہ کی بھی تجدید کی ہے، اب باضابطہ فتاوی کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے، ان کے آنے کے بعد اب تک جو فتاوی یہاں سے دئے گئے ہیں ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔

مشہور فارغین

اس طویل مدت میں ظاہر ہے مدرسہ سے بہت بڑی تعداد فیضاب ہوئی، جن میں بہت سے اپنے دور اور اپنے علاقہ میں مشہور ہوئے ہوں گے، خاص طور پر جن دنوں مدرسہ میں اونچے درجات تک کی تعلیم ہوتی تھی، اس دور کے فارغین مدرسہ کا سب سے بڑا سرمایہ بلکہ اس کی روحانی اولاد ہیں، ان سب کے بارے میں تفصیلات مشکل ہے، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے مدرسہ کے مشہور فارغین کی ایک فہرست دی ہے، میرے خیال سے اس میں اکثر نام آگئے ہیں، آپ اپنی یادداشت میں لکھواتے ہیں:

> مدرسہ کی ۴۴/سالہ مدت میں جہاں تک میرا خیال ہے اس کا اول دور ۵۰ء سے ۶۰ء تک کا دور نہایت ہی اچھا دور تھا، طلبہ کے اندر محنت کا جذبہ اور ذوق وشوق تھا، ان کے گارجین بھی بچوں کے تئیں پوری ذمہ داری سے اپنے فرائض نبھاتے تھے، اس دور کے بہت سے مدرسہ کے فارغین باحیات ہیں، مثلاً پروفیسر یسین، مولانا اسرافیل، مولوی یونس، مولوی ابوالحسن، مولوی محمد حسن، بھانپور کے مولوی ایوب، اس مدرسہ کے روشن چراغ ہیں، جو علم میں بھی استعداد رکھتے ہیں، اپنے مفوضہ اور بحسن الوجوہ انجام دے رہے ہیں، یکہتہ کے پروفیسر بدیع الزماں، پروفیسر توحید، بسہا کے محمد شفیع الرحمٰن شفیع مدرس اینگلو ہائی اسکول پٹنہ سیٹی، مولوی نور الہدی مرحوم، مولوی بدرالدین منیجر کینرا بینک، یہ سب مدرسہ رحمانیہ کے ابنائے قدیم ہیں۔
>
> (یادداشت)

ذمہ داران اور کمیٹی کے افراد

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کے ذریعہ ہی مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے، آپ نے ۱۹۴۶ء میں پہلی بار مدرس اول کی حیثیت سے تدریس کی ذمہ داری سنبھالی، دوبارہ ۵۰ء میں آئے اور کچھ عرصہ کے توقف کے ساتھ یہ سلسلہ ۱۹۹۲ء تک جاری رہا، ضابطہ کے لحاظ سے آپ ۱۹۹۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہورہے تھے، مگر نیشنل ایوارڈ ملنے کی وجہ سے ملازمت میں تین سال کی توسیع ہوئی، چنانچہ ۱۹۹۵ء میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے، اس پورے عرصہ میں آپ ہی پرنسپل رہے، اور مدرسہ سے متعلق تمام ذمہ داریوں کو جس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مولانا کے غائبانہ میں ۱۹۵۶ء میں کچھ عرصہ کے لئے مولانا قاری صابر قاسمیؒ مدرس اول بنائے گئے۔

۱۹۹۵ء میں مولانا محبّ الحسن صاحب پرنسپل بنے، آپ نے ۲۰۰۴ء تک اس عظیم ذمہ داری کو انجام دی، آپ کے بعد مولانا فیض الرحمٰن مظاہریؒ پرنسپل بنے، آپ نے یہ ذمہ داری یکم مارچ ۲۰۰۴ء کو سنبھالی، مشیت ایزدی سے آپ کو زیادہ موقعہ نہیں مل سکا اور اگست ۲۰۰۸ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

اس کے بعد مولانا قاری مطیع الرحمٰن قاسمی صاحب انچارج پرنسپل اور پھر پرنسپل بنے، اور اب تک آپ ہی اس عہدہ پر متمکن اور اس مسند کے مسند نشیں ہیں۔

صدر مدرس یا پرنسپل کے علاوہ مدرسہ کی ایک انتظامی کمیٹی بھی ہوتی ہے، یہاں ابتداء سے ہی انتظامی کمیٹی رہی ہے، جو قصبہ کے اہل علم، عمائدین اور اہل ثروت پر مشتمل ہوتی ہے، عموماً اس مجلس میں صدر، سکریٹری، اور ارکان ہوتے ہیں، کبھی کبھی نائب سکریٹری کا عہدہ بھی رہا ہے، بورڈ سے الحاق کے بعد اس کے ضابطہ کے مطابق ارکان کی تعداد متعین ہوگئی، یہ مجلس بورڈ سے منظور ہوتی ہے اور بااختیار ہوتی ہے، مدرسہ کے تمام انتظامی وتعلیمی امور اسی مجلس کی منظوری سے انجام پاتے ہیں، خصوصاً سکریٹری کو زیادہ اختیار حاصل ہوتا ہے، اس لحاظ سے

مدرسہ کے سکریٹری کی ہمیشہ ایک حیثیت رہی ہے۔

مدرسہ کا ریکارڈ ۱۹۵۲ء سے محفوظ ہے، کاروائی رجسٹر میں مجلس منتظمہ کے ارکان کی تفصیل عہد بہ عہد درج ہے، اس ریکارڈ کے مطابق درج ذیل افراد مجلس منتظمہ کے صدر، سکریٹری رہے ہیں۔

حاجی عبدالحق بابوؒ مدرسہ کے سرپرستوں میں تھے، مارچ ۶۳ء میں باضابطہ سکریٹری بنے، اور تقریباً ایک سال بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

عبدالغفار بابوؒ کا نام ۵۲ء کی کاروائی رجسٹر میں بحیثیت صدر لکھا ہے، ممکن ہے اس سے پہلے بھی آپ اس عہدہ پر فائز رہے ہوں۔

سمیع الدین بابوؒ کا نام بھی ۵۲ء کے ریکارڈ میں بحیثیت سکریٹری درج ہے، آپ سکریٹری کب بنے؟ اس کی وضاحت نہیں ہے، ۶۴ء تک آپ اس ذمہ داری کو سنبھالتے رہے، اس دوران آپ نے متعدد بار اس ذمہ داری سے معذرت کی، مگر بار بار اراکین اس عہدہ کو قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے۔

محبّ الحسن بھولا بابوؒ بھی ایک طویل عرصہ تک سکریٹری کی ذمہ داری سنبھالی، آپ ۵۴ء میں نائب ناظم یعنی نائب سکریٹری بنے، ۵۶ء میں سکریٹری بنے، اور ۶۴ء تک وقفہ وقفہ سے متعدد میعاد اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، آپ نے بھی اس دوران بار بار اس ذمہ داری سے معذرت کی، جس کی تفصیل آپ کے حالات زندگی میں مذکور ہے۔

محی الدین مسہور بابوؒ ۵۶ء میں صدر بنے اور ایک میعاد اس عہدہ پر فائز رہے۔

حافظ عبدالقدوسؒ ۵۶ء میں نائب ناظم یعنی نائب سکریٹری بنے، ۶۳ء میں بھی آپ نائب سکریٹری کی حیثیت سے کمیٹی میں موجود ہیں۔

انیس احمد صاحب ۶۶ء میں سکریٹری بنائے گئے، اور ۷۸ء تک اس عہدہ پر رہے، ۸۸ء میں پھر سکریٹری بنے۔

انصارالحق صاحب ۷۸ء میں سکریٹری بنے، یہ کمیٹی تحلیل ہوگئی، اس کے بعد جو کمیٹی بنی

اس میں آپ نائب سکریٹری منتخب ہوئے، ۸۳ء کی کمیٹی میں بھی آپ نائب سکریٹری کی حیثیت سے رہے ہیں۔

حبیب احمدؒ جون ۷۸ء میں کمیٹی کے صدر بنے، ۸۸ء میں دوبارہ اس کے صدر منتخب ہوئے اور معیاد مکمل کیا۔

پروفیسر بدیع الزماں صاحب جون ۷۸ء میں سکریٹری بنائے گئے، اور ۸۲ء تک اس عہدہ پر رہے، ۸۳ء میں آپ کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے، اس طرح دو معیاد آپ اس عہدہ پر فائز رہے۔

پروفیسر توحید صاحب ۸۳ء میں سکریٹری منتخب ہوئے اور ایک معیاد اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے۔

ماسٹر محمد طاہر صاحب ۲/اپریل ۱۹۹۹ء کی میٹنگ میں صدر منتخب ہوئے۔

مولانا وجیہ الحسن صاحب بھی اسی تاریخ کو سکریٹری منتخب ہوئے۔

۲۶/جنوری ۲۰۱۰ء کو مجلس منتظمہ کمیٹی کی تشکیل ہوئی، جس میں رضوان احمد مرشد کو صدر اور مطیع الرحمٰن ساحل کو سکریٹری منتخب کیا گیا، اس وقت یہی کمیٹی کام کر رہی ہے۔

رحمانیہ کی موجودہ صورتحال

۱۹۵۰ء میں مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، پرائمری اور حفظ کی تعلیم سے ترقی کرتے ہوئے فاضل تک تعلیم جا پہونچی، ۸۱ء میں عالمیت تک تعلیم تھی، اس کے بعد وسطانیہ تک تعلیم آ گئی، اور یہی صورت حال اب تک باقی ہے، حالانکہ اس دوران مدرسہ کے تحت بہت سی سرگرمیاں انجام پاتی رہیں جن سے مدرسہ کی زندگی محسوس ہوتی ہے، مثلا سالانہ جلسے، کمپیوٹر سنٹر کا قیام، دار القضاء کا قیام، اسی طرح مدرسہ کے نظام کی توسیع بھی ہوتی رہی مثلا بنات سیکشن کا قیام، اس کے لئے پانچ سالہ عالمہ کورس کا آغاز، تعمیراتی کام وغیرہ، مگر ان متعلق وغیر متعلق سرگرمیوں کے باوجود جو اس کی روح تھی یعنی تعلیم وہ جہاں تھی وہیں رہی، وسطانیہ دوم، سوم اور کبھی وسطانیہ اول بھی۔

دار الاقامہ کا نظام جس طرح پہلے قائم تھا وہ اسی طرح باقی ہے، جب تعلیم اعلی درجات

تک ہوتی تھی تو اسی سطح کے طلبہ رہتے تھے، اب تعلیم وسطانیہ تک ہے تو طلبہ تحتانیہ اور حفظ کے ہوتے ہیں، دار الاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد بھی خاصی کم ہے، کہا جاتا ہے کہ دار الاقامہ میں سو کے قریب بچوں کا داخلہ ہوتا ہے، مگر عملاً یہ تعداد پچیس پچاس کے آس پاس ہی ہوتی ہے۔

لڑکیوں کے لئے پانچ سالہ عالمہ کورس کا آغاز ہوا، تو ایسا محسوس ہوا کہ لڑکیوں کی تعلیم پر پوری توجہ دی جا رہی ہے، اور ان کی مکمل تعلیم یہیں ہو جایا کرے گی، مگر عملاً یہاں بھی وہی صورت حال ہے، عالمہ کے تین درجے قائم ہیں، یعنی عالمہ سوم تک تعلیم ہوتی ہے، اس کے آگے کا درجہ آج تک نہیں کھل سکا، حالانکہ عالمہ سوم میں طالبات کی تعداد آج بھی خاصی ہوتی ہے۔

حکومت کی طرف سے منظور شدہ اساتذہ کی تعداد ۱۳ ہے اور اسی قدر یعنی ۱۳ اساتذہ پرائیویٹ سے تدریسی خدمت انجام دیتے ہیں، اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد اطفال، وسطانیہ اور حفظ کے درجات میں کھپ جاتے ہیں، حالانکہ اس سے کم اساتذہ سے فاضل تک کی تعلیم ہوتی تھی۔

تعلیم کے علاوہ فراہمی مالیات پر پوری توجہ ہوتی ہے، گاؤں واطراف اور علاقہ میں ہر فصل میں فصلی چندہ، رمضان میں خاص طور پر ملک کے اکثر بڑے شہروں میں فراہمی مالیات مہم، گاؤں اور اطراف سے زکوۃ وصدقات اور چرم کی وصولی، یہ سب کچھ رجسٹر میں درج سو اور عملاً پچیس پچاس نادار طلبہ کے لئے کیا جاتا ہے، شوال تا شعبان ان طلبہ کے کھانے پر کتنا زیادہ خرچ آتا ہوگا کوئی بھی سمجھ سکتا ہے، پرائیویٹ اساتذہ کی تنخواہ پر صرف ہونے والے رقم وضع کرلیں تب بھی حساب سامنے ہے! (واضح رہے کہ مدرسہ کے اشتہار میں مدرسہ کا بجٹ چالیس لاکھ اور سالانہ آمدنی وخرچ کا گوشوارہ بھی اسی کے قریب ہے)

اسی طرح بورڈ کا امتحان بھی اس وقت سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار بنا ہوا ہے، کوشش اور پیروی کر کے سنٹر حاصل کئے جاتے ہیں اور پھر جس جس طرح اور جس جس انداز سے اسے کمانے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے وہ جگ ظاہر ہے، عالم اور فاضل کی ڈگری رکھنے والے مولوی صورت حضرات جس طرح حلال وحرام کی تمیز کے بغیر یہ سارا کاروبار چلاتے ہیں وہ اللہ کے یہاں کیا جواب دیں گے!!

تعلیمی انحطاط کے اسباب

مدرسہ تعلیم کے اعتبار سے ترقی کے عروج پر پہونچا اور جلد ہی زوال کا شکار ہوگیا، مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کے دور میں ہی یہ دونوں تاریخ رقم ہوئی، عروج کے بعد زوال ایک حقیقت ہے، عروج سدا بہار نہیں رہتا، مگر اتنی جلدی زوال کا واقع ہونا اور پھر اس زوال و انحطاط کو روکنے کی کسی مؤثر کوشش کا نہ ہونا ذہن میں بہت سے سوالات کو جنم دیتا ہے۔

مدرسہ کے منتظمین، معماران، اور معاونین کی قربانیاں قابل صد ستائش! ان کے اخلاص اور ان کے جذبات پر بھلا کون کم ظرف شک کرسکتا ہے؟ مگر حقیقت کی دنیا میں اس کے اسباب وعلل کی تلاش ضروری ہے، اسی احساس کے ساتھ راقم نے اس ناخوش گوار اور تلخ موضوع پر غور کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے اس کے درج ذیل چند اسباب نظر آتے ہیں:

الف: مولانا واقعی مدرسہ کے تعلق سے مخلص تھے، آپ نے شروع میں تعلیم پر توجہ دی، چنانچہ تعلیمی ترقی ہوئی، جب مدرسہ کو شہرت ملنے لگی، اور مالیات کی فراہمی میں آسانی ہوئی تو آپ نے تعمیر پر زیادہ توجہ دینا شروع کیا، جس کی وجہ سے تعمیراتی کام تو خوب ہوئے، مگر تعلیم کی طرف وہ توجہ باقی نہیں رہ سکی، جو پہلے تھی، نتیجتاً تعلیم میں گراوٹ راہ پانے لگی۔

ب: بہار کے مدارس درس نظامی کی طرز پر قائم اپنی اپنی خدمات میں مصروف تھے، یہ ادارے عوام کے خون پسینہ کی گاڑھی کمائی سے چلتے تھے، اور عوام کے سامنے خود کو جواب دہ سمجھتے تھے، حکومت بہار نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے نام پر مدارس کے الحاق اور اساتذہ کو حکومت کی طرف سے تنخواہیں دینے کا سنہرا اور بڑا پرکشش پروگرام پیش کیا، جس نے چند لوگوں کا بھلا ضرور کیا مگر تعلیم کا جنازہ نکال دیا، اس وقت ملت کے چند خدا ترس اور بصیرت رکھنے والے بزرگوں نے نوشتہ دیوار کو پڑھتے ہوئے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر ان کی بات سنی اَن سنی کردی گئی، چنانچہ یکے بعد دیگرے بہار کے اکثر مدارس اس حسین دام تزویر میں آتے گئے، اور اپنا وقار کھوتے گئے۔

بورڈ کی طرف سے چھوٹ ملنے لگی تو طلبہ کے ذہن سے محنت کا شوق ختم ہوگیا، گھر بیٹھے

جب لوگوں کو ڈگریاں ملنے لگیں تو پڑھنے اور پڑھانے کی کیا ضرورت تھی، اس طرح تعلیم سے طلبہ اور اساتذہ دونوں کی توجہ ہٹتی چلی گئی، بہار کے بہت سے مدارس جہاں معیاری تعلیم ہوتی تھی اور جو اعلیٰ تعلیم کے لئے مشہور تھے، فاضل سے فوقانیہ، پھر وسطانیہ اور پھر تحتانیہ تک جا پہونچے، اب نتیجہ سامنے ہے، اور سر کی آنکھ سے دیکھ کر بھی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ چند بزرگوں کا الحاق سے روکنا مفید تھا یا نہیں؟

ج: یوپی کے آزاد مدارس کا شہرہ جب یہاں کے قصبات اور دیہاتوں تک پہونچا اور بڑے درجات کے طلبہ اس کا رخ کرنے لگے تو ان کے ساتھ ثانوی درجات کے طلبہ بھی جانے لگے، علاقہ کے مدارس میں تعلیم کی کمی تھی ہی، یوپی کے مدارس کی کشش نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی، اب حال یہ ہوا کہ عربی کے پہلے درجہ کی تعلیم کے لئے بھی طلبہ گاؤں کے مدرسہ میں رکنے کو تیار نہیں ہیں۔

د۔ بورڈ سے ملحق مدارس میں مدرسہ کے ذمہ دار کے ساتھ ایک منتظمہ کمیٹی بھی ہوتی ہے، جو با اختیار اور مدرسہ کی تمام سرگرمیوں میں دخیل ہوتی ہے، ان کے فیصلے ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، یہ عوام کی طرف سے منتخب ہوتی ہے، اب اگر مدرسہ کے ذمہ دار اور کمیٹی کے ارکان کے تصورات اور رجحانات میں تفاوت ہے تو مدرسہ کا نظام چلنا مشکل ہوجاتا ہے، کیونکہ بہت ممکن ہے کہ صدر مدرس جس کام کو تعلیم کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہو، کمیٹی کے ارکان اسے اتنا ضروری نہ سمجھیں، اس طرح بعض فیصلے مدرسہ کے رخ کو متعین کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، یہاں بھی اس طرح کا تفاوت محسوس ہوتا ہے، مدرسہ کے ریکارڈ میں کئی مواقع پر کمیٹی کی تحلیل، تجاویز میں بار بار تبدیلی جیسی باتیں ملتی ہیں، جو اس تفاوت کی غماز ہیں، ممکن ہے دیگر اسباب کے ساتھ یہ سبب بھی رحمانیہ کے زوال میں کارفرما رہا ہو۔

مجھے بظاہر یہی اسباب نظر آتے ہیں، دیگر مدارس کے ساتھ مدرسہ رحمانیہ کو بھی یہی صورت حال پیش آئی ہوگی، میں نے اپنے اس ذہنی الجھن کو مدارس کی تاریخ سے واقف اور ان طوفانوں سے گزری ہوئی بزرگ شخصیت، مخدوم ومحترم مولانا محمد قاسم مظفر پوری دامت

برکاتہم کے سامنے رکھا، تو مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں یوں گرہ کشائی فرمائی:

آپ نے اپنے مکتوب کے ذریعہ دو باتوں کے بارے میں استفسار کیا ہے، جن دونوں کا تعلق مخدوم العلماء حضرت مولانا ممتاز علی صاحب مظاہری کی ذات سے ہے، آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ مدرسہ رحمانیہ یکہتہ کو حضرت مولانا موصوف کے زمانہ میں تعلیمی معیار کے لحاظ سے بڑی ترقی ہوئی، اور پھر مولانا کی میعاد پوری ہونے سے پہلے ہی تعلیمی انحطاط شروع ہوگیا، آخر اس کے کیا اسباب رونما ہوئے؟

اس سلسلہ میں مجھ سے زیادہ آپ اہل علم وقلم کا تجزیہ زیادہ موزوں ہوگا، بہر حال چند عوامل کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں، جسے حقیقت حال کہا جائے۔

ا۔ملحقہ مدارس میں دو طرح کے تعلیمی ادارے بہار میں ہیں، ایک وہ جو بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے قیام سے پہلے قائم کئے گئے، جن کا مقصد درس نظامی کے منہج تعلیم وتربیت کو فروغ دینا تھا، اور الحمدللہ مدرسہ رحمانیہ یکہتہ، مدرسہ رحمانیہ سوپول، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ احمدیہ سلفیہ وغیرہ ان درس گاہوں نے ایک طویل مدت تک اسی درس نظامی کے منہج کو اپنا نصب العین سمجھا۔

بعد میں دوسرے ایسے مدارس قائم کئے گئے کہ ان کا مقصد مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے الحاق اور اس کے نصاب تعلیم کی ترویج اور بورڈ کے ذریعہ ملنے والی سہولتوں کا حصول تھا، اس دوسری قسم کی درسگاہوں کا جال بچھا دیا گیا، اور پھر معاشی نقطۂ نظر کی بناء پر نااہل کی تقرریاں ہونے لگیں، جن میں زیادہ قصور ادارہ کے اراکین کا رہا، چنانچہ اس سے کچھ معاشی فائدہ تو ضرور ہوا مگر تعلیم کی روح نکلتی گئی۔

۲۔ادھر ہر ملحق مدرسہ نے فوقانیہ، مولوی، عالم، فاضل کے درجات کی منظوری حاصل کرلی، اور اس معیار کو باقی رکھنے کے لئے امتحانات کے دائرہ

کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی مہم شروع کی گئی، اور جنہوں نے مدرسہ میں تعلیم حاصل بھی نہیں کی وہ بھی شریک امتحان کئے جانے لگے، بلکہ آسانی کے ساتھ ایسے طلبہ کو اعلیٰ نمبرات دئے جانے لگے، نتیجۃً ملحقہ مدارس میں پڑھنے والے طلبہ احساس کمتری کے شکار ہوگئے، اور انہوں نے آزاد مدارس کا رخ کیا۔

اس طرح ان ملحقہ مدارس کے ذریعہ بہار کے قابل قدر اداروں میں تعلیمی انحطاط شروع ہوا، باوجودیکہ ان قدیم مدارس کے اکابر نے اس سیل رواں کو روکنے کی سعی بھی کی، مگر مقامی قرب وجوار کے دباؤ کی بناء پر وہ کامیاب نہ ہوسکے، بالآخر ان قدیم مدارس کا تعلیمی نظام بھی بتدریج زوال پذیر ہوگیا۔

(مکتوب بنام راقم الحروف)

مولانا نے اشارے اشارے میں بہت سی باتیں کہہ دی ہیں، آپ نے جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، اسے آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا، کہ آپ نے سمندر میں رہ کر موجوں کا مقابلہ کیا ہے، محض ساحل کے تماشائی نہیں رہے۔

شاید یہ باتیں بعض لوگوں کے لئے بار خاطر ہو، اور گرانی کا سبب بنے، مگر اسے کیا کہے کہ حقیقت کچھ اسی طرح ہے، مولانا نے جس کو سیل رواں سے تعبیر کیا ہے، واقعی وہ سیل رواں تھا، اس کو روکنے کی پوری کوشش نہیں کی گئی، اس سمت ہمیں کسی مؤثر کوشش کا پتہ نہیں چلتا، اور نہ ہی کارروائی رجسٹر میں اس طرح کی کسی کوشش کا ذکر ہے، اگر مان بھی لیا جائے کہ حالات کے دباؤ میں ہوا کے رخ پر بہنا پڑا، تو بعد میں جب نتائج سامنے آگئے اور بلند وبالا عمارتیں ابابیلوں کا گھونسلہ بننے لگیں تو پھر ملت کے قائدین نے دوبارہ اس میں روح پھونکنے کی کوشش کیوں نہیں کی، صحیح بات یہ ہے کہ ہم تعلیم کے تئیں سنجیدہ نہیں ہیں، قوم کے لئے مخلص نہیں ہیں، ہماری ساری تگ ودو دراصل اپنے لئے اور اپنے مفاد کے لئے ہوتا ہے، اگر ملت کا مفاد مقدم ہوتا، اور اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کا مزاج ہوتا تو شاید ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

اسلئے اس حوالہ سے سب سے اہم بات یہی ہے کہ قصبہ اور اطراف کے اہل علم اور اہل

فکر ونظر نے اپنی ذمہ داری ادانہیں کی، سب یہ سوچ کر مطمئن رہے کہ مدرسہ کا معاملہ اس کے ذمہ دار جانیں، لیکن غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اس جرم میں مدرسہ کے ذمہ داران اور قصبہ کے اہل علم دونوں برابر درجہ کے شریک ہیں، ایک نے ذمہ داری سے کوتاہی کی تو دوسرے نے بھی احتساب کا فرض ادانہیں کیا، مدرسہ کی ترقی کی ذمہ داری جہاں پرنسپل، اساتذہ اور کمیٹی کی ہے وہیں خواص بھی بالواسطہ اس کے ذمہ دار ہیں، کیا ہم اس اجتماعی ذمہ داری کو ذمہ داری سمجھتے ہیں!

مدرسہ اسلامیہ طوفانپور

دینی تعلیم مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلم آبادی میں ہمیں تعلیم کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور ملتا ہے، مدارس کے قیام سے پہلے سے یہ سلسلہ جاری رہا ہے، مدرسہ یا مکتب کے باضابطہ نظم سے پہلے صاحب ثروت حضرات اپنے دروازے پر معلم رکھ کر تعلیم دلاتے تھے، جہاں مخصوص گھروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے، اس کے بعد جب تعلیمی شعور مزید عام ہوا تو مکتب کا وجود ہونے لگتا ہے، یہی تاریخ مدرسہ اسلامیہ کی بھی ہے، مولانا جمیل صاحب کے بقول تقریباً ۱۹۲۷ء میں مسجد سے متصل ایک مکتب کا قیام عمل میں آیا، جس میں چھوٹے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی، یہاں صرف ایک معلم رہا کرتے تھے، حافظ داؤد صاحب کے والد محترم حافظ مسلمؒ نے ایک زمانہ تک اس مکتب کو آباد رکھا، وہ میانجی کہلاتے تھے، مولانا احمد حسین مظاہری صاحب نے اپنے بچپن میں ابتدائی تعلیم اور دس پارہ حفظ انہی کے پاس کیا، اس وقت مکتب کی حالت مستحکم نہیں تھی، اساتذہ آتے جاتے رہتے تھے، کبھی کبھی مکتب بند بھی ہو جاتا تھا، تقریباً ۱۹۵۱ء میں جب جناب حافظ مجیب الحسنؒ اس مکتب کے معلم مقرر ہوئے، تو باضابطہ یہاں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، حافظ صاحبؒ کا وجود گاؤں میں تعلیمی فروغ کے لئے بہت اہم ثابت ہوا، آپ کے ذریعہ نہ صرف تعلیم کا رجحان عام ہوا بلکہ بڑی تعداد میں طلبہ نے حفظ کی تعلیم مکمل کی اور آپ کے مشورہ سے آگے کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آج گاؤں کے اکثر حفاظ اور علماء آپ کی تربیت کے ہی رہین منت ہیں، مثلاً مولانا فیض

الرحمٰن مظاہریؒ، مولانا احمد حسین مظاہری، مولانا جمیل احمد، قاری منظور الحق، حافظ بشیر الدین، حافظ مطیع الرحمٰن، حافظ اختر حسن، وغیرہ جو اس وقت نئی نسل کے رہبر ہیں، آپ سے شاگردی کا رشتہ رکھتے ہیں، اس لحاظ سے حافظ صاحبؒ طوفانپور کے عظیم محسن کہلانے کے مستحق ہیں، اور یہ سب کچھ دراصل آپ کے اخلاص، تعلیم کے تئیں سچی لگن، ہمدردی اور محنت کا نتیجہ تھا، ۱۹۵۷ء تک آپ کی خدمات گاؤں کو حاصل رہیں۔

آپ کے جانے کے بعد کچھ عرصہ تک تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، پھر مکتب شروع کیا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ حکومت کی طرف سے جبری تعلیم کا قانون بنا، جس کے نتیجہ میں گاؤں کے باشعور لوگوں کو تعلیمی ادارہ کے لئے سوچنا پڑا، کیونکہ اسکول میں تعلیم دلانا لازم ہو چکا تھا، اور گاؤں کے اطراف میں بھی کوئی اردو اسکول نہیں تھا، جہاں مسلمان اپنے بچوں کو بھیج سکتے، اس موقعہ پر تعلیم کے لئے فکر کرنے والوں میں جناب عبدالحفیظ بابوؒ، عبدالوحید بابوؒ، اختر جمیلؒ اور گاؤں کے دیگر ہوشمند حضرات پیش پیش تھے، یہ حضرات باہمی مشورہ سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ مکتب کو بہار مدرسہ بورڈ سے الحاق کرالیا جائے، تاکہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہے، اس فیصلہ کے بعد کسی ایسے عالم کی ضرورت محسوس ہوئی جو مدرسہ کا انتظام وانصرام دیکھ سکے، اس وقت سبھوں کی نظر گاؤں ہی کے عالم دین مولانا ابوالحسنؒ پر پڑی، جو اس وقت پورنیہ کے کسی علاقہ میں مڈل اسکول میں مدرس تھے، چنانچہ مولانا کو وہاں سے بلایا گیا، اور الحاق کی ذمہ داری سونپی گئی، یہ سن ۱۹۶۱ء کی بات ہے، اس مکتب کا نام ''مدرسہ اسلامیہ طوفانپور'' طے ہوا، مولانا اس کے صدر مدرس بنائے گئے، عبدالحفیظؒ صدر اور اختر جمیلؒ سکریٹری بنے۔

ابتدائی اساتذہ میں حافظ اختر حسن صاحب (موجودہ استاد مدرسہ رحمانیہ) حافظ عیسیٰ، حافظ شبیر، اور حافظ داؤدؒ وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا ابوالحسن صاحب نے جناب مولانا ممتاز علی مظاہری پرنسپل مدرسہ رحمانیہ کے تعاون سے مدرسہ کا الحاق بہار مدرسہ بورڈ سے کرایا، اور مدرسہ کے تعلیمی امور کو انجام دینے لگے، ۱۹۷۴ء میں مدرسہ کو فوقانیہ کی منظوری حاصل ہوئی، مولانا تاحیات بحیثیت صدر مدرس

تدریسی وانتظامی خدمات انجام دیتے رہے۔

۱۹۶۹ء میں مولانا احمد حسین مظاہری مدرسہ کے نئے صدر مدرس مقرر ہوئے، مولانا ابوالحسن کی طرح مولانا احمد حسین مظاہری صاحب نے بھی مدرسہ کی ترقی میں دلچسپی لی، اور تعلیمی ترقی کی فکر کی، چنانچہ ان کی محنت سے مولانا ابوالحسن صاحب کا سینچا ہوا پودا ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا، اور بہت جلد نئے برگ وبار آنے لگے۔

۲۰۰۳ء میں مولانا احمد حسین مظاہری بھی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے، ان کے بعد مولانا جمیل احمد صاحب صدر مدرس بنے، جنوری ۲۰۱۰ء کو مولانا بھی سبکدوش ہوگئے، اس کے بعد سے اب تک یہ عہدہ خالی ہے، ماسٹر بشیر الدین صاحب جو'بی اے سی' کے نام سے معروف ہیں، اس وقت انچارج صدر مدرس ہیں۔

مدرسہ فوقانیہ تک منظور ہے، مولانا احمد حسین مظاہری کے بقول چند سالوں تک فوقانیہ تک باضابطہ تعلیم بھی ہوئی، راقم الحروف نے اپنے بچپن میں آٹھویں کلاس (وسطانیہ چہارم) تک تعلیم دیکھی ہے، اس ناچیز کو بھی یہاں سے خوشہ چینی کی سعادت حاصل رہی ہے، اس وقت بورڈ سے ملحق مدارس میں تعلیم کی حالت اتنی بری نہیں تھی، جتنی بعد کو ہوئی، مدرسہ میں باضابطہ تعلیم ہوتی تھی، وسطانیہ چہارم کے بعد مزید تعلیم کے لئے طلبہ دیگر مدارس یا اسکول کا رخ کرتے تھے، اس وقت کے اساتذہ میں مولانا احمد حسین مظاہری، مولانا جمیل احمد، حافظ داؤدؒ، ماسٹر بشیر الدین، ماسٹر سمیع الزماں، ماسٹر نسیم صاحب، قاری علاء الدین، ماسٹر متھلیشور سنگھ وغیرہ کے نام ذہن میں اب بھی یاد ہیں۔

الغرض گاؤں میں جو تعلیمی بیداری آئی، تعلیم کی طرف رجحان عام ہوا، اور بڑی تعداد میں حفاظ، علماء اور عصری تعلیم والے تیار ہوئے، یہ سب مدرسہ کا ہی فیض ہے، یہ انہی اساتذہ کی تربیت اور محنت کا نتیجہ ہے، گاؤں کا ہر گھر بلکہ ہر فرد مدرسہ اور وہاں کے بوریہ نشیں اساتذہ کے احسان سے زیر بار ہے، کوئی اس احسان سے انکار نہیں کرسکتا، ہمیں منت کش ہونا چاہیے اپنے محسنوں کا، کہ اس احسان کا بدلہ آسان نہیں، سلام ہو ان نفوس قدسیہ پر! جن کی زندگیاں نئی

نسل کو الف باء سکھانے اور ننھی منھی انگلیوں میں قلم دینے کے لئے وقف ہیں، جنہوں نے دال روٹی پر قناعت کرلی مگر اپنے فرض سے سودا نہیں کیا، ظاہر پرستوں کی طعن وتشنیع کے باوجود علم کی شمعیں روشن کرتے رہے کہ ان کا شیوہ تو یہی ہے کہ ؎

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے رہو چراغ
رستے میں دوست یا کسی دشمن کا گھر ملے

مدرسہ کے پہلے صدر عبدالوحیدؒ اور پہلے سکریٹری اختر جمیلؒ ہوئے، عبدالوحیدؒ کے بعد حاجی قمرالزماں صاحب کو صدر بنایا گیا، کچھ دنوں کے بعد اختر جمیل صاحب صدر بنے اور قمرالزماں صاحب سکریٹری، اختر جمیلؒ تاحیات صدر رہے، ان کے بعد شعیب صاحب صدر منتخب ہوئے اور حاجی قمرالزماں صاحب بدستور سکریٹری باقی رہے، اب تک یہی سلسلہ ہے۔

مدرسہ فیض العلوم بشنپور

بشنپور پہلے ایک بڑا گاؤں ہوا کرتا تھا، اب اس کی آبادی سمٹ چکی ہے، اس آبادی سے متصل طوفان پور ہے جہاں مدرسہ اسلامیہ واقع ہے، جس سے بشنپور کی تعلیمی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے، اک زمانہ میں بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ یہاں ایک مدرسہ ہونا چاہیے، چنانچہ ۸۰ء سے قبل مدرسہ کی بنیاد پڑی، جس کا نام فیض العلوم رکھا گیا، ۸۱ء میں اس کا الحاق مدرسہ اکزامینیشن بورڈ پٹنہ ہوا، اس میں چار پانچ سال تک باضابطہ تعلیم ہوتی رہی، اس دوران یہاں سے وسطانیہ کے امتحان کا فارم بھی بھرا جاتا رہا۔

اس مدرسہ کے قیام میں مولوی رضا احمد، مولوی وحدت حسین، راجو اور مظہر الاسلام خاص طور پر سرگرم تھے، یہی حضرات اس کے نامزد اساتذہ تھے، ان لوگوں نے بڑی محنت کی اور مدرسہ کو اپنے طور پر کئی سالوں تک چلاتے رہے، لیکن بورڈ سے ایڈ نہ ملنے کی وجہ سے اس کا وجود باقی نہ رہ سکا، ادھر سال گذشتہ ۲۰۱۱ء جب الحاق شدہ مدارس کو ایڈ دینے کا اعلان ہوا تو اس مدرسہ کے ذمہ داران نے بھی مدرسہ کو دوبارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک بار پھر اپنی محنت سے مدرسہ کا ڈھانچہ کھڑا کردیا، جو آج بھی حکومت کی راہ دیکھ رہا ہے!

مدرسہ دارالعلوم معینیہ مہراجپور

مہراج پور میں تعلیمی بیداری دیر سے آئی، اس گاؤں کے متعدد افراد نے تقریباً تیس چالیس سال قبل ہی درس نظامی کی تکمیل کی، لیکن عمومی طور پر تعلیم کی طرف توجہ زیادہ نہیں رہی، مکتب ہر زمانہ میں قائم رہا، مگر اس کے بعد کی تعلیم کے لئے کوشش نہیں ہوئی، یہاں مدرسہ قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا؟ اس کے بارے میں صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ اس کے سب سے بڑے محرک مولانا عبدالغفار قاسمیؒ اور عبدالحنانؒ تھے، ان دونوں حضرات نے ہی اس طرف پہلے پہل توجہ دی، اور خاندان و گاؤں کے لوگوں کی ذہن سازی کی، ان حضرات نے ۸۰ء، ۸۲ء میں مدرسہ معینیہ کے نام سے ایک مدرسہ بورڈ سے منظور کرانے کی کوشش کی، جو ۸۷ء میں منظور ہوئی، مگر اب تک یہ مدرسہ کی شکل میں وجود میں نہیں آسکا، اور مکتب کا سلسلہ ہی قائم تھا۔

معینیہ کو مدرسہ کی شکل دینے یا اس نام سے ایک مدرسہ قائم کرنے کا سہرا حافظ سمیع الدین صاحب کے سر ہے، جنہوں نے اپنی جدوجہد کے ذریعہ مولانا عبدالغفار قاسمی اور دیگر لوگوں کے اس خواب کو عملی شکل دینے میں کامیابی حاصل کی، چنانچہ انہوں نے گاؤں میں جاری مکاتب کو ختم کر کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، ۱۹۹۴ء میں اس سرزمین پر ایک عظیم الشان جلسہ کیا، جس میں مولانا منور حسینؒ کے خلیفہ مولانا امام الدین صاحب، مولانا ادریس صاحب، مولانا قاسم صاحب مظفر پوری اور علاقہ کے دیگر علماء شریک ہوئے، گاؤں کی ایک شریف النفس شخصیت جناب معین الدینؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس ادارہ کا نام معینیہ رکھا گیا، چونکہ مدرسہ معینیہ بہار بورڈ سے منظور تھا، اس لئے فرق کرتے ہوئے دارالعلوم کا اضافہ کیا گیا، اب یہ مدرسہ دارالعلوم معینیہ ہے۔

مدرسہ کے قیام اور سنگ بنیاد کی تقریب میں حافظ سمیع الدین صاحب نے غیر معمولی کردار ادا کیا، ان کی اس خدمت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے، ابتداء کے چند سالوں میں اچھی تعلیم ہوئی، ابتدائی تعلیم کے ساتھ حفظ کے درجات تھے، دارالاقامہ میں طلبہ رہتے تھے، کچھ ہی عرصہ بعد حافظ سمیع الدین صاحب یہاں سے چلے گئے، ان کے جاتے ہی تعلیمی معیار میں کمی

آ گئی، تقریباً ۲۰۰۰ء تک پرائمری کے ساتھ حفظ کی تعلیم بھی ہوتی رہی، اور بہت سے حفاظ یہاں سے تیار ہوئے، اس کے بعد سے صرف پرائمری کی تعلیم باقی ہے۔

قیام سے لے کر اب تک متعدد حضرات نے مدرسہ کی ذمہ داری سنبھالی، اس وقت الحاج مرتضی صاحب اس کے سکریٹری ہیں۔

مدرسہ اصلاحیہ تعلیم نسواں

اس مدرسہ کا قیام ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا، قائم کرنے والوں میں ماسٹر سعید احمد شاکر، قاری ضمیر الدین، حافظ ہاشم اور مولوی بلال کے نام سرفہرست ہیں، ۱۹۸۷ء میں اس کا تعلیمی الحاق مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے ہوا، اس مدرسہ کے قیام کا مقصد گاؤں کی لڑکیوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا تھا، اس وقت لڑکیاں مدرسہ رحمانیہ ہی میں پڑھتی تھیں، لہٰذا ضرورت تھی کہ لڑکیوں کے لئے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے، شاید یہی مقاصد ہوں گے مدرسہ کے بانیین کے ذہن میں، لیکن اسے سرکاری اعانت حاصل نہیں ہوسکی، یہاں کے اساتذہ کی تنخواہ حکومت نے منظور نہیں کیا جس کے نتیجہ میں یہ مدرسہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکا، قابل ستائش ہیں جناب ماسٹر سعید احمد شاکر اور ان کے متعلقین جو اپنے تعاون اور محنت سے مدرسہ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، حکومت سے ایڈ نہ ملنے کے باوجود یہاں مکتب کی سطح تک تعلیم مسلسل ہو رہی ہے۔

ادھر حکومت سے تعاون ملنے کی کچھ امید جاگی ہے، یہ لوگ بھی سراپا انتظار بنے ہوئے ہیں، خدا اس مدرسہ کی زندگی کے لئے سبیل پیدا فرمائے!

مدرسہ ریاض العلوم کسمار

۱۹۹۴ء میں اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا، یہ حافظ نثار احمد، مولانا انور صاحب اور سلطان صاحب وغیرہ کی کوششوں کا ثمرہ ہے، فی الوقت پرائمری سطح تک تعلیم ہوتی ہے، چند سال پہلے مولانا انور صاحب اس مدرسہ کے لئے بڑے سرگرم عمل تھے، مگر شاید حالات نے یاوری نہیں کی یا مطلوبہ وسائل نہیں مل سکے جس کی وجہ سے اس کی ترقی کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

معہد البنات یعقوبیہ

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم جب مدرسہ رحمانیہ سے سبکدوش ہوئے تو امیر شریعت مولانا نظام الدین صاحب اور مولانا قاسم مظفر پوری وغیرہ حضرات نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ گاؤں میں لڑکیوں کی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کریں، چنانچہ ان اکابرین کے مشورہ پر آپ نے اس کبر سنی کے باوجود ایک بار پھر میدان میں قدم رکھا اور ’’معہد البنات یعقوبیہ‘‘ کے نام سے ادارہ قائم کیا، جسے اپنے محسن چچا قاری یعقوبؒ کے نام منسوب کیا، آپ نے اپنے گھر کے قریب اپنی ایک زمین وقف کی، اور پھر اسی میں ۱۹۹۶ء میں مدرسہ کا باضابطہ آغاز ہوا۔

مدرسہ کے آغاز کے وقت تعارف پر مشتمل ایک پمفلٹ تقسیم کیا گیا تھا، جس میں مدرسہ کے قیام کے اسباب اور مقاصد کی وضاحت تھی، میرے سامنے وہ تحریر تو نہیں ہے، البتہ مولانا محمد قاسم مظفر پوری صاحب کا ایک خط میرے پاس ہے، جس میں انہوں نے اس مدرسہ کے قیام کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> آپ نے دوسرا سوال یہ کیا ہے کہ مدرسہ رحمانیہ یکہتہ میں بنات کی تعلیم کا نظام قائم تھا تو پھر معہد البنات کے قیام کی کیا ضرورت تھی؟
>
> اس سلسلہ میں یہ ایک حقیقت ہے کہ جن آبادیوں میں مکاتب قرآنیہ اور مدارس عربیہ قائم ہیں، وہاں تعلیم البنات کا بھی ذیلی شعبہ موجود ہے، اور بقدر ضرورت تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، یہ سلسلہ یکہتہ میں اور بھی قدیم ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسے مثالی تعلیمی وتربیتی ادارہ کا قیام عمل میں آئے جہاں لڑکیوں کو مختصر مدتی کورس کے ذریعہ عربی زبان اور ایک کامل نصاب کی تعلیم دی جائے، اور ساتھ ہی انہیں سلائی کڑھائی وغیرہ جیسے ہنر سے بھی مزین کرادیا جائے، یہ ادارہ ایسا مثالی ہو کہ اسی منہج پر دوسرے ادارے بھی مختلف علاقوں میں قائم کئے جائیں، تاکہ لڑکیوں میں دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ اسلامی شعور جاگے اور مسلم

> معاشرہ میں توہمات اور بدعقیدگی کی جو راہیں ہیں وہ مسدود ہوسکیں، ان ہی منصوبوں کے تحت معہد البنات کا قیام عمل میں آیا...... بہر حال یکہتہ کی طویل وعریض آبادی کی تمام بچیوں کے لئے رحمانیہ کا ایک بڑا حصہ بھی ناکافی ہوگا، اس آبادی کا ہر خیر علاقہ میں پہونچا ہے، اور یہ قندیل بھی اسی لئے جلائی گئی ہے۔ (مکتوب بنام راقم الحروف)

ہر ادارہ کی طرح یہ ادارہ بھی چھوٹی سطح سے شروع ہوا، دھیرے دھیرے تعلیم میں ترقی ہوتی گئی، ابتدائی تعلیم تک بچے اور بچیاں دونوں شریک ہیں، آگے صرف بچیوں کی تعلیم ہوتی ہے، اس وقت وہاں کے نصاب کے اعتبار سے عربی سوم (الفقہ المیسر) تک تعلیم ہورہی ہے، مدرسہ کی عمارت بن چکی ہے، جو کئی کمروں پر مشتمل ہے، گذشتہ سال سلائی سنٹر کا افتتاح ہوا تھا، چنانچہ اب طالبات کے لئے سلائی سیکھنے کا بھی نظم ہے۔

اس مدرسہ کے قیام کو تقریباً پندرہ سال سے زائد عرصہ ہوچکا ہے، مگر عربی سوم کے بعد آگے کے درجات اب تک قائم نہیں ہوسکے ہیں، جس کی وجہ سے پوری تعلیم نہیں مل پارہی ہے، جو بچیاں ادارہ سے فارغ ہوچکی ہیں وہ ابتدائی تعلیم کی حامل ہیں، اس طرح دیکھا جائے تو مدرسہ ہنوز اپنی منزل سے دور ہے، اور جن مقاصد کی تکمیل کے لئے ادارہ کا قیام ہوا تھا وہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔

مولانا دامت برکاتہم خود تعلیم کی نگرانی کرتے ہیں، مولانا احمد حسین مظاہری بحیثیت صدر مدرس خدمت انجام دے رہے ہیں، جبکہ مولانا سید نظام الدین صاحب، مولانا ولی رحمانی اور مولانا محمد قاسم مظفر پوری صاحب مدرسہ کے سرپرست ہیں۔

مکاتب کا نظام

یہ بھی اس قصبہ کے امتیازات میں سے ہے کہ یہاں تقریباً ہر محلّہ کا اپنا مکتب ہے، جہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہے، اس کا نظام محلّہ کے افراد ہی دیکھتے ہیں، اور ماہانہ تعاون سے اساتذہ کی تنخواہ دی جاتی ہے، قصبہ کے علاوہ مضافاتی بستیوں میں بھی یہی نظام ہے، ان

مکاتب میں تعلیم اور نظام ہر جگہ جدا جدا ہے، تمام طلبہ و طالبات کی تعلیم ایک ساتھ ہوتی ہے، کلاس کی تقسیم نہیں ہوتی، اسی طرح کتابیں بھی مختص نہیں ہیں، بچہ کی عمر کی صلاحیت کے لحاظ سے کوئی بھی کتاب پڑھائی جاسکتی ہے، عموماً ہر مکتب میں ایک یا دو استاد ہوتے ہیں، بعض مکاتب میں اس سے زائد اساتذہ بھی ہیں، کلمہ سے لیکر قرآن شریف ناظرہ، اردو، ہندی اور ابتدائی حساب کی تعلیم ہوتی ہے۔

یہ مکاتب تعلیم کے لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ ایک نوخیز بچہ کے ذہن میں سب سے پہلے مذہب کی بنیادی باتیں یہیں ڈالی جاتی ہیں، ان کے سادہ اور صاف ذہن کی تختی پر سب سے پہلا حرف یہیں ابھرتا ہے، اس لحاظ سے ان کے لئے اچھے اساتذہ کا نظم ہونا چاہیے، بلکہ اساتذہ کی جگہ اتالیق اور مربی ہونا چاہیے جو حکمت کے ساتھ بچوں کے ذہنی سانچہ کو اسلامی سانچہ میں ڈھالے، لیکن عموما ان مکاتب کے لئے حافظ یا کم پڑھے لکھے شخص کو متعین کیا جاتا ہے، اس صورت حال پر توجہ کی ضرورت ہے۔

یہ مکاتب انتظامی اور تعلیمی دونوں اعتبار سے آزاد ہیں، مکتب کی تعلیم کے بعد جو طالب علم جس مدرسہ میں چاہے داخلہ لے، اگر ان مکاتب کو اس طرح منظّم کر دیا جائے کہ وہ ایک مدرسہ سے مربوط ہوں، جو ان کی تعلیمی نگرانی بھی کرے اور جو طلبہ یہاں کی تعلیم مکمل کرلے وہ اس مدرسہ میں داخل ہو، اس طرح یہ مکاتب چھوٹی ندیوں کی شکل میں ایک بڑی ندی میں شامل ہوجائے، تو ان مکاتب کی افادیت بہت بڑھ جائے گی، امارت شرعیہ نے مکاتب کو جوڑنے کا جو نظام بنایا ہے، وہ بہتر بھی ہے اور قابل تقلید بھی، اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

مساجد کا نظام

مکاتب کی طرح مساجد کا بھی نظام ہے، قصبہ درجن بھر چھوٹے بڑے محلوں میں بٹا ہوا ہے، اور تقریبا ہر محلّہ کی اپنی مسجد ہے، اس طرح یہاں ایک درجن سے زائد مساجد ہیں، مضافات کے گاؤں میں چونکہ آبادی اتنی زیادہ نہیں ہے، اس لئے وہاں ہر گاؤں میں ایک ایک مسجد ہے، ان تمام مساجد کا نظام محلّہ کے افراد ہی دیکھتے ہیں، ان مساجد میں جامع

مسجد امتیازی شان رکھتی ہے، یہ اپنی پرشکوہ عمارت اور بلند و بالا اذان خانہ کی وجہ سے بھی ممتاز ہے، جو دور سے یہاں کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ جامع مسجد بہت قدیم ہے، پرانی تعمیر ۱۲۸۱ھ میں ہوئی، اور موجودہ تعمیر ۱۹۶۵ء مطابق ۱۹ محرم ۱۳۸۵ء میں مکمل ہوئی، اس طرح موجودہ تعمیر کو بھی نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے، اس مسجد کی دیکھ ریکھ زمانہ تک حاجی عبدالحق صاحب اور ان کے اہل خانہ کرتے رہے ہیں، ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب، سمیع الدین بابو وغیرہ نے اس کی تعمیر میں بڑا سرگرم حصہ لیا تھا، ڈاکٹر صاحب تاحیات امامت و انتظام کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، حافظ مجیب الحسن صاحبؒ، قاری مطیع الرحمٰن جلالیؒ اور مولانا قاری مطیع الرحمٰن قاسمی وغیرہ حضرات نے طویل عرصہ تک اس کے منبر و محراب کو اپنی تلاوت و خطابت سے آباد رکھا ہے۔

عصری وادبی دانشگاہیں

مڈل اسکول

مڈل اسکول کا قیام ۱۹۳۴ء میں عمل میں آیا، گاؤں کے لئے یہ شفیع صاحبؒ کا وہ انمول تحفہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، ڈسٹرک بورڈ کے وائس چیرمینی کے دور میں انہوں نے اپنے علاقہ کے لئے دو چیزیں حکومت سے منظور کرائیں، مڈل اسکول جو گاؤں میں قائم ہوا، اور اسپتال جو گاؤں سے چند کیلومیٹر فاصلہ پر سسوار کو ملا، اس زمانہ میں مڈل اسکول کی بڑی حیثیت تھی، اور کئی پنچایتوں میں ایک مڈل اسکول ہوا کرتا تھا، یہ اردو یونٹ تھا، اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر جناب عقیل صاحب بنائے گئے، انہوں نے اس اسکول کو اپنی محنت اور جذبہ سے خوب خوب ترقی دی، ان کے زمانہ میں تعلیم کا یہ حال تھا کہ علاقہ میں اس کی شہرت تھی، اس زمانہ کے اکثر عصری تعلیم یافتہ حضرات اسی اسکول کے فیض یافتہ ہیں، گاؤں اور علاقہ کو اس اسکول سے بڑا فائدہ پہونچا، علاقہ کی تعلیمی ترقی میں اس اسکول کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

گاؤں کے جو طلبہ گاؤں میں رہ کر ہی عصری تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے اب تک یہی واحد ادارہ ہے، یہاں سے تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد مختلف ہائی اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں، اس طرح اسکول کا فیض ہر گھر میں پہونچا، اب تک یہ اسکول اپنی زندگی کے ۷۵ سے زائد بہاریں دیکھ چکا ہے، اس دوران نہ جانے کتنی بڑی تعداد نے اس چشمہ حیواں سے اپنی علمی تشنگی بجھائی، اور کتنے اس کی وجہ سے ترقی کے بلند منازل تک پہونچے، اسکول کے پاس شاید اس کا کوئی ریکارڈ نہ ہو، اور اسے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ یہاں ساقی کی طرف سے اذن عام ہے۔

اس اسکول کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اس کے قیام کو ۷۵ سے زائد سال ہو چکے، مگر اتنا

قدیم مڈل اسکول اب تک اپنی اسی منزل میں ہے، ہائی اسکول کی سطح کو نہیں پہونچ سکا، اسلئے گاؤں کے اہل دانش اسے ہائی اسکول بنانے کے لئے فکر مند تھے، وزیر اعلی نتیش کمار کی آمد سے اہالیان یکہتہ کا یہ خواب پورا ہونے والا ہے، وزیر اعلی نے اسے ہائی اسکول کے ساتھ انٹر کالج کی منظوری کا اعلان کیا، اس سلسلہ میں کوششیں ہو رہی ہیں، خدا کرے ہائی اسکول کا خواب جلد شرمندہ تعبیر ہو، اور مڈل اسکول کی طرح انٹر کالج بھی نیک نام رہے، اور تعلیمی فروغ میں تاریخی کردار ادا کرے!

گورمنٹ گرلس پرائمری اسکول

حافظ نور صاحبؒ اپنے دور کے معروف لوگوں میں تھے، انہیں لڑکیوں کی تعلیم کی بڑی فکر تھی، انہوں نے ہی اس اسکول کو شروع کیا، جو ۴۵ء میں حکومت سے منظور ہوا، اس اسکول کے بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ شفیع بیرسٹرؒ کے زمانہ میں ان کی کوششوں سے یہ قائم ہوا، حافظ نورؒ اس میں بطور ٹیچر بحال ہوئے، بہر حال حافظ نور صاحب یہاں کی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں مصروف رہے، یہ اسکول اب بھی قائم ہے، اور اپنی اسی منزل میں ہے، یہاں پرائمری سطح تک بچوں کی تعلیم ہوتی ہے، اگر اس اسکول کو بھی ترقی دیجاتی اور اسے کم از کم ہائی اسکول سطح کا کیا جاتا تو گاؤں کی بچیاں مخلوط تعلیم کے اثرات سے بچ جاتیں!

شفیع اردو لائبریری

علم کی روشنی میں جب انسان کا ذہنی افق بلند ہوتا ہے، فکر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے مطالعہ کا سہارا لیتا ہے، جب وہ انسانوں کے ہجوم سے اکتانے لگتا ہے تو کتابوں کے درمیان خود کو گم کر کے نئی لذت سے آشنا ہوتا ہے، یہی شعور ان کو لائبریری تک پہونچاتا ہے۔

قصبہ میں چونکہ علم وادب کی روایت پرانی رہی ہے، اس لئے لائبریری کی تاریخ بھی پرانی ہے، کہا جاتا ہے کہ کثیر الکلام شاعر جناب مضمحل صاحب نے اس طرف سب سے پہلے

توجہ کی، انہوں نے بزم ادب کے نام سے ایک لائبریری کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں گلشن ادب اور پھر شفیع اردو لائبریری سے موسوم ہوئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ گلشن ادب کے نام سے ۵۲ء کے آس پاس ایک لائبریری کا قیام عمل میں آیا، جس کے روح رواں وجیہ الحسن صاحب تھے، اور جناب انصار الحق برجستہ، عبد الغفار بابو، مولانا ظفر شبیر، محمد عقیل عاقل، ڈاکٹر منظور احمد شمسی، مولانا ممتاز علی مظاہری، حاجی منیر الدین، ڈاکٹر عبدالقدوس اور اس وقت کے دیگر اہل علم اس کے سرگرم کارکنان تھے، یہ وہ حضرات ہیں جن کا علم وادب اور بطور خاص شاعری سے خاص تعلق تھا، اس لائبریری کے پہلے صدر عبدالغفار بابو اور سرپرست حاجی عبدالحقؒ بنائے گئے۔

اس لائبریری کا وجود گلشن ادب لائبریری کے نام سے ہوا، یہ بات یقینی ہے، خود راقم نے بعض کتابوں پر گلشن ادب کی مہر بھی دیکھی ہے، البتہ یہ بات کہ لائبریری کا پہلا نام 'بزم ادب' تھا، بعد میں گلشن ادب کے نام سے اسی کی توسیع ہوئی، اس کے شواہد نہیں مل سکے، بہر حال گلشن ادب کے نام سے یہ لائبریری موجود رہی، اور شفیع صاحب کے انتقال کے بعد انہی کی طرف موسوم کرتے ہوئے اس کا نام شفیع اردو لائبریری رکھا گیا۔

پہلے یہ وجیہ الحسن صاحب کے گھر پر تھی، بعد میں مسماۃ حسن بانو کے دروازہ پر منتقل ہوئی، اس کے بعد عبدالحق صاحب نے اس کی مستقل عمارت تعمیر کرائی، پھر اس کی تعمیر نو ہوئی۔

اک زمانہ میں گورمنٹ سنہا لائبریری پٹنہ موزیم پٹنہ سے اس کا الحاق کرایا گیا تھا، جہاں سے کتابیں آتی تھیں، اس میں بڑی تعداد میں کتابیں تھیں، کہا جاتا ہے کہ بہت سی اہم اور نادر کتابیں لائبریری کی زینت تھیں، راقم نے بچپن میں اس میں افسانہ اور ناول کی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں، مگر افسوس کہ یہ علمی سرمایہ بے توجہی اور ناقدری کے بھینٹ چڑھ گیا، اور اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں، اسے بے توجہی کے بجائے علم دشمنی سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے!!

اس میں کوئی شک نہیں کہ لائبریری کے قائم کرنے والوں نے بہت کچھ سوچ کر اسے

قائم کیا ہوگا، ان کے سامنے بہت سے مقاصد ہوں گے، یہ علمی وادبی یادگار جہاں ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کی گواہ ہے وہیں ہماری بدذوقی پر بھی ماتم کناں ہے، اس درمیان متعدد بار لائبریری کو پھر سے سنوارنے کی کوششیں بھی ہوئیں، ہماری قوم کے حوصلہ مندوں نے اپنی خدمات بھی پیش کیں، ان کی توجہ اور محنت سے لائبریری کی گرد تو صاف ہوگئی مگر لوگوں کے ذہنوں پر لگی دبیز گرد کو صاف کرنا ان کے بس میں نہ تھا، اس کو آباد کرنا اہل علم کی ذمہ داری ہے، اور لائبریری آج بھی ان حوصلہ مندوں کی راہ دیکھ رہی ہے!!

شفیع میموریل کلب

پروفیسر سلطان صاحب بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں شفیع اردو لائبریری کے تحت شفیع میموریل کلب بھی بنایا گیا تھا، جس میں مختلف کھیل کے سامان تھے، اسی کے تحت کھٹونہ سے ایک بار میچ بھی ہوا، بیڈمنٹن اور کیرم وغیرہ کے میچ بھی ہوتے تھے، اس کلب کی سرگرمیاں زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکیں۔

چلڈرن پبلک اسکول

۷۴ـ۷۵ء میں یہ اسکول قائم ہوا، اس کے روح رواں جناب شبیر احمد زخمی صاحب تھے، یہ قصبہ میں قائم ہونے والا پہلا انگلش میڈیم اسکول تھا، اس کی زندگی زیادہ لمبی ثابت نہ ہوئی، چند سالوں تک ہی اس کا وجود باقی رہا، لیکن اس کی وجہ سے عصری تعلیم کی طرف بڑی رغبت بڑھی، اس اسکول کے طلبہ جہاں بھی گئے ممتاز سمجھے گئے۔

یہ اسکول کیوں بند ہوا؟ اس کے اسباب نہیں معلوم، خود بانی محترم سے میں نے یہ سوال کیا، انہوں نے اسکول بند ہونے کا بنیادی سبب اپنی ملازمت کو قرار دیا، مگر اس موضوع پر ان کی زبان حال بہت کچھ کہہ رہی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گاؤں میں اس اسکول کی وجہ سے بڑی کشمکش پیدا ہوگئی تھی، اسے مدرسہ کے خلاف ایک تعلیمی محاذ سمجھا جانے لگا، بعض لوگوں نے اسے اسلام مخالف اور بے پردگی اور انگریزی تہذیب سکھانے والا ادارہ بھی قرار دیا، بہر حال

اسباب جو بھی ہوں، اگر یہ اور دوسرے عصری اسکول باقی رہتے تو تعلیمی بیداری میں غیر معمولی فرق واقع ہوتا، اور آج تعلیم کا تناسب کہیں زیادہ ہوتا!

سنٹرل پوائنٹ اسکول

۱۹۹۲ء میں ایک بار پھر اس سرزمین پر انگلش میڈیم اسکول کا قیام عمل میں آیا، امتیاز احمد راجو نامی ایک باصلاحیت اور حوصلہ مند نوجوان نے بڑی امیدوں اور مضبوط ارادوں کے ساتھ اس کی شروعات کی، امتیاز صاحب پہلے مذکورہ چلڈرن پبلک اسکول میں شامل تھے، ۱۷ر اکتوبر ۹۲ء کو سرسید کے یوم پیدائش کے موقعہ پر انہوں نے اپنا اسکول شروع کیا، اسکول کا ایک جامع نظام بنایا جس کا بنیادی مقصد یہ تھا دینی روح کے ساتھ انگریزی تعلیم دی جائے، یہ مکمل انگلش میڈیم اسکول تھا، صبح کے وقت قرآن کی تعلیم کا بھی اہتمام تھا۔

جناب امتیاز صاحب نے اپنی شبانہ روز محنت اور مؤثر و پرکشش انداز گفتگو کے ذریعہ پورے قصبہ میں تعلیم کی ایک نئی لہر پیدا کردی، کم وقت میں اس اسکول نے ایک شناخت قائم کرلی، معیاری تعلیم اور مناسب انتظام نے سبھوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی، اس طرح چند سال کی محنت و لگن کے بعد طلبہ میں شعور اور عزم و حوصلہ کے بال و پر نکلنے شروع ہوئے تھے ہی کہ یہ بھی صیاد کے دام تزویر میں آگیا، اپنوں اور بیگانوں کی سازشوں کا شکار ہوا، اور بالآخر ۹۵ء میں حاسدین کی بھینٹ چڑھ گیا ع

یہ پھول بھی اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا

جناب امتیاز صاحب اسکول بند ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے اسکول کے ساتھ سماجی کاموں اور قصبہ کے دیگر مسائل میں بھی دلچسپی لینی شروع کردی تھی، جس کے نتیجہ میں ایک طبقہ ان کا مخالف ہوگیا، اور ایک انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی، اس کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے تن تنہا اسکول کی شروعات کی اور اس کے قیام و ترقی میں اپنی پوری توانائی صرف کرتے رہے، جس کی وجہ سے مخالفت کی آندھی میں وہ یکتا و تنہا پڑ گئے، اور اس طرح محنت و لگن سے لگایا ہوا یہ پودا اپنے ابتدائی دور میں ہی مرجھا کر رہ گیا۔

ممکن ہے بعض لوگ مجھے رجائیت کا طعنہ دیں، یا تعلیم کے تئیں بے جا حساسیت کا شکار بتائیں، مگر میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں! مصلحت پسند افراد یہ کیوں نہیں بتاتے کہ جب ایک آباد چمن کو ویران کرنا ہی مصلحت قوم و ملت ٹھہرا تو اس کو آگ دکھانے سے پہلے دوسرا چمن کیوں نہیں بسایا گیا؟ تاریخ جہاں یہ دیکھتی ہے کہ اسکول بند ہونے کے کیا اسباب تھے، وہیں وہ اس پر بھی نظر رکھتی ہے کہ اس کے بند ہونے سے کیا نقصانات ہوئے، اور اگر وہ جاری رہتا تو اس کے کیا ثمرات مرتب ہوتے، آخر کیا بات ہے کہ ہماری یادداشت کے مطابق تین انگلش میڈیم اسکول یکے بعد دیگرے قائم ہوئے، مگر آج ایک بھی باقی نہیں ہے، کیا واقعی قوم کو اس طرح کے اسکول کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہے تو فلاں کیوں، اور فلاں کیسے؟ کا جاہلی تصور ہمارے ذہنوں سے کب ختم ہوگا!!

وہ بہت کچھ دے سکتے تھے، بہت کچھ کرسکتے تھے، اگر ان کی تعلیمی کوششیں جاری رہتیں تو آج ہم اور ہماری نئی نسل کہاں ہوتی، سوچ سکتے ہیں، مگر آہ! ہماری بیمار ذہنیت، اور مفاد پرست سیاست! جن کی قربان گاہ پر بہت سی چیزیں بھینٹ چڑھ چکی ہیں، یا چڑھائی جاچکی ہیں، امتیاز احمد راجو نے اپنے خون اور پسینے سے سینچا ہوا اسکول کھویا، مگر گاؤں والوں نے تو بہت کچھ کھودیا، اسکول بند ہونے سے امتیاز صاحب کے حوصلہ اور عزم کو جھٹکا لگا، اور ان کے بڑھتے قدم رک گئے، مگر نئی نسل کا مستقبل تو تباہ ہوگیا، ان کے حوصلے تو ہمیشہ کے لئے پست ہوگئے، یہ نقصان کس کا ہوا؟ عاقبت نااندیش اور بصیرت سے محروم آنکھوں کو بھلا یہ سب کیسے نظر آئے گا!!!

شفیع اکیڈمی

۹۳ء میں شفیع اکیڈمی کے نام سے ایک اور انگلش میڈیم اسکول کا آغاز ہوا، جسے کھٹونہ کے دنیش کمار نامی ایک نوجوان نے جناب نیاز احمد صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا تھا، تقریباً ایک سال بعد اشفاق صاحب اس کے پرنسپل بنے، اس میں بھی نرسری سے آٹھویں تک کی تعلیم ہوتی تھی، دو یا تین سال کے بعد یہ اسکول بھی بند ہوگیا، بند ہونے کی ایک خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے اکثر اساتذہ کو سرکاری ملازمت مل گئی، اس لئے دھیرے دھیرے

اساتذہ نکلتے گئے، اور بالآخر اسکول کو بند کرنا پڑا۔

بزم حسنات

قصبہ میں عورتوں کی پہلی دینی وادبی انجمن بزم حسنات کے نام سے ۱۹۵۸ء کے آس پاس قائم ہوئی، اس کی روح رواں محترمہ صابرہ خاتون تھی، جو شفیع صاحبؒ کی چھوٹی صاحبزادی اور ڈاکٹر محمد فاروق صاحب کی زوجہ تھیں، محترمہ جماعت اسلامی تحریک سے وابستہ اور اس کی متحرک کارکن تھیں، جماعت کی سرگرمیوں میں شریک رہتی، اور جماعت کی ہدایت کے مطابق اپنے حلقہ کی عورتوں میں کام کرتیں، اس انجمن کے تحت باضابطہ ہفتہ واری پروگرام ہوتے تھے، اس کی اپنی چھوٹی سی لائبریری بھی تھی، جس میں متعدد اردو میگزین جاری تھے، پروفیسر سلطان احمد صاحب کے مطابق اس لائبریری میں ہزاروں کتابیں تھیں، اس کا سالانہ پروگرام عموماً بڑی سطح پر ہوا کرتا تھا، اس کی سرگرمیاں تقریبا بیس پچیس سالوں تک جاری رہیں، خواتین ہر ہفتہ اپنے مطالعہ کی روداد سناتی تھیں، اس انجمن کے ذریعہ عورتوں میں بڑی بیداری آئی، اور ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا۔

جناب نیاز احمد صاحب بتاتے ہیں کہ 'بزم حسنات' کو ڈاکٹر فاروق صاحب کی پوری سرپرستی حاصل تھی، آپ کے مالی تعاون اور سرپرستی سے اس کا فروغ ہوا، صدیقہ خاتون اس کی سکریٹری اور ضیاء اللہ صاحبؒ نگراں تھے، اس کے ہفتہ واری پروگرام میں قصبہ کے علاوہ بسا اوقات راج پور، مہراجپور، بشنپورا اور طوفانپور کی خواتین بھی شریک ہوتی تھیں، جس سے تہذیب و تمدن اور اسلامی ثقافت کی کونپلیں نئی نسل میں پھوٹنے لگیں، اس بزم میں صابرہ خاتون کے ساتھ قصبہ کی متعدد خواتین سرگرم تھیں جن میں نعیمہ خاتون، محمودہ خاتون، شاہدہ خاتون، وجیہ النساء، شمیمہ خاتون اور مریم (بنت حافظ صدیق) قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر فاروق صاحب کی وفات (۱۹۷۳ء) کے ساتھ ہی یہ چراغ مدھم ہوتا چلا گیا، اور آخر کار گل ہوگیا، البتہ یہ ضرورت آج بھی باقی ہے، آج بھی مسماۃ حسن بانوؒ جیسی مخیرؒ اور ام الفاطمہؒ و صابرہ خاتونؒ جیسی فکر مند اور حوصلہ مند خواتین کی راہ دیکھ رہا ہے ہمارا معاشرہ۔

صدیقی لائبریری

حافظ صدیقؒ اپنے دور کے مشہور حفاظ میں سے تھے، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب نے انہیں مدرسہ رحمانیہ کے معاونین خاص میں شمار کیا ہے، انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر پوری توجہ دی، شاید یہ ان کی دعائے نیم شبی کا نتیجہ تھا کہ ان کے بڑے صاحبزادے محبّ اللہ 'منشی محبّ اللہ' سے 'صوفی محبّ اللہ' بنے، اور پھر ان کے فرزندان سب کے سب حامل قرآن ہوئے، آپ کے بڑے صاحبزادے مظفر صدیقی علمی ذوق رکھتے ہیں، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور پھر کتابوں کے بڑے شوقین ہیں، پڑھنے کے بھی اور جمع کرنے کے بھی، میرے خیال میں ان کے پاس علمی موضوعات پر جتنی کتابیں مل جائیں گی شاید قصبہ اور اطراف میں کسی کے پاس ملے، انہوں نے اپنے اس علمی وادبی سرمایہ کو اپنے دادا کی طرف منسوب کرتے ہوئے 'صدیقی لائبریری' سے موسوم کیا ہے، ابھی یہ عوامی لائبریری کی شکل میں نہیں آئی ہے، مگر یہاں کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہے، علمی اور ادبی ہر طرح کی کتابوں کی تعداد ہزاروں میں ہے، جوان برادران کے علمی ذوق وشوق کا منھ بولتا ثبوت ہے، کیا اہل ثروت اس سرمایہ کی حفاظت اور اس کی افادیت کو دوچند کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے!

زین العابدین میموریل لائبریری

ممکن ہے صدیقی لائبریری کی طرح اس لائبریری کا نام بھی بعض لوگ پہلی بار سنیں، اور انہیں یہ نام نامانوس لگے، مگر علم کے شائقین کے پاس اس طرح کی دولت کوئی انوکھی بات نہیں، بہر حال اس لائبریری کی روداد کچھ اس طرح ہے کہ جب میں اپنے تعلیمی سلسلہ کو مکمل کرتا ہوا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وسیع تعلیمی وعلمی دانشگاہ پہونچا، اور یہاں علم وادب کی جلوہ گری دیکھی تو احساس ہوا کہ ہمارے گاؤں میں بھی ایک چھوٹی لائبریری ہونی چاہیے، اسی جذبہ سے گھر میں موجود پرانی کتابوں کو جمع کیا، کہ ہم تمام بھائی بہنوں کی باضابطہ تعلیم کی وجہ سے بہت سی کتابیں جمع ہوگئی تھیں، ساتھ ہی خالو محترم مولانا عبدالغفار قاسمیؒ کے پاس بھی ان کی ذاتی

کتابیں اور پھران کے صاحبزادگان کی درسی وغیر درسی کتابیں بہت سی تھیں، جب یہ سارا سرمایہ اکٹھا ہوا تو کتابوں کا ایک چھوٹا ذخیرہ بن گیا، راقم نے مختلف چھٹیوں میں اس کی فہرست بنائی اور فن وار تقسیم کر کے لائبریری کی شکل دی، اور اپنے نانا محترم جناب زین العابدین صاحبؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس کا نام 'زین العابدین میموریل لائبریری' رکھا، نام کی نسبت سے نانا کی صاحبزادیوں اور ان کے نواسوں (یعنی خالاؤں اور خالہ زاد بھائیوں) سے اس لائبریری کی ترقی کی لئے متعدد بار باتیں ہوئیں، بہت سے خاکے بھی بنے، مگران خاکوں میں رنگ نہیں بھرا جاسکا، اور لائبریری اپنی ترقی کے لئے محسنوں کی راہ دیکھتی رہی، محدود دائرہ میں اس لائبریری سے استفادہ کا سلسلہ جاری ہے، کتابیں پڑھی جارہی ہیں، خدا کرے اس کا بھی مناسب انتظام ہوجائے۔

تحریکیں، تنظیمیں

تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں

مولانا محمد الیاسؒ نے دعوت وتبلیغ کا جونہج شروع کیا، وہ ان کے اخلاص کی برکت سے بہت جلد چہار دانگ عالم میں پھیل گیا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس تحریک کی آواز سنی گئی، ملک کا کوئی قصبہ اور کوئی بستی ایسی نہیں رہی جہاں یہ آواز نہ پہونچی ہو، اس جماعت سے جو فائدہ پہونچا اور جس طرح بہت بڑی تعداد نے دین سیکھا اور آج جو فائدے ہورہے ہیں اس کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہوگا۔

اس علاقہ میں کس کے ذریعہ لوگ اس تبلیغی تحریک سے واقف ہوئے اور پہلی جماعت کب یہاں آئی ؟ اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی ہے، البتہ ماضی بعید میں ہمیں مختلف افراد کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ان کا تبلیغ سے تعلق تھا اور وہ جماعت میں جایا کرتے تھے، دھیرے دھیرے یہاں بھی تبلیغ کا کام بڑھا اور ہر زمانہ میں معتد بہ افراد اس کام سے جڑتے رہے، اور یوں قصبہ اور علاقہ میں تبلیغ کا کام پھیلتا رہا۔

اس کام میں زیادہ تیزی اس وقت آئی جب ۸۸ء میں قصبہ کو علاقہ کا تبلیغی مرکز بنایا گیا، اس مناسبت سے علاقائی سطح کا پہلا اجتماع منعقد ہوا، جس میں پٹنہ مرکز سے بطور خاص ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ تشریف لائے، ان کے علاوہ اور بھی شخصیات تھیں، جن میں بھوپال کے ایک بڑے ذمہ دار بھی شامل تھے، وہ اجتماع کیا تھا لوگوں کا ایک جم غفیر، راقم نے اپنے بچپن میں حیرت کی آنکھوں سے اس مجمع کو دیکھا، اس وقت کی دھندلی دھندلی تصویریں یادداشت میں اب بھی محفوظ ہیں۔

مرکز بننے کے بعد کام میں وسعت آئی اور تنظیم بھی، اس کے بعد ایک عرصہ تک تبلیغی کوششوں میں بڑا زور رہا، لوگوں میں اس کا خوب خوب چرچہ تھا، قصبہ اور اطراف کے بہت سے لوگوں نے وقت لگائے، چلے اور چار چلے بھی، بہت سے لوگ اس کام سے جڑے اور آج بھی جڑے ہوئے ہیں، پرانے لوگوں میں بہت سے نام ایسے ہیں جنہیں اس جماعت کی وجہ سے ایک شناخت ملی، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو علاقہ میں امیر جماعت کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، بہر حال یہ کام آج بھی جاری ہے، اور بندگان خدا کو اس سے بڑا فائدہ پہونچ رہا ہے، اور عام لوگوں میں جو دینداری آئی ہے وہ محض اسی کام کی برکت ہے۔

جماعت اسلامی تحریک کی بعض سرگرمیاں

قصبہ میں جماعت اسلامی بہت زیادہ متعارف کبھی نہیں رہی، جس کی وجہ سے یہاں اس کی سرگرمیاں بھی جاری نہیں ہوئیں، میرے ناقص خیال میں جناب ضیاء اللہ صاحبؒ پہلے شخص ہیں جن کی وابستگی اس تحریک سے رہی، ۵۵ء کے آس پاس آپ جماعت کے رکن رہے۔

جناب ضیاء اللہ صاحب جماعت کا لٹریچر لوگوں تک پہونچاتے، انہوں نے علم سے ناآشنا لوگوں کی تعلیم کے لئے ایک اسکیم بھی بنائی تھی، آپ نے اپنے طور پر بیت المال کا نظم قائم کیا، جس سے غریبوں کا تعاون کرتے تھے، لٹریچر کے علاوہ بہت سے رسائل مثلاً دعوت، الانصاف، زندگی، تجلی وغیرہ ان کے پاس آتے تھے۔

آپ تعلیم کے لحاظ سے مڈل پاس تھے، شکری شوگر فیکٹری میں بحیثیت کلرک ملازمت کرتے تھے، ۱۲؍جنوری ۱۹۸۹ء میں آپ کا انتقال ہوا، اس کے بعد یہ سرگرمیاں بھی ختم سی ہوگئیں۔

جماعت کے تحت خواتین کے لئے 'بزم حسنات' کے نام سے انجمن قائم تھی، جس کے تحت بہت سی تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں، ضیاء الہدیٰ صاحب کے انتقال کے بعد جماعت کی ساری سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

ضیاء اللہؒ کے علاوہ حافظ ہاشم صاحب (یتیم خانہ چرکی، گیا میں حفظ کی تعلیم دیتے تھے)

اور مولانا عطاء اللہؒ وغیرہ کا اس تحریک سے تعلق تھا۔

ان حضرات کے بعد اس تحریک سے وابستہ کسی فرد کا نام نہیں ملتا، اور نہ کسی سرگرمی کا علم ہوتا ہے، موجودہ وقت میں جناب نیاز احمد صاحب اس تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ نظر آتے ہیں، آپ کی کوششوں سے جماعت کا ایک پروگرام بھی قصبہ میں ہوا تھا۔

قصبہ واطراف کے جو اہل علم قصبہ سے باہر خدمات انجام دے رہے ہیں ان میں دو حضرات جماعت کے باضابطہ رکن ہیں، اور متعدد حضرات متفقین میں سے ہیں، رکنیت رکھنے والے حافظ شبیر صاحب (یکہتہ) اور مولانا صادق مظاہری (ابن حافظ داؤد، طوفانپور) ہیں۔

حافظ شبیر صاحب شہر جالنہ (مہاراشٹر) کی ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں، اور شہر کی سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں، حیدرآباد کے زمانہ تعلیم میں میرے مضامین روزنامہ 'منصف' حیدرآباد میں شائع ہوا کرتے تھے، انہی مضامین کے حوالہ سے میرا حافظ صاحب سے غائبانہ تعارف ہوا، بعد میں ملاقات ہوئی اور پھر ایک موقع پر جالنہ میں ان کے لطف وعنایت سے بہرہ مند ہوا۔

اور مولانا صادق مظاہری عنبر ضلع جالنہ میں طویل عرصہ سے امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، آپ وہاں کے امیر مقامی ہیں، غیر مسلموں میں دعوت کے کام سے خاص ذوق وشوق رکھتے ہیں، جماعت کے تحت ہونے والے سالانہ پروگرام عید ملن اور محسن انسانیت کے انعقاد میں آپ کا خاص کردار ہوتا ہے جس میں ہزاروں غیر مسلم شریک ہوتے ہیں، اس کے علاوہ روزانہ اور ہفتہ وار درس قرآن بھی آپ کے ذمہ ہے۔

مولانا انعام الحق مظاہری (امام، جالنہ) اور قاری شعیب صاحب (استاد واتالیق اقرا ایجوکیشن سوسائٹی، جالنہ) متفقین میں سے ہیں مگر جماعت کے کاموں میں بڑے سرگرم رہتے ہیں، اور اپنے حلقہ میں اچھی شناخت رکھتے ہیں۔

اصلاح معاشرہ کمیٹی

حافظ ظہور صاحب، جمیل اختر نھونی بابو اور قصبہ کے لوگوں نے طلاق کے ایک واقعہ کے

بعد یہ کمیٹی بنائی تھی، بتایا جاتا ہے کہ لوگوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائی تھیں، اس کمیٹی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں مل سکی، یہ کمیٹی بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی۔

ملت کمیٹی

حاجی عبدالحق صاحبؒ کے زمانہ میں قصبہ کے دو خانوادے 'بارہ گھریا' اور 'تیرہ گھریا' کے درمیان جب فاصلہ زیادہ بڑھا اور ان کے خلاف محی الدین مسہروبابوگھیا الیکشن میں کھڑے ہوئے، اسی موقعہ پر یا اس کے آس پاس مگر اسی پس منظر میں ملت کمیٹی قائم ہوئی، اس کے روح رواں شبیر احمد زخمی صاحب تھے، ان کے ساتھ سرگرم لوگوں میں حبیب احمد، سمیع انور، طاہر جسمن اور تیرہ گھریا برادری کے دیگر افراد تھے، یوں تو یہ تحریک ایک خاص پس منظر میں وجود میں آئی تھی، جس میں انہیں جزوی کامیابی بھی ملی، مگر اسی کے ساتھ اس کے افراد نے دوسرے کاموں کی طرف بھی توجہ کی، مثلاً تعلیمی بیداری کی کوشش کی، ہر محلّہ میں مکتب قائم کیا، آپسی تنازعات کو کمیٹی اپنے طور پر حل کرتی تھی، اس طرح ان لوگوں نے اپنے برادری میں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت پیدا کرنے کی کوشش کی، جناب شبیر احمد زخمی صاحب کے بقول یہ تحریک ۷۶ء تک جاری رہی، تحریک کے آغاز میں انہوں نے چوک پر ایک نظم سنائی تھی جو اس وقت لوگوں کی زبان پر تھی، یہ نظم مادری زبان میں تھی۔

اس تحریک میں قصبہ کے صرف چند نوجوان پیش پیش تھے، سب لوگ شریک نہیں تھے، خود زخمی صاحب کے والد حاجی عبدالرؤفؒ اس کے خلاف تھے، مگر لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت شاید حالات ایسے ہی تھے، یعنی حکمراں طبقہ (اگر یہ لفظ استعمال کرنا درست ہو) کے خلاف بے چینی پائی جارہی تھی، عام لوگوں میں تفریق اور امتیاز کا احساس پایا جاتا تھا، جس کے نتیجہ میں اس طرح کی تحریک وجود میں آئی، دوسری طرف یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جناب زخمی صاحب کے ساتھ بعض حالات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے ان کا ذہن منفی رخ اختیار کر گیا۔

قومی تحریک

۸۲-۸۰ء کے درمیان یہ تحریک شروع ہوئی، اس کا مقصد معاشرہ میں شراب اور تاڑی نوشی، طلاق کے بڑھتے رجحان پر بند باندھنا اور تعلیم کا فروغ تھا، اس تحریک میں جناب حبیب احمدؒ، مشتاق علی فہمی، صدر عالم مرحوم، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا امتیاز ندوی اور دوسرے حضرات سرگرم تھے، دو تین سالوں تک یہ تحریک جاری رہی، ان حضرات کی کوششوں سے مذکورہ برائیوں میں کمی آئی، راقم نے بچپن میں ''شراب پینا حرام ہے''، ''حلالہ کرنے والا ملعون ہے'' جیسے جملے سڑکوں کے کنارے اکثر دیواروں پر لکھا دیکھا ہے، یہ ساری کاوشیں اسی تحریک کی تھیں، چند سالوں بعد یہ تحریک بھی خاموش ہوگئی۔

اصلاح معاشرہ کانفرنس

۱۹۹۲ء میں ایک بار پھر اصلاح معاشرہ کی آواز پہلے سے زیادہ مؤثر اور وسیع پیمانہ پر سنائی دی، اس بار کے ہدی خواں جناب نیاز احمد صاحب اور دیگر حضرات تھے، یہ آواز پورے یکہتہ ململ میں یعنی پوری برادری سطح پر اٹھائی گئی، جس کا بنیادی مقصد معاشرہ کی اصلاح کے لئے ایک جامع منصوبہ بنا کر کام شروع کرنا تھا۔

اس تحریک کا پس منظر یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے ۱۹۹۱ء میں اصلاح معاشرہ سے متعلق عوامی بیداری کے لئے 'اصلاح معاشرہ ہفتہ' منانے کا فیصلہ کیا، اس کے تحت پورے ملک میں اس طرح کے پروگرام منعقد ہوئے، جناب قمرالہدی صاحب (ململ) نے یکہتہ وململ کی سطح پر اصلاح معاشرہ ہفتہ کو مؤثر بنانے کے لئے اصلاح معاشرہ تحریک کی باضابطہ بنا رکھی، ۲۹ رنومبر ۹۱ء کو انہوں نے دربھنگہ میں یکہتہ وململ کے ذمہ دار علماء ودانشوران کی ایک میٹنگ کی اور اپنے علاقہ کی صورت حال پر اپنے احساسات کا اظہار کیا، آپ کی باتوں سے سبھوں نے اتفاق کیا اور طے پایا کہ اس کے لئے باضابطہ تحریک کی ضرورت ہے، چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اس نشست میں جو حضرات شریک تھے ان میں سے

چند کے اسماء گرامی اس طرح ہیں: مولانا ممتاز علی مظاہری، مولانا وصی احمد صدیقی، اختر امام، حامد حسین، ڈاکٹر منظور احمد شمسی، ضیاء الرحمٰن، ڈاکٹر رحمت اللہ، ڈاکٹر شبیر احمد، انیس احمد، جلیل احمد، ظفیر الحسن، مہدی امام، ڈاکٹر سلطان احمد، شمشاد احمد، اور وسیم الرحمٰن وغیرہ۔

اس میٹنگ میں علاقہ کی دینی، تعلیمی، سماجی، تہذیبی صورت حال پر غور کر کے ان کا حل طے کرتے ہوئے ایک جامع منصوبہ بنایا گیا، بطور خاص چھ مسائل پر فوری توجہ دینے کے سلسلہ میں اتفاق کیا گیا، یہ چھ نکاتی مسائل اس طرح ہیں:

۱۔معاشرہ میں خواندگی کا مسئلہ بالخصوص تعلیم نسواں کی کمی۔

۲۔شادی بیاہ میں فرسودہ اور غیر ضروری رسم ورواج، جہیز میں روز بروز اضافہ اور غیر اخلاقی طلاق کی کثرت اور اس کے برے اثرات۔

۳۔تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مسائل۔

۴۔تہذیبی اور ثقافتی اطوار میں گراوٹ۔

۵۔آپسی نااتفاقی۔

۶۔دینی وملی رجحان میں کمی۔

یہ ہمارے معاشرہ کے اہم ترین مسائل تھے، جن کو اہل دانش نے غور وفکر کا موضوع بنایا، اس تحریک کی پہلی پیش رفت ململ کی کانفرنس تھی، جو حسب تجویز ۳،۴؍مارچ ۱۹۹۲ء کو منعقد ہوئی، اس کانفرنس کی مختصر رپورٹ جنرل سکریٹری کے الفاظ میں:

> یہ کانفرنس اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے اہم اس لئے بھی ہے کہ پہلی بار ان تمام بستیوں کے اہالیان واکابرین نے باہمی مسائل پر غور وخوض کے بعد مل کر قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے، اجلاس کا آغاز حسب پروگرام ۱۱ بجے دن سے ہوا، پہلے روز مختلف اہل فکر اور دانشور حضرات مسائل پر اظہار خیال فرماتے ہوئے سامعین کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے، رات میں ململ کی ادبی روایت کے مطابق سامعین کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے

> ایک خوبصورت شعری نشست کا اہتمام بھی کیا گیا، دوسرے دن ڈرافٹ ریزولیشن پر بحث وتمحیص کے بعد تین بابوں پر مشتمل تجاویز منظور کی گئیں، جس کا متن الگ سے پیش کیا جارہا ہے، کانفرنس میں نوجوانوں کے جوش وخروش اور تعاون آمیز سرگرمیوں کا ماحول قابل دید رہا، جسے کامیابی کے مرحلہ میں ہم امید کی پہلی کرن کہہ سکتے ہیں۔
>
> (رپورٹ اصلاح معاشرہ کانفرنس، ص:۵)

اس رپورٹ کا ایک اور اقتباس جو دراصل کانفرنس کے شرکاء کے دلی جذبات کی ترجمان ہے، ہم یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جنرل سکریڑی صاحب لکھتے ہیں:

> اصلاح معاشرہ کا کام اگرچہ مشکل اور دشوارترین عمل ہے، تاہم اجتماعی جدوجہد اور باہمی کوششوں سے کامیابی کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکتا ہے، وقت آگیا ہے کہ ان کہنہ وفرسودہ رسومات سے بلاتاخیر نجات حاصل کرنے کے لئے بھرپور کوشش کریں، وقت اور مال کا بچانا اور اس کا صحیح استعمال کرنا دانشوری کا پہلا اصول ہے، معیاری اور فعال معاشرہ کے لئے مال اور وقت دونوں ہی درکار ہیں، لہٰذا ہر موقع پر چاہے وہ شادی بیاہ کا ہو یا کوئی اور، خرافات اور فضول خرچی سے پرہیز کرنا ہوگا، ذرا سوچئے جھوٹی شان اور وقتی شہرت کے لئے ہم نے نکاح جیسے ضروری اور سہل کام کو کس قدر مشکل اور دشوار بنادیا ہے، اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے ہمیں ان رسم ورواج کو توڑنا ہوگا، ان کی تعلیم وتربیت پر خرچ کے لئے وقت ومال کو بچانا ہوگا، یہی عصری وملی تقاضا ہے۔ (رپورٹ اصلاح معاشرہ کانفرنس، ص:۵،۶)

اس کانفرنس میں من وتو کے جذبہ کو ختم کرتے ہوئے معاشرہ کے تمام افراد اور تمام طبقات کے لئے بہت ہی مناسب اور ضروری لائحہ عمل طے کیا گیا، اس میں جو تجاویز منظور کی گئی وہ مذکورہ بالا چھ نکاتی مسائل سے متعلق ہیں، یہ تجاویز تین ابواب پر مشتمل ہیں، پہلے باب میں

مذکورہ مسائل کے حل پر اظہار خیال ہے، دوسرے باب میں متفقہ اقدام سے متعلق فیصلہ ہے، اور تیسرا باب انتظامی امور اور ذمہ داریوں کی تقسیم سے متعلق ہے۔

تعلیم سے متعلق یہ تجویز منظور ہوئی کہ ''تعلیم نسواں کے فروغ کی خاطر فی الحال ثانوی سطح تک یکہتہ اور ململ میں ماڈل ادارے قائم کئے جائیں''

شادی بیاہ سے متعلق انجام پانے والے بعض امور کی تحدید کی گئی اور بعض امور ممنوع قرار دیا گیا۔

نوجوان کے مسائل سے متعلق اعلان کیا گیا:

> تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری ایک تشویشناک معاشی اور عصری مسئلہ ہے، سرکاری ملازمتوں کی کمیابی کے مدنظر مناسب ہے کہ ان میں خود انحصاری کا جذبہ پیدا کیا جائے، اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے وسائل کی حصولیابی کے سلسلہ میں بروقت ایک جامع منصوبہ تیار کیا جائے، شفیع اردو لائبریری یکہتہ اور کتب خانہ چشمہ فیض ململ میں مختلف مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لئے ضروری انتظامات کئے جائیں، ململ اور یکہتہ کے علاقوں میں ایک ایک شارٹ ہینڈ ٹائپ رائٹنگ اور ٹریننگ کم پروڈکشن سنٹر (تربیتی پیداواری مرکز) کھولا جاسکتا ہے، گرام پنچایت اس شعبہ میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ (رپورٹ اصلاح معاشرہ کانفرنس، ص:۹)

انتظامی امور کے لئے جناب نیاز احمد صاحب کو اس کمیٹی کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا اور چالیس ارکان پر مشمل ایک مجلس تشکیل دی گئی جس میں ہر گاؤں کے مؤقر و ذمہ دار افراد شامل تھے۔

اس کی دوسری کانفرنس یکہتہ میں منعقد ہوئی، جس میں ململ سے ضیاء الرحمٰن صاحب، قمر الہدیٰ صاحب و دیگر متعدد حضرات شریک ہوئے، اس پروگرام کی کوئی رپورٹ نہیں مل سکی، بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہاں کا پروگرام ململ کی طرح زیادہ کامیاب نہیں رہا۔

افسوس کہ اتنی اہم اور جامع منصوبہ پر مشتمل تحریک کو بھی استحکام نہیں مل سکا، اور شاید ایک دوسال بعد ہی اس نے بھی دم توڑ دیا، البتہ اس قلیل مدت میں بھی اس کے بعض بہت اچھے نتائج سامنے آئے، مثلاً:

۱۔ معاشرہ کی اصلاح کے لئے ہر گاؤں کے اہل علم و اہل دانش کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے اور مسائل پر غور وفکر کرنے کا موقع ملا۔

۲۔ تعلیم نسواں کی طرف رجحان عام ہوا، اور اسے بھی معاشرہ کی اہم ضرورت سمجھا گیا۔

۳۔ طے شدہ تجویز کے مطابق اس وقت کہیں بھی لڑکیوں کا کوئی ادارہ قائم نہیں ہوسکا، نہ ململ میں نہ یکہتہ میں، ململ میں بعد میں صفا گرلس اسکول کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا، جس کے پس منظر میں اس تحریک کے اثرات بھی شامل ہوں گے، نیاز احمد صاحب کے مطابق یکہتہ میں لڑکیوں کے اسکول کے لئے متعدد میٹینگیں ہوئیں، ایک میٹنگ میں طے پایا کہ مدرسہ کی گاؤں والی عمارت اسکول کے لئے دی جائے گی، مگر قبل اس کے کہ یہ تجویز وجود میں آتی مدرسہ نے اپنا اسکول کھولنے کا اعلان کردیا، اس طرح یہ کوشش بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

۳۔ شادی بیاہ سے متعلق بعض رسومات ختم ہوئے اور بعض میں واقعی کمی آئی، مثلاً شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی دونوں طرف سے بڑے پیمانہ پر دعوتیں ہوتی تھیں، جنہیں 'ڈالا' اور 'کھیر پان' کہا جاتا تھا، اسی طرح بارات کو دو یا تین وقت کا کھانا کھلایا جاتا تھا، اسی تحریک نے ان جیسے رسموں کو ختم کیا، ڈالا تو ختم ہی ہوگیا، اور بارات کو ایک وقت کھلانے کا چلن اسی کے بعد شروع ہوا، جو اب تک جاری ہے۔

اس تحریک میں یکہتہ و ململ اور مضافات کے تمام ہی باشعور افراد شریک تھے، متعدد حضرات نے سرگرم حصہ لیا جن میں یکہتہ سے جناب نیاز احمد، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی، مشتاق علی فہمی اور ململ سے جناب قمر الہدیٰ قمر، ضیاء الرحمٰن، مہدی امام اور وسیم الرحمٰن وغیرہ کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔

اتنی اہم تحریک کیوں ختم ہوگئی؟ اس کے کیا اسباب تھے؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے، مگر

بنیادی طور پر ہمارا اجتماعی مزاج اس ناکامی کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے، اصلاح معاشرہ کے پلیٹ فارم سے مستقل اس طرح کی صدا لگائی جانی چاہیے، اس طرح کی تحریک تو مستقل جاری رہنی چاہیے، لیکن معلوم نہیں کیوں ہمارے معاشرہ کا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ کوئی کام دیرپا ثابت نہیں ہوتا، بڑے جوش اور حوصلہ کے ساتھ کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے، مگر چند دنوں کے بعد حوصلے پست ہونے لگتے ہیں، اس سلسلہ میں اہل دانش کو سر جوڑ کر سوچنا چاہیے، ورنہ ہمارے یہاں کوئی بڑا اجتماعی کام نہیں ہوسکتا ہے۔

شفیع بیرسٹر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی

اس تنظیم کے روح رواں اور بانی مبانی جناب نیاز احمد صاحب ہیں، ۱۹۹۷ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، شفیع صاحب کے نام سے قائم ہونے والے اس ادارہ کے مقاصد میں بہت سے تعلیمی اور فلاحی منصوبے شامل ہیں، تعلیمی اداروں کا قیام اور غرباء کا امداد اس کا خاص مشن تھا، لیکن میرے علم کے مطابق اس کی سرگرمیاں باضابطہ طور پر شروع نہیں ہوئی ہیں، اس کے تحت مسجد الفاروق کی تعمیر ہوئی ہے، اس کے علاوہ خاموش طریقہ پر اس کے تحت غرباء کا تعاون کیا جاتا ہے، اللہ کرے اس کے فیض کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔

یادش بخیر راقم کی پہلی کتاب ''ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج'' اور ڈاکٹر سلطان احمد کی کتاب 'میر انیس بحیثیت رباعی نگار' جب شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو نیاز احمد صاحب نے اسی تنظیم کے بینر تلے استقبالیہ کی شاندار تقریب منعقد کی، جس میں گاؤں کے ہر طبقہ کے عمائدین نے شرکت کی اور کلمات تبریک سے نوازا۔

اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل سوسائٹی

۱۹۹۷ء میں جب راقم الحروف دار العلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھا، اس وقت یکہتہ و مضافات کے متعدد طلبہ یہاں تھے، ہم لوگ اکثر علاقہ کی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے، اسی دوران لکھنؤ میں قائم متعدد تنظیموں کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ اگر اسی طرح کی کوئی تنظیم

اپنے علاقہ میں قائم کی جائے تو اس کے ذریعہ علاقہ میں تعلیمی بیداری کا کام کیا جاسکتا ہے، اسی احساس کے ساتھ راقم کی تحریک پر اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا، سوسائٹی کی ایک رپورٹ میں اس کی ابتدائی تاریخ برادرم طارق انور ندوی (ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسیٹی، دلی) کے قلم سے اس طرح درج ہے:

> ندوہ کے زمانہ طالب علمی کی ایک شب تھی، ۱۹۹۷ء کا کوئی مہینہ تھا، رواق سلیمانی کے زیریں منزل کمرہ نمبر ۸ میں چند باغیور حوصلہ مند نوجوانوں کی ایک جمعیت اپنی بستی کے احوال وکوائف، اس کی تعلیمی، سماجی وفلاحی اور دینی پہلوؤں پر ایک نگاہ ڈالنے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھی تھی، یاد آتا ہے کہ اس مجلس کے شرکاء میں سرفہرست مولانا نوشاد عالم ندوی، منور سلطان ندوی، ظل الرحمٰن ندوی، شاکر علی ندوی، رئیس احمد ندوی، اور ایک معزز مہمان گرامی مولانا انور علی ندوی شامل تھے، احقر بھی ان مبارک ہستیوں کے زیر سایہ حاضر خدمت تھا، مجلس کا ہر فرد اپنی بساط کے مطابق اپنی بستیوں کی خرابیوں اور خوبیوں کا مکمل تفصیل سے تذکرہ گو تھا، ہر ایک کے ذہن میں یہی بات تھی کہ کس طرح ہماری بستی ایک تعلیم یافتہ ومہذب بستی بن سکے، یہی وہ احساسات وجذبات تھے جو ان حوصلہ مند نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر اپنی صدا گاؤں گاؤں تک پہونچانے کی دعوت دے رہے تھے۔

(نشان منزل پہلا شمارہ ص: ۳۵)

۱۹۹۹ء میں اس کی سرگرمیاں شروع ہوئیں، پہلے اس تنظیم کا نام اسلامک اسٹوڈنٹس یونین رکھا گیا تھا، ایک سال تک اسی نام سے کام ہوا، پھر بعض حالات کی وجہ سے اس کا نام اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل سوسائٹی کردیا گیا، اس تنظیم میں مختلف مرکزی مدارس وعصری جامعات میں پڑھنے والے طلبہ شامل تھے جبکہ قصبہ ومضافات کے معروف اہل علم کو اس تنظیم کا سرپرست بنایا گیا تھا۔
طلبہ کی اس تنظیم کا مقصد علاقہ میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا تھا، اس مقصد کی تکمیل کے لئے

یہ طے کیا گیا کہ مختلف چھٹیوں میں طلبہ کے مابین مقابلے، تعلیمی مظاہرہ کرائے جائیں، ۲۰۰۰ء میں اس کا پہلا انعامی مقابلہ منعقد ہوا، جس میں قرأت، خطابت اور کوئز کے مقابلے ہوئے، ان پروگراموں کی اہل علم نے بڑی تحسین کی، اس کے بعد یکہتہ کے علاوہ مضافاتی گاؤں طوفانپور، مہراجپور میں بھی متعدد ایسے پروگرام منعقد کئے گئے۔

پہلے پروگرام کا منظر آج بھی میری طرح بہت سے لوگوں کی نظر میں ہوگا، پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہزاروں تبصرہ تھے، کہ یہ کون ہیں اور کیا کرنے والے ہیں، لیکن جب پروگرام شروع ہوا تو لوگوں کی ایک بھیڑ امنڈ آئی، پورے قصبہ واطراف سے اہل علم اور اہل شوق کھنچتے چلے آئے، جب بیٹھنے کی جگہ ختم ہوگئی تو مدرسہ سے متصل مسجد اور سامنے سڑک پر کھڑے ہو کر لوگوں نے اس پروگرام کو دیکھا اور سنا، وہ دن ہمارے لئے واقعی بڑی خوشی ومسرت کا تھا، تمام ساتھیوں کے چہرہ سے مسرت ہویدا تھی، اور کیوں نہ ہوتا کہ اندازہ سے زیادہ کامیابی مل رہی تھی، سامنے جہاں اہل علم کا جم غفیر تھا وہیں اسٹیج پر قصبہ کی اہم شخصیات جن میں بطور خاص جناب انیس احمد، جناب نیاز احمد ودیگر حضرات جلوہ گر تھے، مقابلہ قرأت میں شرکاء اپنی مترنم آواز اور خاص لے سے مجلس میں سماں باندھتے رہے، تو مقابلہ خطابت میں طلبہ کا جوش خطابت دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں محو حیرت تھیں کہ ع

ایسی خاکستر بھی یارب اپنے سینے میں ہے

اور آخری پروگرام کوئز کا مقابلہ تو بڑا ہی دلچسپ اور رنگارنگ رہا، قصبہ کی مقتدر واہم شخصیات نے اس پروگرام کو وقت کی آواز، تعلیمی بیداری کی نئی کرن، اور طلبہ کی ایک پیش رفت سے تعبیر کیا۔

اس پروگرام نے ہم طلبہ کو بڑا حوصلہ دیا، اس کے بعد کالجز کے بہت سے طلبہ ہمارے کارواں میں شامل ہوئے، اور اس طرح ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۳ء تک یہ تنظیم پوری طرح سرگرم عمل رہی، اور اس کے خاطر خواہ اثرات محسوس کئے گئے، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان پروگراموں میں اپنے عزیزوں اور قصبہ کے طلبہ کو تعلیمی مظاہرہ کرتے دیکھا تو ناظرین اور

سامعین کے دلوں میں یہ احساس جاگا کہ وہ اپنے لخت جگر کو بھی اس قابل بنائیں گے، شاید یہ پہلا موقع تھا جب مختلف مدارس اور کالجز میں پڑھنے والے طلبہ کو اپنے سرپرستوں اور رشتہ داروں کے سامنے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا، مختلف فنون میں جب ان طلبہ نے بہترین مظاہرہ کیا تو ایک طرف جہاں سرپرستوں کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا، اور انہوں نے اپنا سر فخر سے اونچا ہوتے ہوئے دیکھا وہیں ان سرپرستوں کے علاوہ سینکڑوں سامعین وناظرین کے دلوں میں تعلیم کا شوق وجذبہ انگڑائیاں لینے لگا۔

ان طلبہ کے پاس صرف چھٹیوں کا وقت ہوتا، رمضان کے بعد اور گرمی چھٹی، انہی اوقات میں ان کی سرگرمیاں جاری رہتیں، اس کم وقت میں بھی انہوں نے اپنی سطح سے زیادہ کام کیا، تعلیمی بیداری کے لئے مختلف مقابلوں اور ثقافتی پروگرام کے علاوہ انہوں نے تعلیمی مسائل پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی، شاید یہ ان کی سطح سے بلند کام تھا، مگر ان کے جذبہ صادق اور جوش جنوں نے یہ کام بھی کروائے۔

تعلیمی مسائل کو حل کرنے کی طرف قصبہ واطراف کے اہل علم اور ارباب حل وعقد کو متوجہ کرنے کے لئے دو پروگرام بہت اہم ہوئے، پہلا 'تعلیمی کنونشن' تھا جس میں تعلیم سے متعلق مختلف اہم موضوعات مثلا ابتدائی تعلیم کی گرتی صورتحال، ثانوی تعلیم کی ضرورت، اور تعلیم نسواں پر غور کرنے کی دعوت دی گئی، اور انہیں ان مسائل کی طرف متوجہ کیا گیا، دوسرا پروگرام مدرسہ رحمانیہ کے تعلیمی نظام ونصاب پر غور کے لئے نشست کا انعقاد تھا، اس میٹنگ میں مدرسہ رحمانیہ کے ذمہ داران، ممبران، اور قصبہ کے اہل ودانش شریک ہوئے، اس میں تعلیمی انحطاط پر غور کرتے ہوئے اس کے حل کا ایک خاکہ پیش کیا گیا، اس مجلس میں وفاق المدارس الاسلامیہ کے نصاب اور نظام کے نفاذ پر بھی غور ہوا۔

سالانہ رسالہ 'نشانِ منزل' کا اجراء

تعلیمی بیداری کے عنوان سے متعدد پروگراموں سے حوصلہ پا کر یہ سوچا گیا کہ ایک سالانہ میگزین نکالا جائے، جو قصبہ کے طلبہ کو قلمی میدان میں اپنی صلاحیت دکھانے اور آگے

بڑھنے کا موقع فراہم کرے، یہ خیال اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ اب تک قصبہ سے اس طرح کی کوئی کوشش نہیں ہوئی تھی، یہ فکر عملی شکل میں ۲۰۰۲ء میں 'نشان منزل' کے روپ میں جلوہ گر ہوئی، ایک میگزین نکالنے اور اس کو مرتب کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا، ابھی ہم لوگوں نے صحافتی شعور کے کسی مرحلہ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، مگر جذبہ اور حوصلہ نے یہاں بھی مہمیز کا کام کیا اور الحمدللہ اس میدان میں بھی کامیابی وکامرانی میسر آئی، ۲۰۰۲ء میں اس کا پہلا شمارہ عید کے بعد منظر عام پر آیا، جسے قصبہ کے اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا، میگزین نکالنے کا خیال بھی میری ذہنی اپج تھی، چنانچہ اس کو مرتب کرنے کی ذمہ داری بھی میرے کاندھے پر ڈالی گئی، اور اللہ کا صدہا شکر کہ قلم وقرطاس کی وادی میں پہلا قدم رکھنے والے اس کوتاہ علم نے اس خاکہ میں رنگ بھرنے اور خواب کو حقیقت کا روپ دینے میں کامیابی حاصل کی۔

نشان منزل کا پہلا شمارہ طباعت کی ناتجربہ کاری کے باوجود بہت اچھا رہا، اور اس کوشش کی بڑی تحسین کی گئی، اس کا دوسرا شمارہ دسمبر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا، اور یہی شمارہ آخری بھی ثابت ہوا، اس میگزین کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اہل علم نے نظرِ احسان سے دیکھا، ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ کے تبصرہ نگار نے اس پرچہ کے بارے میں لکھا:

> زیر نظر شمارہ سوسائٹی کا پہلا شمارہ ہے، کسی ادارے کے پہلے شمارے کے اعتبار سے یہ رسالہ بہت معیاری اور سلیقہ سے مرتب کیا ہوا ہے، مضامین کا انتخاب بھی خوب ہے، عام طور پر مضمون نگاروں میں علاقائی اور مقامی افراد کو ترجیح دی گئی ہے، اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مکررات کی اشاعت نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ مقامی اور علاقائی لوگوں کو بھی لکھنے اور اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا موقع ملتا ہے، اس سے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ ادارہ کو بھی رفتہ رفتہ بہتر اور اچھا لکھنے والے افراد بآسانی مل جاتے ہیں، یہ رسالہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے اور مجموعی طور پر ایک معیاری اور عمدہ رسالہ ہے۔ (ماہنامہ بانگ حراء لکھنؤ، اگست: ۲۰۰۳)

قصبہ کے اہل علم واہل دانش کے متعدد خطوط چیف ایڈیٹر کو ملے، جناب نیاز احمد صاحب نے لکھا:

> ''نشان منزل کا پہلا شمارہ ہی وسائل کی کمی کے باوجود خوب رونمائی اور فکر وفن کی عکاسی کر گیا، مادہ پرستی سے متاثر بیمار عام ذہن گو اس کاوش کو اہمیت نہ دے، لیکن میں آپ جیسے حوصلہ مند نوجوانوں سے امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے نیک اداروں کو ان شاء اللہ کامیابی سے ہمکنار کر سکیں گے، یوں تو سبھی مضامین اپنے آپ میں خوابیدہ ذہنوں کو جھنجھوڑنے کا مادہ لئے ہوئے ہے، لیکن آپ کا مضمون ''سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ'' تحقیقی نظریہ سے بھی قابل تعریف ہے، ''ہم کہاں تھے ہم کہاں آگئے'' کاش ماضی کی کہانی نشان منزل بن کر ہماری رہنمائی کرتی کہ علمی پسماندگی سے نکل کر دنیا کو پھر دکھا دیتے کہ ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

نشان منزل کے دو شمارے ہی نکل سکے، اس کے بعد تنظیم کی سرگرمیوں کا سلسلہ موقوف ہو گیا، اس کی وجہ جہاں تنظیم کے ابتدائی ذمہ داران کی مصروفیت تھی کہ وہ اب طلبہ کے بجائے اساتذہ بن چکے تھے، اور ان کی جگہ نئے طلبہ نہیں لے سکے، وہیں لوگوں کی ان پروگراموں سے عدم دلچسپی اور حوصلہ شکنی بھی اس کی ایک وجہ تھی، ابتداء میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی، مگر بعد میں لوگوں نے اسے روایتی پروگرام سمجھ لیا، ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ بعض لوگوں نے ہمارے عزم وحوصلہ کو دیکھ کر ہمیں باضابطہ میدان عمل میں آنے کی نہ صرف دعوت دی بلکہ اصرار بھی کرنے لگے، یہ ہماری کامیابی کی واضح دلیل تو ضرور تھی مگر ہمارے خیال سے یہ ابھی قبل از وقت والی بات تھی، بہرحال اسباب جو بھی ہوں یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا، البتہ یہ ضرور ہوا کہ لوگوں کو نئی نسل میں امید کی ایک کرن نظر آگئی، اور انہیں نظر آنے لگا کہ آج نہیں تو آئندہ ملت کے یہ شاہین صفت نوجوان علاقہ میں ایک نئی تاریخ رقم کر سکیں گے۔

طلبہ کی اس تنظیم میں قصبہ ومضافات کے بہت سے طلبہ جو اس وقت مختلف مدارس اور

کالجز میں زیر تعلیم تھے، دونوں دوش بدوش ان سرگرمیوں میں شریک تھے، طلبہ میں برادرم نوشاد عالم ندوی (استاد جامعۃ المومنات لکھنؤ) اور راقم الحروف کے علاوہ مولانا توقیر مظاہری، طارق انور ندوی، عتیق الرحمٰن، امتیاز احمد، شوکت علی، عارف نثار، رضوان احمد مظاہری اور بہت سے طلبہ شامل تھے، (اب یہ تمام افراد طلبہ کی سطح سے نکل کر مختلف میدان میں سرگرم عمل ہیں) نشان منزل کی ادارت اور طباعت میں بھی راقم السطور کے ساتھ عزیزی طارق انور ندوی اور برادرم عتیق الرحمٰن شامل تھے، ان سب کی مشترکہ کوششوں سے طلبہ کی اس تنظیم نے اپنی سرگرمیاں انجام دیں، اور کم وقت میں اچھے اثرات ذہنوں میں مرتسم کئے۔

وزیر اعلی بہار کی آمد اور استقبالیہ پروگرام

یوں تو اس قصبہ میں الیکشن اور دیگر پروگرام کے موقع پر بڑے سیاسی لیڈران آتے رہے ہیں، لیکن موجودہ وزیر اعلی بہار کی آمد جس عنوان سے ہورہی تھی وہ واقعی یادگار رہے، ہوا یوں کہ ایک ضمنی الیکشن میں انہوں نے اعلان کیا کہ اگر ان کے امیدوار کامیاب ہوگئے تو وہ یہاں ضرور آئیں گے، حسن اتفاق کہ اس امیدوار نے شاندار کامیابی حاصل کی، اسی زمانہ میں وزیر اعلی سیوا یاترا کے عنوان سے بہار کے مختلف اضلاع کا دورہ کر رہے تھے، چنانچہ جب موھوبنی ضلع کے دورہ کی تاریخ مقرر ہوئی تو انہوں نے اس قصبہ کے لئے بھی وقت دیا۔

پھر کیا تھا تیاری شروع ہوگئی، ان کے آنے سے پہلے ہی بعض کاموں کے لئے فنڈ بھی آگئے اور کام بھی شروع ہوگیا، اس طرح اس پروگرام کی خبر پورے علاقہ میں پھیلتی رہی، جوں جوں وقت قریب آتا گیا تیاریاں شباب پر پہونچنے لگیں، مدرسہ رحمانیہ کے وسیع احاطہ میں استقبالیہ پروگرام رکھا گیا، اس مناسبت سے مدرسہ کی عمارت پر رنگ وروغن کا کام بھی ہوا، سڑکیں جو عرصہ سے نامکمل تھیں، راتوں رات مکمل ہوئی اور اس طرح پورا قصبہ استقبال کے لئے تیار ہوا۔

۱۸/جنوری ۲۰۱۲ء کا دن تھا جب وزیر اعلی جناب نتیش کمار اس سرزمین پر قدم رنجہ ہوئے، ان کے استقبال کے لئے جس پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا وہ وقت کی قلت کی وجہ سے انتہائی مختصر کیا گیا، جناب انیس احمد صاحب کی صدارت میں یہ پروگرام منعقد ہوا، رزیق احمد صاحب

نے پنچایت کی طرف سے وزیر اعلی کا استقبال کیا، اس کے بعد وزیر اعلی نے مجمع سے خطاب کیا۔

اس پروگرام میں وزیر اعلی نے تمام مسلمانوں اور خاص طور پر اس قصبہ کے لوگوں کا شکریہ ادا کیا، وزیر اعلی کے ہمراہ متعدد وزراء، افسران اور علاقہ کے پارٹی ذمہ داران شریک تھے۔

وزیر اعلی کے آنے سے پہلے ہی قبرستان کی گھیرابندی کا کام شروع ہوگیا، جواب مکمل ہونے والا ہے، یہ بہت اہم کام تھا، جس کے لئے مدت سے کوشش ہورہی تھی، وزیر اعلی کی آمد نے اس کام کو آسان کر دیا اس کے علاوہ متعدد سڑکوں کی تعمیر کی منظوری بھی ملی۔

دوسرا سب سے اہم کام یہ ہوا کہ استقبالیہ پروگرام میں وزیر اعلی سے مڈل اسکول کو ہائی اسکول میں بدلنے کا مطالبہ کیا گیا، جس کے جواب میں وزیر اعلی نے ہائی اسکول وانٹر کالج تک کی منظوری کا اعلان کیا، ساتھ ہی انہوں نے مدرسہ کے لئے ایک گرلس ہاسٹل کی تعمیر کا بھی اعلان کیا، ان اعلانات سے قصبہ کے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خاص طور پر ہائی اسکول ایک خواب تھا، بہت سے حضرات اس کی کوشش کر کے اور اس کا خواب دیکھ کر دنیا سے چلے گئے، اب اس خواب کے پورا ہونے کا وقت آیا۔

اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں یوں تو قصبہ کے بہت سے افراد نے اپنی محنتیں صرف کیں، البتہ اس کا اصل سہرا جناب انیس احمد اور رزیق احمد کے سر ہے، کہ یہی دو حضرات اس پروگرام کے اصل محرک تھے، اور پورا پروگرام انہی کی نگرانی میں اختتام پذیر ہوا۔

اس استقبالیہ پروگرام کی مناسبت سے پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب نے ایک نظم کہی تھی، جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بہار کے جو نگہباں نتیش بابو ہیں — یکہتہ والوں کے مہماں نتیش بابو ہیں
وزیر اعلی کا کرتے ہیں مل کے استقبال — ہمارے دل کا جو ارماں نتیش بابو ہیں
چمن میں پھول یکہتہ کے بھی کھلیں گے اب — یقینِ فصلِ بہاراں نتیش بابو ہیں
اب اس علاقے کی ہوگی بڑی ترقی بھی — ہر اک ترقی کا امکاں نتیش بابو ہیں
وہ آج آئے ہیں گاؤں شفیع بیرسٹر کے — تو ان کے گھر ہی پہ مہماں نتیش بابو ہیں

موجودہ دینی وتعلیمی صورت حال پر ایک نظر

نئی پود۔نئی کاوشیں۔نئی ذمہ داریاں

گذشتہ دوتین دہائیوں سے نئی نسل کے نوجوانوں میں ایک بیداری پیدا ہوتی نظر آرہی ہے، اجتماعی ترقی کے لئے ان کے دلوں میں ایک احساس پیدا ہوا ہے، عام لوگوں کی طرح وہ موجودہ حالت پر قانع ومطمئن نہیں ہیں، بلکہ ان کے قلوب واذہان میں ایک طرح کی کشمکش برپا ہے، وہ اسلاف کی خدمات کو جہاں استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ماضی کی تاریخ کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں وہیں وہ موجودہ تعلیمی اور سماجی حالت سے حددرجہ نالاں اور شکوہ کناں ہیں، انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک محدوددائرہ میں ہم خودکو جتنا بھی اچھا کہہ لیں مگر باہر کی دنیا میں ہماری کوئی خاص حیثیت نہیں، ہم کسی بھی معاملہ میں دوسرے ترقی یافتہ لوگوں کے برابر نہیں ہیں، پھر ماضی پر فخر اور حال سے اطمینان کیسا!

یہ احساس دراصل ایک بڑی تبدیلی اور صحیح لفظوں میں ذہنی وفکری انقلاب کی آمد کا صاف اشارہ ہے، اجتماعی ضرورتوں کے احساس کی یہ ایک مثبت علامت ہے، یہاں عموماً اجتماعی ذمہ داری سے گریز کا مزاج پایا جاتا ہے، ہر شخص اپنی ترقی کے لئے سرگرداں بلکہ حیراں وپریشاں نظر آتا ہے، ملی مسائل ان کی نظروں میں کوئی معنی نہیں رکھتے، بلکہ اگر ذاتی ترقی کے لئے اجتماعی ترقی کا گلا گھونٹنا پڑے تو بھی اس کے لئے تیار رہتے ہیں، ہمارے ایک دوست کے بقول کہ اگر اپنی ترقی کے لئے دوسروں کی لاش پر سے گزرنا پڑے تو یہ بھی کرگزریں گے، اس ماحول میں نئی پود کے ذہنوں میں اپنے معاشرہ اور سماج کی ترقی کے تئیں بے کلی اور دردمندی یقیناً ایک صالح اور مثبت اشارہ ہے۔

نئی نسل کے چند نوجوانوں نے اپنی سطح کے مطابق کوششیں بھی شروع کی ہیں، گذشتہ دوتین

دہائیوں میں اس طرح کی متعدد سرگرمیاں نظر آتی ہیں، مختلف انداز سے متعدد کاموں کی شروعات ہوئی ہیں، یہ سب گرچہ ابھی ابتدائی دور میں ہیں مگر کام کا آغاز تو ہو چکا ہے، میں ان کوششوں کو نئی تبدیلی کی سمت پہلا قدم سمجھتا ہوں، اگر ان کا حوصلہ بلند رہا اور کوششیں جاری رہیں تو بہت سی روایتیں ٹوٹتی نظر آئیں گی، اور جلد ہی ایک نئی تاریخ رقم ہوگی۔

یہ نوجوان تعلیم کے میدان میں کوشاں ہیں اور بعض نے اعلی تعلیم کے لئے طلبہ کی رہنمائی کا سلسلہ شروع کیا ہے، ادھر خواتین میں بھی دینی شعور کو بیدار کرنے کا کام شروع ہوا ہے، اور اس کوشش کے بھی اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں، اس طرح دھیرے دھیرے اجتماعی ترقی کی سمت میں قدم آگے بڑھتے نظر آرہے ہیں۔

یہ تمام کوششیں نہایت ضروری اور قابل ستائش ہیں، پوری ملت کی طرف سے یہ نوجوان حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں، ان کے قدم کو جمانے کی کوشش ہونی چاہیے، تاکہ معاشرہ میں موجود ہر طرح کی جہالت دور ہو، اور سب کو تعلیم کے یکساں مواقع ملیں۔

میں نئی نسل کے جوانوں سے بہت پر امید ہوں، اور ان سے بڑی توقعات وابستہ رکھتا ہوں، مگر اسی کے ساتھ قصبہ کی بیمار ذہنیت سے پریشاں خاطر بھی ہوں، یہاں کے عمومی مزاج سے ڈرتا ہوں کیونکہ ماضی کی تمام کوششوں کی ناکامی میں سب سے زیادہ اسی مزاج کو دخل رہا ہے۔

اس لئے میدان عمل میں قدم رکھنے والوں کو چاہیے کہ اپنی کوشش اور محنت کے ساتھ اس مزاج اور اس ذہنیت سے بچنے کی پوری کوشش کریں، مراسم سبھوں کے ساتھ رکھیں مگر منفی مزاج والوں کو اپنے کام میں دخیل نہ ہونے دیں، کسی بھی طرح کے تعصب کو جگہ نہ دیں، اور نہ من وتو کا امتیاز رکھیں۔

منزل دور ضرور ہے مگر عزائم بلند ہوں تو کچھ بھی دور نہیں، منزل کا صحیح ادراک ہونا چاہیے، منزل اور مقصد ہمیشہ پیش نظر رہے اور مقصد کے مطابق کام کا لائحہ عمل بنایا جائے، تو کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔

کوشش خواہ چھوٹی کیوں نہ ہو، اگر اس میں تسلسل ہے، ثبات ہے تو اس کے بہت اچھے

نتائج سامنے آئیں گے، اس لئے کام میں پائیداری اور استحکام بہت ضروری ہے، تسلسل کو باقی رکھنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے، یہاں بہت سی اور بلند مقاصد والی تحریکیں بھی وجود میں آئیں، مگر استحکام نہ ہونے کی وجہ سے اب صرف اس کے نام ہی باقی ہیں۔

اپنے مقاصد کے مطابق صالح افراد تلاش کئے جائیں، لوگوں کی ذہن سازی کی جائے، ان میں اجتماعی کام کا شعور بیدار کیا جائے، اور وقتاً فوقتاً ایسے پروگرام کئے جاتے رہیں جس سے اپنی کارکردگی سامنے آئے، مظاہر کی زیادہ حیثیت نہیں ہے، مگر بہت سے افراد انہی مظاہر سے متاثر ہوتے ہیں۔

ہمارے معاشرہ میں دوسروں کی ترقی نہ دیکھنے کا خاص مزاج پایا جاتا ہے، ایسے لوگ اپنی پست حالی سے زیادہ دوسروں کی ترقی سے پریشان رہتے ہیں، دوسرے افراد ترقی نہ کریں اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں، یہاں حوصلہ بڑھانے والے کم اور حوصلہ شکنی کرنے والے بہت ہیں، ساتھ دینے والے گنتی کے اور تنقید کرنے والے بے شمار، مخلص چند اور منافق ہزار، ایسے ماحول میں حکمت، دور اندیشی کے ساتھ تعلق مع اللہ اور رجوع الی اللہ ہی سب سے بڑا معاون ومددگار ثابت ہوگا۔

نئی نسل کے تمام نوجوانوں کو معاشرہ کی ضروریات، اس کے تقاضوں سے واقف ہونا چاہیے، ظاہر ہے ہر شخص ہر کام نہیں کرسکتا ہے، ہر فرد میدان میں نہیں آسکتا، مگر ہم میدان میں آنے والوں کے دست وبازو تو بن سکتے ہیں، ان کے قدم کو مضبوط کرنے میں سہارا تو بن سکتے ہیں، اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہم بھی اس کام میں شریک ہیں۔

تعلیمی ومعاشی ترقی: چند مخلصانہ مشورے

گذشتہ صفحات میں علاقہ کی تعلیمی اور معاشی ارتقاء کا عہد بہ عہد جائزہ پیش کیا گیا، خاص طور پر یہاں کے دینی وعصری اداروں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا، تاکہ ماضی کے ساتھ موجودہ منظرنامہ بھی خوب واضح ہوجائے، اور تعلیم کے میدان میں ہماری حالت کیا تھی اور اب کیا ہے؟ اس پر غور وفکر کرنے میں آسانی ہو۔

موجودہ دور میں تعلیم کی طرف رجحان میں بلاشبہ بڑا اضافہ ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ قصبہ اور اطراف وعلاقہ کی جو عمومی تعلیمی پوزیشن ہے اسے کسی بھی طرح قابل اطمینان یا خوش آئند نہیں کہا جاسکتا ہے، یہ ملت کے ذی شعور افراد کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے، اہل علم کو اس سلسلہ میں سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے، اور موجودہ تعلیمی نظام میں خامیوں پر غور کرتے ہوئے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خاکسار مدت سے ان موضوعات پر سوچتا رہا ہے، میرے خیال میں تعلیم اور معاشی و سماجی ترقی کے لئے ایک ہمہ جہت منصوبہ کی ضرورت ہے، کاش! ارباب علم ودانش اور علاقہ کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے باشعور افراد بصیرت مندی کے ساتھ ان مسائل پر غور کرتے ہوئے اپنی ملی ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کرتے!!

تعلیم کے میدان میں درج ذیل کام بہت ضروری ہیں:

۱۔ ہمارے علاقہ میں مکاتب کا نظام قائم ہے، تقریباً ہر محلّہ میں مکتب قائم ہے، جہاں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے، ان مکاتب کو منظّم کرنے کی ضرورت ہے، اس طرح کہ ان تمام مکاتب کا ایک تعلیمی نظام بنایا جائے، جو وہاں کے تعلیمی نظام اور پڑھائی جانے والی کتابوں پر غور کرے، ان میں مناسب ترمیم واصلاح کرے، اور اس کی تعلیم کا جائزہ لیتا رہے، ان مکاتب میں عموماً حافظ یا کم پڑھے لکھے افراد تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں، ان اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے، اور ان سب کو مدرسہ رحمانیہ یا کسی دوسرے ادارہ سے اس طرح جوڑا جائے کہ مکاتب کے بچے مکاتب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مذکورہ ادارہ میں پہونچے۔

امارت شرعیہ نے مکاتب کا تعلیمی نظام بنایا ہے، نیز امارت کی طرف سے مکاتب کے اساتذہ کے لئے ٹریننگ کا بھی اہتمام ہوتا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

۲۔ ثانوی تعلیم مسلم معاشرہ کی ایک بڑی اہم ضرورت ہے، مکتب کے بعد کی تعلیم کا مناسب انتظام ہوگا تو بڑی تعداد میں بچے اس میں داخل ہوں گے، اور اس طرح ثانوی تعلیم حاصل کرنا ہر ایک کے لئے آسان ہوجائے گا، قصبہ میں ثانوی تعلیم کا مناسب نظم نہ ہونے کی

وجہ سے بہت کم بچے آگے کی تعلیم جاری رکھ پاتے ہیں، کیونکہ دوسری جگہ جا کر تعلیم حاصل کرنا آج بھی سب کے لئے ممکن نہیں ہے، پھر اس میں جو مسائل ہیں اور چھوٹے بچوں کو ہاسٹل میں رکھنے کے جو نقصانات ہیں وہ سامنے ہیں۔

ثانوی تعلیم کے لئے مدرسہ رحمانیہ سب سے اچھی جگہ ہوسکتی ہے، کہ اس کے پاس تعلیمی ضرورت کے لئے ساری سہولیات موجود ہیں، اس میں تعلیمی اصلاح کی مؤثر اور منصوبہ بند کوشش ہونی چاہیے، میرے ناقص خیال میں اگر بورڈ کے نظام کو باقی رکھتے ہوئے آزاد نصاب کے مطابق تعلیم شروع کی جائے، اور پھر یہاں کے طلبہ کو کسی بڑے مدرسہ میں داخل کرانے کا سلسلہ شروع کیا جائے تو کامیابی مل سکتی ہے، اگر کسی مرکزی ادارہ سے تعلق قائم نہ ہو تو کسی ایسے ادارہ سے بھی تعلق قائم کیا جاسکتا ہے جہاں سے طلبہ ہر سال مرکزی ادارہ میں بھیجے جاتے ہوں۔

بورڈ کے اساتذہ میں جو حضرات اس تعلیمی نظام میں شریک ہوں ان کو ساتھ لیا جائے، جو شریک نہ ہوں ان پر کوئی قدغن نہ ہو، اور ضرورت کے مطابق پرائیویٹ سے اساتذہ رکھے جائیں، اس طرح کا نظام کئی جگہوں پر کامیابی سے چل رہا ہے، اس وقت رحمانیہ کو زندہ رکھنے کی اس سے بہتر شکل نہیں ہوسکتی ہے۔

اگر رحمانیہ میں اصلاح ممکن نہ ہو اور قصبہ کی تعلیمی ضرورت اس سے پوری نہ ہو پاتی ہو تو اہل علم اور عمائدین کو ایک نئے اور آزاد مدرسہ کے قیام کے لئے سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، کہ تعلیم کا مناسب انتظام کرنا علاقہ کے باشعور طبقہ کی اجتماعی ذمہ داری ہوتی ہے، رحمانیہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے قائم کیا گیا تھا، اگر اس سے تعلیم کی ضرورت پوری نہ ہو، تو نئے مدرسہ کا قیام ناگزیر ہے۔

۳۔ قصبہ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے دو ادارے ہیں، رحمانیہ بنات سیکشن، اور معہد البنات، مگر ان دونوں کے باوجود ہم لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں خود کفیل نہیں ہیں، ان دونوں میں جہاں بھی ممکن ہو آگے کے درجات قائم کئے جائیں، اور مناسب نصاب اور نظام تعلیم کے

ساتھ لڑکیوں کو مہذب اور سلیقہ مند و تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی تکمیل کی جائے۔

۴۔ لڑکیوں کی عصری تعلیم کے لئے فی الحال مڈل اسکول ہے، آئندہ انٹر کالج ہونے کے بعد بھی یہی واحد عصری ادارہ ہوگا، جہاں ظاہر ہے مخلوط تعلیم کا نظام ہوگا، اس لئے لڑکیوں کی علاحدہ تعلیم کے لئے بھی ادارہ کی شدید ضرورت ہے، حکومت کی طرف سے اس کی اسکیم بھی ہے، اس سمت بھی مناسب کوشش ہونی چاہیے، اگر گرلس ہائی اسکول کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں دینی تعلیم اور دینی ماحول بھی فراہم کیا جائے تو یہ بہت ہی مناسب قدم ہوگا۔

۴۔ عصری تعلیم میں یہاں کے طلبہ عموماً انٹر اور گریجویشن کرتے ہیں، پھر ملازمت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، آگے کی تعلیم کے لئے بہت کم طلبہ ہی ہمت کر پاتے ہیں، اعلیٰ تعلیم اور مسابقاتی امتحانات کی طرف تو رخ کرنے کا سوچتے بھی نہیں، حالانکہ اگر وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ پورے علاقہ کی نیک نامی ہوگی، اس لئے میڈیکل، سول سروسز اور اس طرح کے دیگر اہلیتی امتحانات کی تیاری کے لئے اسکالرشپ کا نظام قائم کیا جانا چاہیے، اور باصلاحیت طلبہ کو ان میدانوں کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے، اسی طرح امتیازی نمبرات سے کامیاب ہونے والوں کی بھی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، اگر چند سال میں بھی دو چار ڈاکٹر، انجینئر اور اعلیٰ افسران تیار کر لئے تو یہ بہت بڑی ملی و اجتماعی خدمت ہوگی۔

معاشی ترقی کے لئے چند کاموں کی طرف توجہ بہت ضروری ہے:

۱۔ نوجوانوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ملازمت کا ہوتا ہے، سرکاری ملازمت کی جو صورت حال ہے وہ سامنے ہے، اسی احساس کے ساتھ اصلاح معاشرہ کانفرنس میں نوجوانوں سے متعلق ایک اچھی تجویز بھی منظور ہوئی تھی، جو اس وقت روبہ عمل تو نہیں آسکی، یہ تجویز آج بھی قابل عمل ہے، کم از کم اگر علاقہ میں آئی ٹی آئی کا قیام عمل میں لایا جائے یا اسی طرح کی پروفشنل ٹریننگ کا انتظام کیا جائے تو نوجوانوں کا یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے، اور اس سے ہماری معاشی صورت حال بھی اچھی ہوگی۔

۲۔ قصبہ اور اطراف میں ہر جگہ بہت سی بیوہ خواتین، یتیم بچیاں اور غربت کی سطح سے

نیچے رہنے والے بے شمار خاندان موجود ہیں، ایسی عورتوں کے لئے سلائی کڑھائی یا اسی طرح ہوم سائنس کا انتظام کیا جائے تو ان کی حالت بہتر ہوسکتی ہے، حکومت کی طرف سے بھی سلائی سنٹر قائم کرنے کی اسکیم ہے، اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔

۳۔ علاج ومعالجہ جس قدر مہنگا ہو چکا ہے، اس سے سب واقف ہیں، ایسی صورت حال میں ایک غریب آدمی کے لئے کوئی بڑا آپریشن کرانا یا بڑے مرض کا علاج کرانا کس قدر پریشان کن ہوتا ہے، ایسی صورت میں اگر طبی سہولیات کا نظم کیا جائے بایں طور کہ غریبوں کو بڑی علاج کے لئے مالی تعاون دیا جائے، فری میڈیکل کیمپ لگوائے جائیں، تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔

۴۔ میڈیکل مدد (Medical Aids) کے سلسلہ میں دو چیزیں بہت ضروری ہیں، ایک ایمبولینس کی خریداری اور دوسرے چیریٹیبل کلینک (Charitable Clinic) یا چیریٹیبل ہاسپٹل (Charitable Hospitale) کا قیام، ان دونوں کے فوائد ظاہر ہیں، ان دونوں سے قصبہ اور اطراف کی بڑی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، بطور خاص ایمبولینس جس قدر جلدی ممکن ہو خریدا جانا چاہیے۔

یہ سب کام نہیں، علاقہ کی ضرورتیں ہیں، اور ان ضرورتوں کی تکمیل علاقہ کے اہل علم اور ذی شعور طبقہ پر لازم ہے، اگر ہم ان جیسی اجتماعی ضرورتوں کے لئے کوشش نہیں کرتے ہیں تو عنداللہ اس کے باز پرس سے نہیں بچ سکیں گے، اس لئے ان اجتماعی اور ملی کاموں کے لئے کوشش کرنا اور اس سمت حتی المقدور قدم بڑھانا ملی ذمہ داری ہے اور وقت کا تقاضہ بھی۔

سب سے بہتر یہ ہے کہ ان جیسے کاموں کے لئے ملی شعور رکھنے والے اہل علم اور اصحاب ثروت افراد پر مشتمل کمیٹی رٹرسٹ ہو، یا کوئی تعلیمی یا ملی فنڈ قائم کیا جائے، جس کی نگرانی میں یہ سارے امور انجام پائے، اس طرح ان ضرورتوں کی تکمیل کا سامان کیا جائے تا کہ اس سلسلہ میں جوابدہی سے محفوظ رہ سکیں!

مجاہد آزادی ورہبر قوم وملت

بیرسٹر محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

ماہ وسال کے آئینہ میں

۱۸۸۸ء میں یکہتہ کے ایک خوش حال گھرانہ میں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۷ء میں تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے، جہاں یونیورسٹی آف لیڈس سے ٹیٹنگ انجینئرنگ اور مڈل ٹمپل سے بارایٹ لاء کیا۔

۱۹۱۴ء انگلینڈ سے بذریعہ بحری جہاز وطن لوٹے۔

۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی۔

...... ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین منتخب ہوئے۔

۱۹۳۱ء گورنر کاؤنسل کے ممبر کی حیثیت سے بٹائی داری قانون میں غیر سرکاری ترمیمی بل پیش کیا۔

۱۹۳۲ء مہاراجہ دربھنگہ نے دربھنگہ میڈیکل اسکول (جواب ڈی ایم سی ایچ کے نام سے کالج ہے) قائم کیا، آپ بھی اس کے بنیادی ممبر بنائے گئے۔

۱۹۳۲ء میں مسلم ہائی اسکول دربھنگہ کے قیام میں شامل رہے، اوراس کے بانی سکریٹری منتخب ہوئے۔

۱۹۳۴ء وائس چیرمین دربھنگہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی حیثیت سے گاؤں کے لئے مڈل اسکول منظور کروایا۔

۱۹۳۴ء میں دربھنگہ زلزلہ کے متاثرین کی امداد اور بازآبادکاری میں بڑے پیمانہ پر رضاکارانہ خدمات دی۔

۱۹۳۴ء پنڈت جواہرلعل نہرو اور مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی۔

۱۹۳۵ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ سے سسوار کے لئے سرکاری ہاسپیٹل منظور کروایا۔

۱۹۴۸ء میں اپنے ہزاروں کارکنوں کے ساتھ مسلم لیگ چھوڑ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے۔

۱۹۵۲ء میں بینی پٹی سے کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی انتخاب میں کامیابی حاصل کی اور وزیر تعمیرات عامہ بنائے گئے۔

۱۱رفروری ۱۹۵۵ء کو پٹنہ میں اپنے سرکاری رہائش گاہ پر زندگی کی آخری سانس لی۔

ملی وتعلیمی اداروں کے قیام میں شرکت:

مسلم ہائی اسکول دربھنگہ کے بانی سکریٹری
مدرسہ حمیدیہ کے نائب صدر اور پھر صدر
دربھنگہ میڈیکل اسکول کے ممبر
چنددھاری متھلا کالج کے ممبر مجلس منتظمہ
سی ایم کالج کے قیام میں شرکت
یتیم خانہ دربھنگہ کے رکن

سیاسی عہدے اور مناصب:

احرار پارٹی کے نائب ریاستی صدر
خلافت کمیٹی دربھنگہ کے صدر
دربھنگہ مسلم لیگ کے صدر اور ریاستی مسلم لیگ کے نائب صدر
ڈسٹرکٹ بورڈ دربھنگہ کے وائس چیرمین
ممبر اسمبلی ووزیر تعمیرات عامہ بہار
ترہت کمشنرس بورڈ کے ممبر (سب ڈپٹی کلکٹر کی بحالی کے لئے)

آپ کی طرف منسوب ادارے:

شفیع مسلم ہائی اسکول دربھنگہ   شفیع اردو لائبریری یکہتہ   شفیع روڈ بینی پٹی

سوانحی خاکہ

خوش رو، کشادہ جبیں، سادگی پسند، بلند اخلاق، ہمدرد قوم وملت، اخلاق ووضع داری کا پیکر، علم دوست وعلماء نواز، غریب پروری میں بے مثال، متشرع، پابند صوم وصلاۃ، امانت و دیانت اور تقویٰ وطہارت کے پاس دار، قوم وملت کے قافلہ سالار، ملی بصیرت اور قومی خدمت کے جذبہ سے سرشار، جہد مسلسل اور علم پیہم کی مثال......انہی اوصاف وکمالات کے حامل تھے ہمارے ممدوح، محسن قوم وملت جناب بیرسٹر محمد شفیع صاحبؒ، جو اپنی ملی وقومی جذبات، اور اپنی ہمہ جہت خدمات کے لئے ہمیشہ یادرکھے جائیں گے۔

خاندانی پس منظر

قصبہ یکہتہ کا ایک خوشحال خانوادہ جو تعلیم اور فہم وشعور میں ایک عرصہ سے ممتاز رہا ہے، اور جہاں گذشتہ کئی دہائیوں سے سماجی قیادت اور قومی رہبری کا تسلسل بھی چلا آرہا تھا، اسی خانوادہ میں ۱۸۸۸ء میں محمد شفیع صاحب نے آنکھیں کھولیں، دادا خدا بخشؒ پورے علاقہ کے تحصیلدار تھے، اور قصبہ کے سماجی سربراہ بھی، جبکہ والد محترم رحمٰن بخش زمینداروں میں سے تھے، رحمٰن بخش کے صاحبزادگان میں شفیع صاحب کے علاوہ محی الدین، محمد عقیل احمد عقیل اور عبد الغفار بابو شامل ہیں، یہ چاروں بھائی اپنے زمانہ میں معروف رہے ہیں، اور انہیں اپنے اپنے میدان میں بڑی نیک نامی حاصل رہی، شفیع صاحب کے چچازاد بھائی حاجی عبدالحق صاحب بڑے اقبال مند تھے، پورے علاقہ میں ان کی بڑی شہرت تھی، اور سماجی انصاف، حق پسندی، دینداری اور ذکاوت وذہانت میں بے مثل تھے، ایسے خاندان میں شفیع صاحب کی پرورش وپرداخت ہوئی، اور پروان چڑھے۔

تعلیم وتربیت

خاندانی امتیاز اور سیاسی وسماجی تفوق کے نتیجہ میں اس خاندان میں تعلیم کے اعتبار سے ہمیشہ بڑی بیداری رہی ہے، اس زمانہ میں گاؤں میں عصری تعلیم کا کوئی مناسب انتظام نہیں تھا، چنانچہ رحمٰن بخشؒ نے اپنے بچوں کو دربھنگہ میں رکھ کر تعلیم دینا شروع کیا، ضلع ہونے کی وجہ سے یہاں تعلیم کا اچھا انتظام تھا، پھر یہی علم وادب اور تہذیب وسیاست کا مرکز بھی تھا، یہ تینوں بھائی (محی الدین، محمد شفیع اور محمد عقیل) قلعہ گھاٹ میں ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور دربھنگہ راج ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، شفیع صاحب نے انٹرنس (میٹرک) تک یہاں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ان کا ستارہ اقبال بلند ہونا شروع ہوا، جو بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

انگلینڈ کے لئے روانگی

جس زمانہ میں یہ تینوں بھائی دربھنگہ میں زیر تعلیم تھے، اسی زمانہ میں ان کے والد رحمٰن بخشؒ کی کسی زمین کا ایک مقدمہ جو راج دربھنگہ سے متعلق تھا، ہائی کورٹ میں چل رہا تھا، اسی مقدمہ کے سلسلہ میں ان کا رابطہ انگریزوں اور بطور خاص امام فیملی سے ہوا، رحمٰن بخشؒ اس فیملی سے بڑے متاثر ہوئے اور ان کو دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ کاش میرا بیٹا بھی اس طرح ہوتا! دل سے نکلی دعاء بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوئی، اور یہ خیال عملی پیکر اختیار کر گیا، امام خاندان کے توسط سے شفیع صاحب کے انگلینڈ جانے کے مراحل طے ہوئے اور اس طرح ۱۹۰۷ء میں آپ اعلی تعلیم کے لئے انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔

انگلینڈ میں آپ نے تقریباً سات سال کا عرصہ گزارا، یہاں سینئر کیمبرج کے بعد Univercity Of Leads سے Tanning Engineering اور پھر Middle Temple London سے Bar at Law (بیرسٹری) کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۱۴ء میں بحری جہاز سے کلکتہ کے راستہ وطن واپس پہونچے۔

انگلینڈ میں آپ نے یہ عرصہ کس طرح گذارا، وہاں کن کن چیزوں سے متاثر ہوئے، دل

ودماغ نے کن شخصیات اور کن افکار وتمدن کے اثرات کو قبول کیا ان کی تفصیل تو مشکل ہے، البتہ آپ کی دوراندیشی، فہم وبصیرت، بلند حوصلگی اور بلند خیالی میں انگلینڈ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوگا، جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، دوسری اہم چیز یہ کہ مغرب میں ایک عرصہ گزارنے اوراعلی تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے باوجود آپ کا دل مشرقی ہی رہا، علامہ اقبال کی طرح ’نہ چھوٹی مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر گاہی‘ کا دعوی تو نہیں کرسکتے لیکن یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ آپ کی اسلامی قدروں میں کمی نہیں آئی، آپ کا خلوص، ریا اور تصنع کی آمیزش سے پاک رہا۔

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم بتاتے ہیں کہ جب آپ کے انگلینڈ جانے کا پروگرام بن گیا تو خاندان کے لوگوں کو خیال ہوا کہ وہاں کے حالات سے متاثر ہوکر کہیں وہاں شادی نہ کرلیں، مگر ’’وہ مسلمان بن کر گئے اور مسلمان باقی رہ کر واپس آئے‘‘ انگلینڈ جانے سے پہلے آپ کی شادی حافظ سراج الدین صاحب کی بڑی صاحبزادی صغری خاتون سے ہوئی۔

وکالت کی شروعات

انگلینڈ سے واپسی کے بعد آپ کو جلد ہی کلکتہ کی ایک برٹش کمپنی میں ملازمت مل گئی، اور آپ نے ملازمت شروع کردی، اس وقت ملک میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی، آپ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، نتیجتاً ملازمت ترک کرکے واپس آگئے، پہلے مظفرپور میں وکالت شروع کی، جوکہ اس وقت ڈسٹرک کورٹ تھا، پھر جب دربھنگہ ڈسٹرک کورٹ بنا تو یہاں وکالت کرنے لگے۔

آپ بیرسٹر تھے، وکالت کی ایک بڑی ڈگری حاصل تھی، آپ چاہتے تو اس کے ذریعہ بڑی دولت حاصل کرسکتے تھے، مگر آپ نے اسے خدمت کا ذریعہ بنایا، جس کے نتیجہ میں اللہ نے آپ کو بڑی شہرت عطا کی، یہ بات تواتر کی حد تک مشہور ہے کہ آپ غلط کیس نہیں لیتے تھے، مدعی ومدعاعلیہ کے درمیان صلح کی تحریک کرتے تھے، غریبوں کی پیروی بلا معاوضہ بھی کرتے تھے، آپ نے انصاف کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کی، بلکہ آپ کے نزدیک ایمانداری اور انصاف کے ساتھ سمجھوتا جرم کے مترادف تھا، آپ کی ایمان داری اور حق پرستی کے سب ہی

قائل اور معترف تھے، ظہیرنوشاد نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:

> شفیع صاحب حقیقی معنوں میں قوم کے مخلص بیرسٹر تھے، چنانچہ انہوں نے وکالت کے پیشہ کو کبھی اپنی مالی منفعت اور ذاتی مفاد کا ذریعہ نہیں بنایا، مرحوم کا نظریہ یہ تھا کہ قانون کے سوداگر بن جانے سے انصاف کی محافظت ممکن نہیں ہوسکتی، چنانچہ انہوں نے عملاً ثابت کردکھایا کہ قانون داں کو کس طرح سے مظلوموں کی مدد کرنی چاہیے۔

(دربھنگہ میں اردو، ص:۶۹)

سیاست کے میدان میں

اس وقت دربھنگہ ضلع ہونے کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا، چنانچہ آپ وکالت کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے، آزادی کی لڑائی میں آپ اس تندہی سے شریک ہوئے کہ ولایتی شان وتمکنت سب بھول گئے، خان بہادر کا خطاب واپس کردیا، غیرملکی سامان کا استعمال ترک کردیا اور سادگی کو شعار زندگی بنالیا، جسے اخیر دم تک قائم رکھا۔

آپ مختلف پارٹیوں میں شریک رہے، مختلف عہدوں پر فائز رہے، ہرجگہ اور ہمیشہ آپ کا مقصد اور نصب العین وطن کی خدمت اور وطن باسیوں کی رہنمائی کرنا رہا، آپ کے دل میں ملت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، آپ مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور ان کے بہی خواہ تھے، ملک اور ملت کی خدمت ہی آپ کے فکروعمل کا اصل محور تھا، اسی کے گرد آپ کی پوری زندگی گھومتی نظر آتی ہے۔

بلاشبہ آپ نے ملک اور ملت دونوں کے لئے بڑی خدمات انجام دیں، یہ خدمت پوری طرح بے لوث اور مخلصانہ تھی، آپ ملک اور ملت دونوں کے لئے مخلص تھے، آپ سیاست کے بلند مرتبہ تک پہونچے، رکن اسمبلی اور وزیر بنے، مگر آپ کی ایمانداری، وفاشعاری اسی طرح قائم رہی، اور جس طرح آپ کے ذریعہ وکالت کے پیشہ کو وقار حاصل ہوا اسی طرح سیاست میں بھی آپ نے ایک مثال قائم کی، مثال ایک ایماندار سیاست داں کی، ایک سچے محبّ وطن

کی، اور ملت کے ایک مخلص ہمدرد کی۔

ملی دردمندی اور سیاسی بصیرت

ملی درد اور قیادت کی خوبو آپ کو خاندانی وراثت میں ملی، اعلیٰ تعلیم اور تحریک آزادی کی فضا نے اسے دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ کر دیا، چنانچہ جب آپ اس خارزار وادی میں اترے تو پوری بصیرت کے ساتھ اترے، آپ جہاں ماضی سے باخبر تھے وہیں مستقبل پر بھی نظر تھی، آپ کی نگاہیں خوب دیکھ رہی تھیں کہ آنے والے دنوں میں ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا، چنانچہ وقت کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے آپ نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا، قوم کی رہنمائی اور ملی رہبری آسان کام نہیں، یہ دراصل کارگہ شیشہ گری ہے، لیکن آپ نے قومی و ملی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا اسے منزل سے ہمکنار کیا، مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور نازک حالات میں بھی قوم کی صحیح رہنمائی آپ کا نمایاں کام ہے، جناب ظہیر نوشاد صاحب نے آپ کی سیاسی بصیرت کو اپنے خاص انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، جس میں قال کے ساتھ ان کا حال بھی شامل ہے، ہم یہاں ان کا اقتباس مستعار لیتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

> شفیع مرحوم حقیقی معنوں میں باشعور رہنما تھے، انہوں نے سیاسی تغیرات کو ملت کے حق میں فال نیک سمجھا، ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان تغیرات کے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونا نہیں ہوسکتا ہے، تغیر سے زندگی کی نئی راہیں کھلتی ہیں، اور قومیں بلند منزل کی طرف گامزن ہوتی ہیں، انہوں نے ملت کے افراد میں ایک نئی اور بہتر زندگی کی تعمیر کا شوق پیدا کیا، اور برادران وطن کے سامنے شرما کے سر جھکانے کے بجائے سر اٹھا کر چلنے کا راستہ دکھایا، اہل سیاست کو سچ بولنا سکھایا اور سیاست کے میدان میں اپنی عملی وفاداریوں کا عمر بھر ثبوت پیش کیا، شفیع مرحوم جیسے باوقار اور وزن رکھنے والے اگر اس دیس میں پیدا ہوتے رہے تو اقلیت کو سراسیمہ اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(دربھنگہ میں اردو، ص: ۶۸)

آپ کے شعور نے اس کا ادراک کیا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کو ختم کرنے کا صحیح علاج صرف تعلیم ہے، یہی ان کے درد کی دوا اور ان کے زخم کا مرہم ہے، چنانچہ آپ نے ایک طرف مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا، تو دوسری طرف تعلیمی ادارے بھی قائم کئے، متعدد تعلیمی اداروں کے قیام میں شریک رہے، تاکہ آئندہ کی نسل تعلیم سے محروم نہ رہے، اور بطور خاص مسلمانوں کی پیشانی سے ناخواندگی کا داغ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے، مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب بیان کرتے ہیں:

> آپ ہمیشہ تعلیم پر زور دیا کرتے تھے، اپنی تقریر کی ابتدا اکثر ''اذاقال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة '' سے کیا کرتے، آپ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو مسجود ملائک صرف علم کی بنیاد پر بنایا تھا، لہٰذا علم حاصل کرو، آپ جلسوں میں انہی موضوعات پر بات کیا کرتے تھے۔

ملی خدمات

شفیع صاحبؒ کی پوری زندگی ملت کے لئے وقف تھی، تعلیم اور سیاست آپ کی کاوشوں اور سرگرمیوں کے دو اہم عنوان ہیں، ان دونوں کا مقصد مسلمانوں کی ترقی تھا، آپ مسلمانوں کو ہر میدان میں آگے دیکھنا چاہتے تھے، آپ نے اس راہ میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، اور بلاشبہ آپ نے مسلمانوں کو سر اٹھا کر جینے کا ہنر سکھایا، تعلیمی ادارے قائم کر کے مسلمان بچوں کے لئے حصول تعلیم کو آسان بنایا، اسی کے ساتھ فلاحی کاموں میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہے، سیاسی اعتبار سے آپ جس پارٹی میں بھی رہے، آپ کا نصب العین ہمیشہ ایک ہی رہا یعنی قوم اور ملت کی بے لوث خدمت، اور یہی آپ کی امتیازی شناخت ہے۔ جناب انیس احمد صاحب بیان کرتے ہیں:

> مسلمانوں کی دینی و ملی حالت کی اتنی فکر تھی کہ شفیع صاحبؒ جب دربھنگہ سے گاؤں آتے تو اکثر مدرسہ حمیدیہ کے مولانا مقبول احمد صدیقی صاحب یا ان کے علاوہ دوسرے علماء کو ساتھ لاتے، رات میں یہاں ان کا پروگرام کرواتے، پھر صبح یا دوسرے دن ان کو اپنے ساتھ لے کر واپس ہو جاتے۔

ایک یادگار تحریر

خلافت تحریک سے وابستگی کے زمانہ کا آپ کا ایک خط مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے جو مدرسہ کے ذمہ داران کے نام ہے، اس خط میں انگورہ کے لئے تعاون جمع کرنے کی اپیل کی گئی ہے، خط پر تاریخ ۱۹؍جنوری ۱۹۲۲ء کی ہے، اس تحریر کو بطور یادگار نقل کرتے ہیں، خط کا متن اس طرح ہے:

> آپ حضرات سے التماس ہے کہ کل بتاریخ ۲۰؍جنوری ۱۹۲۲ء ہندوستان کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں انگورہ فنڈ وصول کیا جائے گا، اس لئے آپ لوگ بھی دین کے خاطر اس کار خیر میں مستعدی سے شرکت کریں گے، اور ثواب دارین حاصل کریں گے، آج کل خلافت کی حالت بہت ہی نازک ہو رہی ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ کل اپنے محلّہ میں ہر مسلمان سے کچھ نہ کچھ انگورہ فنڈ کے لئے جمع کریں، امید کی جاتی ہے کہ آپ حضرات کل کا دن مذہب کی خدمت میں صرف کریں گے۔ فقط
>
> (دستخط) محمد شفیع
>
> نائب سکریٹری خلافت کمیٹی، دربھنگہ
>
> خط کے اوپر خلافت کمیٹی لہریا سرائے دربھنگہ کی مہر ثبت ہے۔ (۱)
>
> (مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، تاریخ کے آئینہ میں ص: ۱۵۶)

۱۹۳۴ میں دربھنگہ میں بڑا زلزلہ آیا، جس نے بڑی تباہی مچائی، اس موقعہ پر آپ نے بڑے پیمانہ پر رفاہی خدمات انجام دیں۔

تعلیمی خدمات

تعلیم کے باب میں شفیع صاحبؒ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، دراصل آپ کے دل میں ملت کی ترقی کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا، اسی درد اور کسک نے آپ کو ہمیشہ سرگرم عمل رکھا، مسلمانوں کی زبوں حالی اور پسماندگی کی فکر آپ کے ذہن و دل میں پوری طرح سوار تھی،

ہمیشہ اس کے لئے بے چین رہتے، اور جب جو ممکن ہوتا کر گزرتے۔

اس سلسلہ کی سب سے بڑی خدمت جسے کارکے بجائے کارنامہ کہنا صحیح ہوگا، مسلم ہائی اسکول کا قیام ہے، عصری تعلیم کے لئے یہ ادارہ آپ نے اپنے دوستوں کے ساتھ قائم کیا، اس اسکول کے قیام کی مختصر روداد کچھ اس طرح ہے:

> ۳؍اگست ۱۹۳۲ء کو انجمن اسلامیہ دربھنگہ میں مسلمانوں کا جلسہ عام ہوا، جس میں یہ طے پایا کہ مسلمان بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک مسلم ہائی اسکول کی ضرورت ہے، جس کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، ۵؍فروری ۱۹۳۳ء کو ہائی اسکول کا دستور بنانے کے لئے دربھنگہ کے اہل علم واہل دانش کی نشست انجمن اسلامیہ میں ہوئی، جس میں اسکول کے مالی اور انتظامی امور کے لئے پانچ افراد پر مشتمل مجلس امناء کی تشکیل ہوئی، جس کے صدر مولانا مقبول احمد خاں صاحب قرار پائے، دیگر حضرات میں جناب شفیع صاحب، ڈاکٹر محمد فرید صاحب، مولوی عبدالودود صاحب اور مولوی عبدالنعیم صاحب شامل تھے، ۱۵؍دسمبر ۱۹۳۳ء کی ایک میٹنگ میں جناب ڈاکٹر سید محمد فرید کو صدر اور محمد شفیع صاحب کو سکریٹری لکھا گیا ہے، ممکن ہے بعد میں ذمہ داری تقسیم ہوئی ہو، اس وقت یہ اسکول انجمن اسلامیہ کے احاطے میں شروع ہوا، چند برسوں بعد یہ اپنی جگہ منتقل ہوا، مگر کسی وجہ سے حکومت نے وہ زمین ایکوائر کر لی، اس کے بدلے بیتا میں زمین الاٹ کی گئی، کچھ مسلم اہالیان دربھنگہ نے بانی سکریٹری جناب محمد شفیع صاحب کی قیادت میں کچھ اور اراضی حاصل کی، اور اس طرح یہ اسکول یہاں منتقل ہوا، شمالی حصہ پر موجود بلڈنگ اسی عہد رفتہ کی یادگار ہے۔

(مجلّہ شفیع، جولائی ۲۰۰۱ء، 'منارہ علم وارتقاء شفیع مسلم ہائی اسکول'، از عطاء الرحمٰن رضوی)

اس اسکول کی ابتداء سے لے کراس کی تعمیر وترقی تک تمام کوششوں اوراس کی تمام سرگرمیوں میں شفیع صاحب شریک رہے، اوراپنے خون جگر سے اس منارۂ علم کو سینچتے اور پروان چڑھاتے رہے، اسکول کے قیام اورترقی میں یقیناً دربھنگہ کے تمام ارباب علم ودانش کا حصہ ہے، یہ سبھوں کا مشترکہ سرمایہ ہے، ملت کے ان محسنین کے اسماء گرامی تاریخ میں ہمیشہ جلی حرفوں سے لکھا جائے گا، اس فہرست میں محمد شفیع صاحبؒ کا نام ضرور سرفہرست ہوگا، ان تمام حضرات کی کوششوں سے اخلاص اور ہمدردی سے لگایا ہوا علم وعرفان کا یہ پودا آج ایک شجر سایہ دار کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس کو بعض اہل نظر نے ''دربھنگہ کا علی گڑھ'' بھی کہا ہے۔

مسلمانوں کے تعلیمی فروغ میں اس اسکول کا بڑا نمایاں کردار رہا ہے، اس زمانہ میں ہائی اسکول کی بڑی حیثیت تھی، یہی اس وقت اعلیٰ تعلیم شمار کی جاتی تھی، اوراس کی بنیاد پر بہت سی ملازمتیں ملتی تھیں، اس سے ہزاروں مسلم بچے فیض یاب ہوئے، یہاں سے علم کی روشنی حاصل کرکے اپنی زندگیاں روشن کیں، سماج میں روشنی کے علمبردار بنے، قوم کے مصلح بنے، ملی و سیاسی قائداور رہنما بنے، ایک بڑی تعداد حکومت کے بلند مناصب پر فائز ہوکر اپنا اور اپنے ادارہ کا نام روشن کرتے رہے، علم وادب کا یہ چشمہ اب بھی جاری ہے، عہد رفتہ کی یہ علمی یادگار ہمارے اسلاف کی خدمات وہ زندہ جاوید تصویریں ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بانی سکریٹری کی خدمات کو سچی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اسکول کے انتظامیہ نے اسکول کو جناب محمد شفیع کی طرف منسوب کرنے کا لائق تحسین قدم اٹھایا ہے، اب یہ ''شفیع مسلم ہائی اسکول'' کے نام سے موسوم ہے۔

دوسرا ادارہ جو آپ کی کوششوں کا رہین منت ہے وہ گاؤں کا مڈل اسکول ہے، جسے آپ نے ۱۹۳۴ء میں اس وقت حکومت سے منظور کروایا جب آپ ضلع کے وائس چیرمین تھے، اس اسکول کا بھی تعلیم کے فروغ میں بڑا حصہ ہے، ان کے علاوہ دربھنگہ میڈیکل اسکول کے قیام میں آپ شریک رہے، جسے ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ دربھنگہ نے قائم کیا تھا، مدرسہ حمیدیہ کے نائب صدراور پھر صدر رہے، چندرھاری متھلا کالج کے ممبر مجلس منتظمہ رہے، سی ایم کالج کے قیام

میں بھی شریک رہے، مدرسہ رحمانیہ بھی آپ کے فیض سے محروم نہیں رہا، آپ نے ہی اس کا الحاق کرایا، ان کے علاوہ کئی اردو ورنا کولر مڈل اسکول بھی ڈسٹرک بورڈ سے کھلوائے، یہ وہ ادارے ہیں جن کے قیام یا جن کی ترقی میں کہیں نہ کہیں مرحوم کا خون جگر ضرور نظر آتا ہے۔

آپ مسلم بچیوں کو بھی تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے، ان کے لئے گرلس اسکول کے قیام کے لئے فکرمند تھے، مگر زندگی نے وفا نہیں کی، اور یہ آرزو پوری نہیں ہوسکی، اسی طرح ایک کالج بھی قائم کرنا چاہتے تھے، مگر یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔

(دربھنگہ میں اردو، ص:۱۷)

گاؤں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے آپ نے کوشش کی، لڑکیوں کے لئے خاص ایک مکتب (حافظ نور صاحب والا) آپ کی توجہ کی مثال ہے۔

یہ تو اداروں کی بات تھی، تعلیم سے آپ کی فکرمندی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بہت سے ہونہار طلبہ کی فیس آپ خود ادا کرتے تھے، آپ کو معلوم ہوتا کہ فلاں طالب علم میں تعلیم کا شوق ہے مگر معاشی حالت اس قابل نہیں ہے، یا اس طرح کا کوئی بھی آپ سے ملتا تو آپ اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے، متعدد لوگوں نے بتایا کہ آپ ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ رکھ لیتے، یا ان سے کہتے کہ داخلہ کی رسید میرے پاس بھیج دینا، تم کو فیس مل جایا کرے گی، اور واقعی ان کو فیس ملتی رہی، یہ خاموش خدمت نہ معلوم کتنے لوگوں کی کرتے رہے، اس طرح آپ کے تعاون سے بہت سے لوگوں نے اعلی ڈگریاں حاصل کیں، کتنے ڈاکٹر اور انجینئر بنے، ملت کی خدمت کا یہ طریقہ واقعی ایک مثال ہے، یہی لوگ ملت کے محسن اور معمار کہلانے کے صحیح مستحق ہیں، یہ قوم کے وہ محسن تھے جن کی ساری تگ ودو اللہ کو راضی کرنے کے لئے ہوتی تھی، شفیع صاحب کی یہ خاموش خدمت متعدد خاندانوں کی ترقی کا سبب تو بنی ہی ساتھ ہی خود ان کے لئے کتنا بڑا ذخیرہ آخرت بن گیا، ڈاکٹر رحمت اللہ صاحب اس کی بہترین مثال ہیں، آپ نے اپنے بھتیجوں، بھانجوں کے علاوہ برادری وغیر برادری کے کئی لڑکوں کو اپنے پاس رکھ کر پڑھایا۔

سیاسی خدمات

دربھنگہ میں وکالت کے دوران آپ نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا، یہیں سے آپ کے سیاسی سفر کا آغاز ہوتا ہے، اس وقت آزادی کی تحریک پورے زوروشور کے ساتھ ملک میں چل رہی تھی، آپ بھی اس تحریک میں شامل ہوئے اور جلد ہی اپنی تدبر، دوراندیشی، اور جہد مسلسل کے ذریعہ میر کارواں کا مقام حاصل کرلیا، خلافت کمیٹی، احرار پارٹی اور مسلم لیگ کا جنگ آزادی میں جو کردار رہا ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، آپ ان تحریکوں میں شامل رہے، شروع میں خلافت تحریک سے جڑے، خلافت کمیٹی دربھنگہ کے نائب سکریٹری، سکریٹری اور پھر صدر بھی رہے، احرار پارٹی سے بھی آپ کا تعلق رہا، اس کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور پوری گرم جوشی کے ساتھ اس کی سرگرمیاں انجام دیتے رہے، آپ مسلم لیگ کے ریاستی نائب صدر اور دربھنگہ ضلع کے صدر عہدہ پر فائز رہے، ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے اور اخیر وقت تک اس سے تعلق باقی رہا، پٹنہ کے بیرسٹر عزیز، بیرسٹر یونس وغیرہ سے رفاقت اسی تحریک آزادی کے حوالہ سے تھی۔

اس طرح شفیع صاحب ایک طویل عرصہ تک میدان سیاست میں سرگرم عمل رہے، ابتدائی دور میں اپنے معزز پیشہ وکالت کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، لیکن بعد میں یہی سرگرمیاں ان کی زندگی کا اصل محور بن گئیں، اور صحیح لفظوں میں کہا جائے تو وہ خود سرگرمیوں کا ایک حصہ بن گئے، آپ ان پارٹیوں میں بلند مناصب پر فائز رہے، مسلم لیگ کا ریاستی نائب صدر بننا خود ایک اعزاز کی بات ہے، ملک کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد مسلم لیگ کی جو حیثیت تھی، اس کا صحیح اندازہ اِس وقت کیا بھی نہیں جاسکتا، مگر اس کے باوجود آپ کی اصول پسندی، ایمانداری، سادگی اور غریب پروری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سیاست کے حوالے سے آپ کی ایک بڑی خدمت جو ہمیشہ یادرکھی جائے گی یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب آپ گورنر کاؤنسل کے رکن تھے، آپ کے ذریعہ بٹاداری قانون سے متعلق ایک ایکٹ Non Official Amendment Bill پیش ہوا، یہ قانون غریبوں کے

حق میں تھا، اس وقت مہاراج دھیراج دربھنگہ نے آپ کو اس بل کو پیش کرنے سے روکنے کی پوری کوشش کی، آپ کی خدمت میں اپنے مخصوص قاصد کے ذریعہ سونے کی تھالی میں دعوت نامہ بھیجا، مگر آپ نے ان کی دعوت کو ٹھکرادیا اور ان کے تحائف واپس کردئے، یہ آپ کے کردار کی بلندی کی ایک مثال ہے۔

آپ کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی اس وقت بھی سامنے آئی جب ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، یہ آپ کی فکر اور قوتِ ارادی کا گویا ایک امتحان تھا، مسلم لیگ سے ذہنی اور عملی لگاؤ ہونے کی وجہ ایک طرف مسلم لیگ کا فیصلہ مسلمانوں کے پاکستان منتقل ہونے کا تھا، دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کے حالات تھے، پھر آپ کا تعلق محمد علی جناح اور سردار عبدالرب نشتر وغیرہ سے براہ راست تھا، اس لحاظ سے پاکستان میں آپ کی ترقی کے مواقع زیادہ تھے، آپ وہاں بلند عہدے اور مناصب حاصل کرسکتے تھے، اس نازک حالات میں آپ نے نہ صرف ایک اہم فیصلہ کیا بلکہ پوری قوم کی صحیح رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا، جس میں آپ کی دوراندیشی جھلک رہی تھی، یہ فیصلہ ہندوستان میں رہنے کا تھا، آپ نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا، اور مسلمانو ں کو بھی یہیں رہنے پر آمادہ کیا، یہ ایک دوراندیشانہ فیصلہ تھا، بعد کے حالات نے جس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

تقسیم ملک کے بعد آپ نے کانگریس میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ء میں آپ اپنے ہزاروں رضا کاروں کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوگئے، ۱۹۵۲ء میں بسفی حلقہ سے کانگریس کے پرچم تلے اسمبلی الیکشن کے امیدوار بنے اور کامیابی حاصل کی، ڈاکٹر شری کرشن سنہا نے آپ کی عوامی مقبولیت، سیاسی سوجھ بوجھ اور قومی وملی خدمات کو دیکھتے ہوئے اپنی کابینہ میں شامل کیا اور تعمیرات عامہ کا وزیر بنایا۔

بعض لوگوں کی طرف سے آپ کو وزیر تعمیرات عامہ بنائے جانے کی مخالفت بھی کی گئی، اور یہ بات پارٹی کے ہائی کمان تک پہونچی مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے آپ کو وزارت میں شامل کرنے کی منظوری دے کر دوراندیشی کا ثبوت دیا، آپ نے اپنی خدمات کے ذریعہ ثابت

کردیا کہ واقعی آپ اس وزارت کے اہل تھے۔

آپ نے اپنی وزارت سے عوامی ترقی کے بہت سے کام کروائے، وسائل کی کمی کے باوجود سڑکوں کا جال بچھایا، بہت سے پل بنوائے، بہار کی بہت سی سڑکیں آپ کی رہین منت ہیں، جن میں بطور خاص دربھنگہ۔شکری، جھنجھار پور۔پھلپر اس، کھٹونہ۔لوکہا، دربھنگہ۔جئے نگر اور رہیکا۔بنی پٹی شاہراہیں شامل ہیں، آپ کی ان کوششوں سے بہار میں آمدورفت کی جو سہولت ہوئی اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

آپ کا سیاسی تصور قومی یکجہتی اور سیکولرزم کی بنیادوں پر قائم تھا، برادران وطن کے ساتھ آپ کے بڑے خوش گوار تعلقات تھے، سب کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنر خوب جانتے تھے، آپ کے رضا کاروں میں ہندو مسلم دونوں طبقہ کے افراد تھے، اور دونوں میں یکساں محبوب بھی تھے، آپ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو برداران وطن کے ساتھ ملک کی خدمت کے لئے آگے آنا چاہیے، سیاست میں داخل ہوکر ہی ہم اپنا حق لے سکیں گے۔

اہل علم ودانش سے تعلق

سیاست سے آپ کا تعلق ضرور تھا مگر آپ روایتی سیاست داں نہیں تھے، سیاست کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی علم اور اہل علم سے آپ کا ربط وتعلق بدستور قائم رہا، مولانا قمر اعظمی، مولانا مقبول احمد خاں، مولانا عبدالعلیم آسی، الحاج عبدالخالق خلیق، خان بہادر عبدالجلیل، پنڈت جانکی نندن مشر، شری گریندر موہن مشر، رام نند مشر، پروفیسر عبدالمنان بیدل، مولانا شفیع داؤدی، مفکر دین مولانا آزاد سبحانی، مجاہد آزادی سید محمود بیرسٹر، مطیع الرحمٰن، بیرسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار، یہ وہ شخصیات ہیں جن کے علم ودانش کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، ان حضرات سے آپ کا ربط وتعلق تھا، بعض سے یارانہ تھا تو بعض آپ کے احباب خاص تھے، وزارت کے دور میں جسٹس خلیل، کرنل اسحاق، سید نذیر حیدر، محترمہ انیسہ امام اور جسٹس نقی امام اکثر شام کو آپ کے ساتھ بیٹھ کر علمی وملی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے، معروف مجاہد آزادی اور سابق نائب وزیر حکومت ہند ڈاکٹر سید محمود نے ایک بار مہینوں آپ کے یہاں قیام کیا تھا۔

معاصرین ومعاونین

اوپر جن اصحاب علم وفضل کا تذکرہ ہوا یہ سب آپ کے معاصرین میں ہیں، ان کے علاوہ جو احباب اور رفقاء کار آپ کو میسر رہے ان میں ڈاکٹر سید فرید، مولوی عبدالودود، عبدالحمید خاں وکیل، مولانا مقبول احمد، خانصاحب ڈیوڑھی، ڈاکٹر سید فرید، پیارے صاحب رجسٹرار وغیرہ کا تذکرہ نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی، عبدالحمید خاں صاحب سے آپ کی رفاقت کی روداد بیان کرتے ہوئے جناب ظہیر نوشاد لکھتے ہیں:

> ہادی قوم وملت شفیع مرحوم کے ساتھ اپنے خون سے وضو کر کے نماز قوم وملت ادا کرنے والوں میں مولوی حمید خاں کا نام ہمیشہ یاد رہے گا، کیونکہ ان دونوں مخلص رہنماؤں کے درمیان چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، ان دو محسنین ملک وقوم نے ایک ساتھ مل کر سیاسی زندگی کو متحرک اور فعال بنانے میں اجتماعی کارنامے انجام دئے، شروع شروع میں شفیع مرحوم دربھنگہ ضلع مسلم لیگ پارٹی کے صدر اور حمید خاں صاحب سکریٹری تھے، پھر اس کے بعد مسلم ہائی اسکول لہیر یاسرائے کی بنیاد ڈالنے میں بھی برابر شریک رہے۔
>
> (دربھنگہ میں اردو، ص:۷۵)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جنہیں آپ کے رفقاء اور معاونین کی فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے، مگر بعد زمانہ اور کچھ اپنوں کی بے توجہی کی وجہ سے ان مخلصین کے نام محفوظ نہیں رہ سکے، بہر حال جن حضرات نے قوم وملت کی جو بھی خدمت انجام دی ان کو خواہ قوم بھلا بھی دے مگر وہ اللہ کے رجسٹر میں موجود رہیں گے، اور اپنے عمل کے بقدر انعامات سے سرفراز ہوں گے، اگر ہم ان کو یاد رکھتے ہیں تو یہ ان کا اعزاز نہیں بلکہ اپنے ذوق اور صالح فکر کا ثبوت دیتے ہیں۔

خصوصی اوصاف وکمالات

جناب محمد شفیع مرحوم ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے، آپ جس میدان میں بھی رہے

هرجگہ آپ کا کردار مثالی رہا،آپ گفتار کے نہیں کردار کے غازی تھے،آپ کی زندگی سراپا حرکت وعمل کا نام ہے،جس میں قوم وملت کے لئے بڑا پیغام پوشیدہ ہے۔

ایمانداری،اصول پسندی،غریبوں سے محبت،قومی ترقی کے لئے جہد وعمل،آپ کے نمایاں اوصاف ہیں،اخلاق وتواضع اورشرافت آپ کے خمیر میں شامل تھا،حق کے لئے لڑنا اورحق بات کہنا آپ کی زندگی کا مقصد تھا،تو سیاست کوقومی وملی خدمت سمجھنا آپ کا ایمان تھا، ہندومسلم اتحاد کے داعی تھے،مسلمانوں کی بیداری اوران میں تعلیمی فروغ آپ کا نصب العین تھا،جس سے کبھی انحراف نہیں کیا،اس کے لئے اخیر دم تک کوشاں رہے۔

سادگی کا یہ حال تھا کہ تقریباً ۳۵ ربرسوں تک دربھنگہ میں کرایہ کے ایک مکان میں رہے، پارٹی کے ریاستی نائب صدر سے لےکروزارت تک کی کرسی پر متمکن رہے،مگر شہر میں ایک گز زمین نہیں خرید سکے،جوتنخواہ ملتی تھی مہینہ کے اخیر تک ختم ہوجاتی تھی،اس میں رشتہ داروں کی کفالت اورمحتاجوں کی امداد کا بڑا حصہ ہوا کرتا تھا،کبھی بینک میں کھاتا نہیں کھولا،کوئی رقم جمع نہیں کی،وراثت میں ملی زمین کے علاوہ کوئی ملکیت حاصل نہیں کی،آخری وقت میں صرف چھ سوروپئے جیب میں تھے،اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

دینداری کا یہ عالم تھا کہ خالص عصری تعلیم یافتہ اورولایت پلٹ تھے،مگر بقول مولانا ممتازعلی مظاہری صاحب ’’متشرع تھے،شکل سے مولوی لگتے تھے،داڑھی رکھتے تھے‘‘۔

جناب نیاز صاحب بتاتے ہیں کہ آپ ایک مرتبہ حضرت مولانا بشارت کریمؒ سے ملنے گھڑول شریف پہونچے،جب آپ حضرت کی خدمت میں پہونچے تو حضرت فوراً باہرتشریف لائے اورآپ کو سینے سے لگایا۔

اہل علم سے تعلق،ان کے ساتھ حسن سلوک،اوروضع داری میں مشہور تھے۔

امانت کا اتنا خیال تھا کہ اپنے ذاتی کاموں کے لئے سرکاری سواری استعمال نہیں کرتے تھے۔

ایسے مخلص قائد،ملت کے محسن اورقوم کے رہبر چراغ رخ زیب لےکر ڈھونڈنے سے

بھی کہاں ملیں گے ع

اب ڈھونڈانہیں چراغ رخ زیبا لےکر

انتقال

۱۱رفروری ۱۹۵۵ء کوملک اس بے لوث اورمخلص رہنما سے محروم ہوگیا،وزارت کے دوران اپنے سرکاری رہائش گاہ پٹنہ میں آپ کا انتقال ہوا،نعش وطن لائی گئی،وزیراعلی بہار ڈاکٹرشری کرشن سنہاخراج عقیدت کے لئے دربھنگہ آئے،پٹنہ سے پھلہر اگھاٹ تک اسپیشل پانی جہاز سے،وہاں سے گھوگھڈ یا اسپیشل ٹرین سے اورپھر وہاں سے گاؤں تک موٹرگاڑی سے آپ کا جسد خاکی لایا گیا،پہلی نماز جنازہ انجمن اسلامیہ پٹنہ میں ہوئی،دوسری دربھنگہ میں اور تیسری گاؤں میں،اوریہیں سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین عمل میں آئی۔

مسلمانوں میں بہت رہنما پیدا ہوئے اورآئندہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے،مگر شفیع صاحبؒ جیسے مخلص رہنما صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں،اب تو یہی کہا جاتا رہے گا کہ ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

رہبر قوم وملت شفیع بیرسٹر مرحوم

ظہیر نوشاد دربھنگوی

شفیع صاحب مرحوم ہندوستان کی جنگ آزادی کے عظیم ستون تھے، زمانہ میرے بچپن کا تھا، مسلم لیگ کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی اور شفیع مرحوم دربھنگہ ضلع کے صدر بھی تھے، بالآخر ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا، اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک وحشت ناک خونی باب ختم ہوگیا۔

حصول آزادی کے بعد مسلمانان ہند شدید بے دست وپائی کے احساس میں مبتلا تھے، یہ زمانہ سنگین حقائق سے دوچار ہونے کا زمانہ تھا، ایسے نازک دور میں قوم وملک کی نمائندگی کرنا ''کارگہہ شیشہ گری'' سے کم نہیں تھا، لیکن شفیع مرحوم نے اس نازک دور میں بھی خندہ پیشانی کے ساتھ قوم کی نمائندگی کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک قوم کے ساتھ مل جل کر اسی وطن میں زندگی گزار دی، حالانکہ آزادی کے بعد عتاب کے خوف سے وہ چاہتے تو پاکستان چلے گئے ہوتے، وہاں جاکر بڑے بڑے عہدے پر بھی فائز ہوسکتے تھے، کیونکہ کچھ تو ان کی اپنی خدمات تھیں اور کچھ مسٹر محمد علی جناح کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات بھی تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس سے بھی ان کے کردار کی بلندی پر روشنی پڑتی ہے۔

شفیع مرحوم کی شخصیت کوئی ہنگامی شخصیت نہ تھی، ان کی حیات جاودانی کا راز ان کی پر خلوص فطرت میں مضمر تھا، وہ صحیح معنوں میں ملک وقوم کے سچے خادم تھے، مرحوم نے نئے دور کے تقاضوں کا گہرا مطالعہ کیا، اور انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوکر ملت کے افراد کے اندر خوداعتمادی اور سیاسی بیداری کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے آخری عمر تک کام کرتے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد پوری قوم حیران وپریشان تھی، بڑے بڑے جیالے سورماؤں کے

پائے استقامت میں لغزش پیدا ہوچلی تھی، لیکن اس بحرانی دور میں بھی انہوں نے قوم کی صحیح رہنمائی کی اور بحرانی دور کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے قوم کے افراد کو تیار کیا، اور ماضی کی تاریخ کو بھلاکر صدق دل سے انڈین کانگریس میں شامل ہوکر اپنے سیاسی شعور کو مضبوط کرنے کا پرخلوص مشورہ دیا، آج جب اس دور کی فضا پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ع

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

شفیع صاحب مرحوم کی زندگانی کا ایک بڑا سیاسی معرکہ وہ بھی تھا جب وہ الیکشن جیت کر آنجہانی سری کرشن سنہا کی وزارت میں پی ڈبلوڈی کے منسٹر بنائے جارہے تھے، ارباب سیاست کے حلقوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، اور سینکڑوں درخواستیں ان کے وزیر بنائے جانے کی مخالفت میں کانگریس ہائی کمان کے پاس بھیجی گئیں، مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے شفیع مرحوم کو وزارت میں شامل کرکے اپنی دوراندیشی کا ثبوت پیش کیا، اور مرحوم نے وزارت کا عہدہ سنبھال کر یہ ثابت کردیا کہ ان کا انتخاب ہر لحاظ سے مناسب تھا، آزادی کے بعد مسلمانوں کو صحیح نمائندگی کی ضرورت تھی، اور اسے مرحوم نے پورا کیا۔

شفیع مرحوم حقیقی معنوں میں باشعور رہنما تھے، انہوں نے سیاسی تغیرات کو ملت کے حق میں فال نیک سمجھا، ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان تغیرات کے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونا نہیں ہوسکتا ہے، تغیر سے زندگی کی نئی راہیں کھلتی ہیں، اور قومیں بلند منزل کی طرف گامزن ہوتی ہیں، انہوں نے ملت کے افراد میں ایک نئی اور بہتر زندگی کی تعمیر کا شوق پیدا کیا، اور برادران وطن کے سامنے شرما کے سر جھکانے کے بجائے سر اٹھاکر چلنے کا راستہ دکھایا، اہل سیاست کو سچ بولنا سکھایا اور سیاست کے میدان میں اپنی عملی وفاداریوں کا عمر بھر ثبوت پیش کیا، شفیع مرحوم جیسے باوقار اور وزن رکھنے والے اگر اس دیس میں پیدا ہوتے رہے تو اقلیت کو سراسیمہ اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی، مرحوم جمہوریت اور سیکولرزم کے پکے شیدائی تھے، یہی وجہ ہے کہ اکثریتی طبقہ کے لوگوں سے خوشگوار تعلقات استوار کئے اور زندگی کی آخری سانس تک ملت کی نمائندگی کرتے رہے، مرحوم نے ایک بالغ نظر سیاست داں کی حیثیت سے جو کردار ادا کیا ہے

اس کے متعلق مزید کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، ماسوا اس کے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے
واقعات کی تاریخ کو ازسرِ نو دہرا دیا جائے۔

دربھنگہ نے ہر دور میں کچھ نہ کچھ اہلِ نظر، مدبر، مفکر، عالم دین اور سیاستداں ضرور پیدا
کئے ہیں، لیکن حال کا احساس، ماضی کا تحفظ اور مستقبل کی تعمیر کی قدروں کی نمائندگی کرنے
کا حق صرف ایک ذات واحد شفیع مرحوم کو پہونچتا ہے۔

شفیع مرحوم کی شخصیت ایک ماہر قانون داں کی بھی تھی، اور اس شعبہ میں بھی ان کا قومی
اور انسانی جذبہ کارفرما رہا، لیکن میں اس پہلو پر روشنی ڈالنے کا خود کو اہل نہیں پاتا ہوں، لہذا
صرف چند باتیں اپنی یادوں کے ورق سے الٹ پلٹ کر پیش کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

شفیع مرحوم دربھنگہ ضلع کے غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے نئے دور کے تقاضوں کو شدت
کے ساتھ محسوس کیا، اور مغربی طرز تعلیم کی افادیت سے مستفید ہونے کے لئے انگلینڈ تشریف
لے گئے، اور وہاں سے بیرسٹری کی ڈگری ساتھ لے کر اپنے وطن (دربھنگہ) واپس آئے، مرحوم
نے دربھنگہ کورٹ میں پریکٹس شروع کی، اور تھوڑے دنوں کے بعد ان کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا،
شفیع صاحب حقیقی معنوں میں قوم کے مخلص بیرسٹر تھے، چنانچہ انہوں نے وکالت کے پیشہ کو کبھی
اپنی مالی منفعت اور ذاتی مفاد کا ذریعہ نہیں بنایا، مرحوم کا نظریہ یہ تھا کہ قانون کے سوداگر بن
جانے سے انصاف کی محافظت ممکن نہیں ہو سکتی، چنانچہ انہوں نے عملاً یہ ثابت کر دکھایا کہ ایک
قانوں داں کو کس طرح مظلوموں کی مدد کرنی چاہیے، افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے
ملک میں وکالت کے پیشہ کو اب تک اس جذبہ کے تحت بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔

شفیع مرحوم نے اردو داں طبقہ کے طرز عمل کا بھی ازسرِ نو جائزہ لیا اور اس طبقہ کی
اصلاح کی ضرورت محسوس کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زندہ قوم کے افراد ہمیشہ دوسروں کی
انگلیاں پکڑ کر چلا نہیں کرتے، لہٰذا مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے اور باوقار و باعزت
زندگی گزارنے کے لئے تعلیم کی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔

شفیع مرحوم کی پیدائش یکہتہ نامی گاؤں، تھانہ پھلپراس میں ہوئی، اور یہ علاقہ تعلیمی،

ادبی، اور سیاسی اعتبار سے اس وقت کافی پسماندہ مانا جاتا تھا، لیکن مرحوم نے اپنی کوششوں سے
اس کا کایا پلٹ دی، انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنی قومی و ملکی ذمہ داریوں کو
بطرز احسن محسوس کیا، کہ بغیر تعلیم کے قومیں دنیا میں کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتیں، تعلیم حاصل ہونے
کے بعد ہر طرح کا شعور خود بخود پیدا ہو جایا کرتا ہے، مرحوم نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر
زور دیا، اور اس کے حصول کے لئے اپنے چند رفقائے کار کے تعاون سے خاص شہر دربھنگہ میں
۱۹۳۴ء میں مسلم ہائی اسکول لہریاسرائے کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں مرحوم کے نام پر شفیع مسلم ہائی
اسکول کے نام سے مشہور ہوا، اس اسکول نے شمالی بہار کے اردو داں طبقہ کے حق میں وہی
کردار ادا کیا جو علی گڑھ نے اردو زبان کے سلسلہ میں انجام دیا ہے۔

شفیع مرحوم کو ملت کے ہونہار طلبہ سے بے پناہ محبت تھی، اور وہ اکثر ذہین و ہونہار نادار طلبہ کو
اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے، اور ان کے تمام اخراجات خود ہی برداشت کیا کرتے تھے، ان کی
شخصیت بہت سی شخصیتوں کی معمار ہے اور شمالی بہار کی بہت سی شخصیتیں ان کی بڑائی کا نشان ہیں۔

مرحوم نے اپنی زندگی کی بیشتر پونجی ہونہار طلبہ کی تعلیم میں لگا دی اور بہت سے طلبہ کو مالی
امداد دے کر ڈاکٹر اور انجینئر وغیرہ بنایا، دربھنگہ شہر میں ایک کالج اور اردو گرلس اسکول قائم
کرنے کا بھی مرحوم کا ارادہ تھا، خدا کا شکر ہے کہ ملت کالج بن گیا اور گرلس اسکول کا کام ڈاکٹر
عبدالوہاب صاحب کی نگرانی میں تکمیل پا رہا ہے۔

شفیع صاحب اپنے دور کے عظیم قانون داں اور رہنما تھے، ان کے خیال میں بڑا اعتدال
اور توازن تھا، مستقبل پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اور وہ اپنی قوم کے سیاسی امام تھے، مرحوم پیغمبر
تو نہیں تھے، لیکن ان کی شخصیت میں بہت کچھ پیغمبرانہ صفت تھی، انہوں نے قوم کے لئے جو کچھ
کیا اسے فراموش کرنا ایک تاریخی غلطی اور بد دیانتی ہے، صوبہ بہار ویسے بھی ایک پسماندہ صوبہ
ہے اور دربھنگہ کے حصے میں کچھ زیادہ ہی پسماندگی رہی، لہٰذا ایک ایسے علاقے میں تعلیم اور
تہذیب کے دیئے جلانا بڑے دل گردے کا کام ہے، یہ کام مرد آہن ہی انجام دے سکتے ہیں،
اس لحاظ سے شفیع مرحوم کو بہار کا مرد آہن کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

میرے خیال میں شفیع مرحوم کی شخصیت ایک ایسی ہمہ گیر، متنوع اور طوفان بدوش شخصیت ہے جس کے ایک پہلو کو اجاگر کرنے سے کئی اور متعدد پہلو اپنے دامن میں نئی نئی کہانیاں لے کر ابھر آتے ہیں، اور اس طرح زندگی سے زندگی اور کہانیوں سے کہانیاں بنتی چلی جاتی ہیں، اور یہ ساری کہانیاں ہماری قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں، ان کہانیوں کو گاہے گاہے پڑھتے رہنے سے ہماری قومی زندگی میں تازگی اور حرکت پیدا ہوتی رہے گی، لہٰذا میں ممبران انتظامیہ کمیٹی شفیع مسلم اسکول سے پرزور الفاظ میں التماس کروں گا کہ ہر سال پابندی کے ساتھ ''یوم شفیع'' منانے کا اہتمام وانتظام کریں، تاکہ ہماری نئی نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے باخبر ہوتی رہے، ایک اور بات یہ ہے کہ اب تک حکومت بہار کی جانب سے بھی مرحوم کے شایان شان یادگار قائم نہیں کی جاسکی ہے، اس سلسلہ میں بھی اہل دربھنگہ کو مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ شفیع مرحوم کی موت ہماری قومی زندگی کا ایک زبردست نقصان ہے، جس کی تلافی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم مرحوم کو زندہ رکھیں۔

بہر حال یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ ہر انسان کی موت پر رسمی الفاظ سے تعزیت کی جاتی ہے، لیکن شفیع مرحوم صحیح معنوں میں عظیم انسان تھے، اور ان کے بارے میں رسمی الفاظ کے ذریعہ تعزیت کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے، اور یہ خود میرے دل کو ایسا کرنے سے تسلی حاصل ہو سکتی ہے، ان جملوں تک پہونچتے پہونچتے میری آنکھیں بھر آئی ہیں اور دل ڈوبتا جارہا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ شفیع مرحوم کی شخصیت اتنی ہمہ گیر وعظیم ہے کہ ان پر سب کچھ لکھ جانے کے بعد بھی ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کا احساس مجھے ستاتا رہے گا، اس لئے بس ایک اس ایک شعر پر مضمون ختم کرتا ہوں

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لئے

(ماخوذ از: دربھنگہ میں اردو، ص:٦٦)

آہ! بیرسٹر محمد شفیعؒ

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم

{یہ مولانا دامت برکاتہم کی واحد تحریر ہے، جو ہمیں مل سکی، اس یادگار تحریر کو بطور نمونہ یہاں نقل کرتے ہیں، آپ نے یہ مضمون ۱۵ر رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ کو سہارنپور کے زمانۂ اعتکاف میں برادرم مولانا حسان اختر ندوی مململی (جو اس وقت مظاہر علوم میں دورۂ حدیث کے طالب علم تھے) کو املا کرایا تھا، حسن اتفاق کہ اس کی ایک کاپی حسان بھائی کے پاس موجود تھی، ان کے بے حد شکریہ کے ساتھ یہ مضمون شامل کیا جارہا ہے}

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

صوبہ بہار کا دربھنگہ ضلع نہایت ہی مردم خیز ثابت ہوا ہے، اس کی گود میں بے شمار ذی وقار شخصیتوں نے جنم لیا، جنہوں نے قوم وملت اور وطن عزیز کی فلاح وبہبود کی خاطر اپنی زندگی وقف کردی، اور اپنی بے لوث خدمات واحسانات کے بدلہ میں قوم وملت سے خراج تحسین کا نذرانہ حاصل کیا، انہیں اہم شخصیات میں مسٹر محمد شفیع صاحب مرحوم کی ذات گرامی بھی ہے، جو اپنے تقوی وطہارت، علم دوستی، وطن پرستی وحق پرستی کی وجہ سے پورے بہار میں مشہور ہوئے، ان صفحات میں مختصرا موصوف کی حیات، اوصاف وکمالات، گوناں گوں خدمات اور زندگی کے اہم واقعات راقم الحروف اپنی یادداشت کی روشنی میں سپرد قلم کررہا ہے۔

شفیع صاحب مرحوم اپنی ابتدائی تعلیم ضلع اسکول دربھنگہ میں مکمل کر کے ۱۹۰۷ء میں انگلینڈ اعلی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے، ۱۹۱۴ء میں بیرسٹر کی ڈگری لے کر ہندوستان لوٹے اور مظفر پور میں لا کی پریکٹس شروع کی، بعد میں جب دربھنگہ میں ڈسٹرکٹ کا قیام ہوا تو دربھنگہ چلے آئے، اور یہیں دربھنگہ میں گامی صاحب کے مکان محلّہ بیتا میں رہ کر پریکٹس شروع کیا، شروع سے ہی مزاج میں Social Work کا جذبہ تھا، ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی، اور کانگریس میں شریک ہو کر ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا، وہ ۱۹۳۵ء میں دربھنگہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے پہلے ہندوستانی وائس چیرمین منتخب ہوئے، ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک بہار لیجسلیٹیو کانسل lagislative councle کے نامزد ممبر رہے، وہ Non Coopration Movement میں بہت ہی اہم رول ادا کرتے رہے، یہی وجہ ہے کہ انگریز گورنمنٹ نے ان کو خان بہادر کے ٹائٹل سے نوازا، لیکن انہوں نے یہ ٹائٹل لینے سے انکار کر دیا اور میڈل جو گورنمنٹ نے بھیجا تھا اس کو فوراً واپس کر دیا، وہ تحریک احرار پارٹی کے اہم رکن اور بہار کونسل میں اس کے ڈپٹی لیڈر رہتے، وہ خلافت تحریک کے بھی اہم رکن تھے، اور بہار میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

قومی خدمت کا جذبہ اس قدر تھا کہ وہ پریکٹس کی بھی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، دربھنگہ میں مسلم ہائی اسکول اور یتیم خانہ قائم کیا اور تاحیات اس کے سکریٹری رہے، مدرسہ احمدیہ کے اہم رکن تھے، اور مدرسہ حمیدیہ کے صدر تھے، وہ دربھنگہ میڈیکل کالج (جو اس وقت میڈیکل اسکول تھا) کے ممبر تھے، غربا پروری بہت زیادہ تھی، قومی جذبہ کے تحت ضلع کے بہت سے غریب طلبہ کو اپنی جیب سے وظیفہ اور اپنے مکان میں رکھ کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا وہ مسلم لیگ کے ضلع صدر بھی تھے۔

اپنی ایمانداری، ہندو مسلم اتحاد، اور حب الوطنی کے لئے پورے بہار میں مشہور تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ملک کے بٹوارہ کے بعد وہ ہندوستان میں ہی رہے، اور یہیں قیام کرنا پسند کیا، آزادی کے بعد پہلا الیکشن مدھوبنی ضلع کے بینی پٹی ویسٹ جواب بسفی کے نام سے مشہور ہے

ایم ایل اے ہوئے اور شری کرشن سنہا کی قیادت میں بنی وزارت میں پی ڈبلو ڈی وزیر بنائے گئے، دربھنگہ جئے نگر، بینی پٹی، دربھنگہ پھلپراس روڈ انہی کا دین ہے، ۱۲؍جنوری ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا ۔

آسمان تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں ان کے دور وزارت میں پٹنہ گیا تھا، انہی کی کوٹھی میں قیام تھا، سرکاری کام کے تحت ان کو صاحب پور کمال وغیرہ جانا تھا، ان کے پی اے نے کہا آپ ہم لوگوں کے ساتھ چلئے، کرایہ وغیرہ نہیں لگے گا، اس زمانہ میں وزراء وغیرہ کے لئے ایک سیلون لگتا تھا، جس کے ذریعہ ان کا سفر ہوتا تھا، جب کار بکنگ آفس دیگھا گھاٹ سے آگے بڑھ گئی تو منسٹر صاحب نے کہا مولوی صاحب آپ نے ٹکٹ لیا، میں نے کہا نہیں، آپ لوگوں کے ساتھ سمتی پور تک چلا جاؤں گا، ٹکٹ سے بچ جاؤں گا، ان کا جواب سنئے، انہوں نے کہا کہ یہ گاڑی ہم لوگوں کے لئے ہے، آپ کا جانا مناسب نہیں ہے، چنانچہ بکنگ آفس گاڑی واپس لائی گئی، میرا ٹکٹ لیا گیا، جس کا پیسہ منسٹر صاحب نے دیا یا میں نے دیا، یہ خیال نہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ میری گاڑی پر گئے تو خدا کے یہاں مواخذہ ہوگا، اس واقعہ سے ہمارے وزراء کو سبق لینا چاہیے۔

وہ ایک درویش صفت انسان تھے، ہم لوگوں نے بار بار کہا کہ پختہ مکان بنوا لیجئے، انہوں نے جواب دیا کہ یہاں کا پختہ مکان چند روزہ ہے، وہاں کا پختہ مکان دائمی ہے، وہاں کی فکر کرنی چاہیے، بہرحال زندگی بھر انہوں نے پختہ مکان نہیں بنایا۔

موصوف گامی کے مکان میں تقریباً پچاس سال قیام پذیر رہے، جب منسٹر ہو کر پٹنہ چلے گئے تو لوگوں نے کہا کہ گامی کا مکان نہیں چھوڑیئے، ملک کے قانون کے مطابق مکان آپ کا ہو گیا، انہوں نے کہا خدا کا قانون ایسا نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے گامی کا مکان خالی کر دیا۔

وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین بنے، اگر چاہتے تو آج دربھنگہ شہر میں ان کے کتنے ہی مکانات ہوتے، مگر انہوں نے کبھی اس طرف دھیان نہیں دیا، اور یہ خیال رکھا کہ دنیا اور دنیا کی

ساری چیزیں فانی ہیں، یہ دنیا جی لگانے کی جگہ نہیں ہے، یہ عبرت کی جا ہے تماشا گاہ نہیں۔

وہ ایک علم دوست انسان تھے، چنانچہ جہاں کہیں ان کا بیان ہوتا وہ قرآن کی تلاوت کر کے بتاتے کہ علم ہی کی وجہ سے حضرت آدم مسجود ملائک بنے، ان کی علمی یادگاروں میں شفیع مسلم ہائی اسکول، لہیریا سرائے، اور یتیم خانہ دربھنگہ ہے، ملت کالج بھی کھولنے کا ارادہ تھا، مگر زندگی نے وفا نہیں کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ملت کالج ان کے خوابوں کی تعبیر ہے، وہ ایک سچے پکے دیندار مسلمان تھے، ذات پات، مسلم غیر مسلم، کا امتیاز ان کے ذہن میں نہیں تھا، وکالت کا پیشہ ضرور کرتے اکثر فری اور بغیر فیس کے کاموں کو انجام دیتے تھے، گامی کے مکان میں رہنے کے زمانہ میں روزانہ دو چار مسافر قیام گاہ پر آتے، ان کے قیام وطعام کا فری نظم ہوتا تھا، بے شمار اہم واقعات ان کے ہیں جو میرے دماغ میں اب محفوظ نہیں ہیں۔

اپنے منسٹری کے زمانہ میں محافظ دستہ پولس کا ان کے بنگلہ میں نہیں رہتا تھا، وہ ایک مرنجان مرنج انسان تھے، دورِ وزارت میں بھی گھر ہی سے غلہ وغیرہ آتا تھا، وہاں بھی برابر واردین وصادرین کا مجمع رہتا تھا۔

اب میں اپنی طول بیانی کو ختم کرتا ہوں، اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالی مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کا نعم البدل ہم لوگوں کو عطا فرمائے۔ وماذلك على الله بعزيز۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

منظوم خراج عقیدت

پروفیسر عبدالمنان طرزی
(دربھنگہ)

عیسوی اٹھارہ سو اٹھاسی کو یوں جانئے — اس برس بیشک شفیع محترم پیدا ہوئے
جائے پیدائش اگر موضع یکہتہ مانیے — وہ ضلع "مدھوبن" کے حرف "یائے" آگے چاہیے
فروری اگیارہ اور انیس سو بچپن ہی تھا — دارفانی سے یہ اپنا رہ نما رخصت ہوا
عیسوی انیس سو وہ سات ہی کا سال تھا — مقصد تعلیم اعلی اس کو لندن لے گیا
عیسوی انیس سو بارہ میں واپس بھی ہوا — کورٹ دربھنگہ میں وہ بیرسٹری کرنے لگا
مخلص وایماندار وحق شناس وحق شعار — مل گیا تھا قوم کو ایک رہ نما بھی غم گسار
رہ نمائے قوم ہونا سب کی قسمت بھی نہیں — سب کو ملتی زندگی میں یہ سعادت بھی نہیں
سب کے دامن کو میسر ایسی دولت بھی نہیں — سب کی پیشانی میں لکھی یہ عبارت بھی نہیں
یہ شعور زندگی اک فضل ہے اللہ کا — جو شفیع صاحب کو حاصل تھا بخوبی مرحبا
اس کے بازو میں بھرا تھا جیسے عزم آہنی — خدمت ملت کو سمجھا اس نے اپنی زندگی
اس کو رکھتی تھی پریشاں قوم کی پسماندگی — زندگی اس کی فقط تھی جستجوئے روشنی
اپنے ملک وقوم کا گنج گراں وہ دیدہ ور — تھا جو صوبائی حکومت کا وزیر مقتدر
اس کو کب تھی باعث اعزاز کچھ بیرسٹری — وہ معزز جس سے تھا خدمت تھی ملک وقوم کی
بارآور اس کی ہے سعی فروغ علم بھی — ہائی اسکول ایک شفیع مسلم شہادت ہے بڑی
تھا جو نائب صدر صوبائی خلافت لیگ کا — مدرسہ یعنی حمیدیہ میں بھی ایسا ہی تھا

باخوشی لوٹا دیا تھا ''خان بہادر'' کا خطاب   پیشکش کو غیرت قومی کا تھا اچھا جواب

وہ مجسم خلق وعدل وراستی کا تھا نصاب   دل میں احساس غلامی وطن کے پیچ وتاب

لیگ اور احرار پارٹی سے بھی وابستہ رہا   چاہتا تھا ملک کو آزاد اپنے دیکھنا

میڈیکل اسکول دربھنگہ ،یتیم خانہ بھی   رکنیت جن دواردوں کی اسے حاصل رہی

بیدل وآزاد سبحانی سے علمی دوستی   ڈاکٹر محمود سے گرتھی تو سر یونس سے بھی

سر وہ فخرالدین وسر عبدالعزیز وسرامام   دل سے اس کی قدر کرتے تھے وہ سب عالی مقام

گھر جو موروثی تھا کوئی گھر اس کے سوا نہیں   کھولتا کیوں بینک میں کھاتہ کہ پیسہ ہی نہ تھا

گھر میں دربھنگہ کرائے کے رہا جب تک   اک وزیر ایمان دار ایسا ہے کم دیکھا گیا

اس کی بس ایمان داری ضامن عظمت رہی   سب کے دل میں ایسے قائد کی بڑی عزت بھی تھی

(ماخوذ از: دیدہ وران بہار ص:۱۷۶)

منظوم خراج عقیدت

رفیق انجم دربھنگوی

رفیق انجم دربھنگوی نے شفیع صاحب سے متعلق تقریباً ۱۵۵ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم کہی ہے، جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

انجم خدائے پاک کی حمد وثناء کے بعد   پڑھ کر درود دل میں شہ دوسرا کے بعد

ان پر لکھو کہ جن پر زمانہ کو ناز تھا   اپنے کا ذکر کیا ہے بگانے کو ناز تھا

لاکھوں میں انتخاب کسی ایک کا ہوا   ایثار لا جواب کسی کا ہوا

کچھ ایسی شخصیت تھی جناب شفیع کی   ان پر ہی اختصار میں ڈالوں گا روشنی

اے دوستو شفیع بیرسٹر تمام عمر   صدقے کئے حیات کے گوہر تمام عمر

جیسے چراغ گل ہو پتنگوں کو چھوڑ کر   حضرت شفیع نے سارے عزیزوں کو چھوڑ کر

سرسٹھ برس کی عمر کے زینے پر جب گئے   چپ چاپ اپنے رب حقیقی سے جا ملے

محبوب ہر نظر میں بلا امتیاز تھے   حق مغفرت کرے بڑے حق نواز تھے

جاتے ہیں سب جہاں سے مگر صاحب کمال   کچھ یادیں چھوڑ جاتے ہیں بننے کو ایک مثال

ایسے ہی باکمال جناب شفیع تھے   اپنے نقوش چھوڑ کے روپوش ہوگئے

غیرت تھی وہ کہ ایسی جوانی نہ تھی پسند   ان کو فرنگیوں کی غلامی نہ تھی پسند

انگریزوں کے عناد کا یوں دیدیا جواب   واپس وہ کر کے خان بہادر کا بھی خطاب

باخلق اہل علم کا اکرام بھی کیا   آزادی وطن کے لئے کچھ کام بھی کیا

چوٹی کے رہنماؤں سے وابستگی رہی   دانشوران وقت کی ہمسائیگی رہی

تعمیر کے وزیر تھے سنہا کے دور میں / آیا نہ کوئی فرق ان کے طور میں

کبر و غرور کے رہے سائے سے دور / خلوت گزیں تھے دل میں کمالات کے طیور

ناخواندگی کے نقش مٹائے دیار میں / تعلیم کے چراغ جلائے دیار میں

الفت میں اپنی قوم کی سرشار تھے بہت / ہردم فروغ علم کو تیار تھے بہت

اپنی کمائی کا تو ادھیلا نہیں رکھا / سب تشنگان علم کے مصرف میں دے دیا

وہ پیکر خلوص کہ منزل کہو جنہیں / قوم و وطن کے درد سے بسمل کہو جنہیں

اس سادگی زیست پہ قربان جائیے / تازندگی مکیں رہے کچے مکان کے

ایقان کی صفت سے عبارت تھی زندگی / ان کی تو ذات سربسرا ایک کائنات تھی

وہ رعب و دبدبہ کہ جب اجلاس پر گئے / ہرسمت خاموشی کے نظارے بکھر گئے

دانش کدوں سے بس کہ محبت رہی سدا / ترویج علم دین کی چاہت رہی صدا

ہم لوگ کھیلتے تھے لڑکپن کی چھاؤں میں / ہوتا تھا ان کا تذکرہ تب گاؤں میں

ذروں کو یاد کرتے ہیں تاروں کو بھول کر / اب مطمئن ہیں اپنے بزرگوں کو بھول کر

لازم ہے اہل علم پر ایسا تو کچھ کریں / اللہ ان کے کاموں کو افشا تو کچھ کریں

اللہ شفیع سا کوئی سپوت دے / ملت کی ناخدائی کا جو کچھ ثبوت دے

محسن ملت

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم

ماہ وسال کے آئینہ میں

۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں مڈل پاس کیا۔

۱۹۳۶ء میں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف گئے۔

۱۹۴۶ء میں مدرسہ عزیزیہ سے عالمیت مکمل کی۔

۱۹۴۶ء میں مدرسہ رحمانیہ میں پہلی بار استاد بنے۔

۱۹۴۸ء میں مونگیر میں رہ کر پرائیویٹ سے میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

۱۹۴۹ء میں مظاہر علوم سہارنپور پہونچے، جہاں متفق علیہ درجہ میں داخلہ ہوا۔

۱۹۵۰ء میں مظاہر علوم سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

۱۹۵۰ء میں دوبارہ مدرسہ رحمانیہ میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔

۱۹۵۸ء میں مسلم ہائی اسکول دربھنگہ میں اردو و فارسی استاد کی حیثیت سے ملازمت ملی۔

۱۹۹۰ء میں 'بیسٹ ٹیچر نیشنل ایوارڈ' کے لئے آپ کا انتخاب ہوا۔

۵/ستمبر ۱۹۹۱ء کو اس ایوارڈ سے نوازے گئے۔

۱۹۹۴ء میں مدرسہ رحمانیہ سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۹۶ء میں معہد البنات یعقوبیہ کے نام سے لڑکیوں کا ایک ادارہ قائم کیا۔

سوانحی خاکہ

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں آزادی وطن کی جو تحریک شروع ہوئی وہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز تک پورے ملک میں پھیل چکی تھی، ہر جگہ آزادی کے متانے، وطن کے جیالے انگریزوں سے ٹکر لے رہے تھے، جنگ کے مختلف محاذ قائم تھے، اور ہر محاذ پر غلامی کی زنجیر کو توڑنے اور انگریزوں کو شکست دینے کی کوششیں جاری تھیں، ان حریت پسندوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی، جن کی قیادت مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا مظہر الحق اور دوسرے رہنما کر رہے تھے، ان قائدین کی آواز شہروں سے ہوتے ہوئے قصبات، اور گاؤں دیہات تک پہونچ چکی تھی، اور ہر جگہ آزادی کے چرچے تھے، انگریزوں کے ظلم وستم کی داستانیں تھیں، زبان پر آزادی کے ترانے تھے اور دلوں میں آزادی کا خواب تھا۔

شہروں کے ساتھ قصبات اور دیہاتوں کا بھی یہی حال تھا، بلکہ کسان انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ بنتے تھے، اس لئے ان کے درمیان یہ تذکرہ زیادہ رہتا، وہ بھی ان سرگرمیوں کے سننے کے مشتاق ہوتے، کسی کو کوئی خبر ملتی تو اکثر اسی کا چرچہ رہتا، اپنی سطح کے مطابق وہ بھی ان موضوعات پر اظہار خیال کرتے، اس طرح سارے لوگ اپنی آنکھوں میں آزادی کا خواب سجائے نئی صبح کا انتظار کر رہے تھے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

یہی وہ زمانہ تھا جب غالباً ۱۹۲۲ء میں قصبہ یکہتہ کے ایک دینی گھرانے میں مولانا ممتاز علی صاحب کی پیدائش ہوئی، آپ کے والد محترم کا نام محمد سلیمؒ اور والدہ کا نام خاتونؒ ہے، قصبہ کے عام لوگوں کی طرح آپ کے خاندان کے افراد بھی کھیتی کرتے تھے، آپ کے چچا حافظ محمد

یعقوب صاحبؒ اچھے حافظ تھے اور تدریس میں مشغول تھے، ابھی عمر چھ سال کو ہی پہونچی تھی کہ والد کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا، والدہ اور چچا کے ہاتھوں آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی، اور انہی دونوں کی نگرانی میں آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا، حافظ محمد یعقوب صاحبؒ مدرس کے ساتھ اچھے مربی بھی تھے، انہوں نے آپ کی تربیت پر خاص توجہ دی، وہ تعلیم کی پوری نگرانی کرتے، ان کی خواہش تھی کہ آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، چنانچہ گھریلو حالات کے سازگار نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی کوشش سے آپ کی تعلیم کا نظم کیا، آپ کی اعلیٰ تعلیم دراصل انہی کی رہین منت ہے، ان کے علاوہ دوسرے چچا حافظ عبد الرزاق صاحب بھی آپ پر توجہ دیتے، مولانا خود بیان کرتے ہیں:

> ایک مرتبہ ہم محلّہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیت چلے گئے، اس دوران چچا عبد الرزاق کی نظر پڑ گئی، انہوں نے اس بات پر ہمیں بہت عار دلایا، اس توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کبھی ہم مدرسہ سے غائب نہیں ہوئے۔

اس وقت گاؤں میں دو تعلیمی ادارے تھے، مدرسہ رحمانیہ جو دینی تعلیم کا مرکز تھا اور مڈل اسکول جہاں عصری تعلیم دی جاتی تھی، ناظرہ قرآن ختم کرنے کے بعد آپ نے مدرسہ میں حفظ قرآن شروع کیا، ساتھ ہی اسکول بھی جاتے تھے، اس وقت کے اساتذہ میں حافظ حبیب اللہؒ اور حافظ محمد حنیفؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں، آپ نے ان دونوں سے قرآن کریم اور مولانا زین الدین صاحبؒ سے 'فارسی کی پہلی' اور 'آمدنامہ' پڑھی۔

مولانا دامت برکاتہم اپنے اساتذہ میں مولانا زین الدین صاحب کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں، میں نے ایک مرتبہ اس کتاب کی فہرست دکھائی تو خاص طور پر فرمایا کہ میرے نام سے پہلے مولانا کا ذکر کیجئے، وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے استاد محترم کا بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔

مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں

آپ حفظ مکمل نہیں کر سکے، البتہ ۱۹۳۵ء میں مڈل پاس کر لیا، اس کے بعد مزید تعلیم کے

لئے قصبہ سے باہر جانے کی امنگ پیدا ہوئی، اس وقت بہار میں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، جامعہ رحمانی مونگیر اور دوسرے ادارے مشہور و معروف تھے، ان اداروں کا بڑا نام تھا، اور طلبہ کا بڑا ہجوم تھا، قصبہ کے دوسرے لڑکے مدرسہ عزیزیہ میں پڑھتے تھے، چنانچہ آپ کے سلسلہ میں بھی وہیں جانے کا فیصلہ ہوا، ۱۹۳۶ء میں آپ بہار شریف پہونچے، اور مدرسہ میں داخلہ لے کر پڑھنا شروع کیا، یہاں آپ نے دس سال تک تعلیم حاصل کی اور ۴۶ء میں عالمیت کا نصاب مکمل کیا، یہاں علاقہ کے سینئر طلبہ میں حافظ محمد رفیق ململیؒ جیسے مربی ملے، جن کی نگرانی و تربیت سے بڑا فائدہ پہونچا، اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، ان کے علاوہ مولانا محمد حنیفؒ اور دوسرے اساتذہ سے قریبی تعلق رہا، یہ سب آپ پر شفقت فرماتے تھے۔

بہار شریف میں ابھی آپ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر ملک کے حالات خراب ہو گئے، جس کی وجہ سے آپ بہار شریف نہیں جا سکے، مگر آپ نے ہمت نہیں ہاری، مونگیر کا رخ کیا، اور وہاں رہ کر پرائیوٹ سے میٹرک کی تیاری شروع کی، ۱۹۴۸ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے، آپ کا طائر شوق اب بھی بلند آشیانہ کی تلاش میں تھا، عالمیت مکمل ہو چکی تھی، آپ دورۂ حدیث کسی بڑے ادارہ میں کرنا چاہتے تھے، اور یہ جذبہ شوق کی حد تک پہونچا ہوا تھا، مگر قدرت کو ابھی منظور نہیں تھا، چنانچہ مونگیر سے واپس وطن لوٹے، یہاں مدرسہ رحمانیہ کی مسند تدریس و اہتمام آپ کی منتظر تھی، چنانچہ مدرسہ کے ذمہ داروں کے اصرار پر آپ نے مسند تدریس کو زینت بخشی، اور تدریس کا آغاز کیا۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں

مدرسہ رحمانیہ میں ابھی ایک یا دو سال پڑھایا ہوگا کہ شوق نے پھر کروٹ لی، دیوبند یا سہارنپور سے دورۂ حدیث کرنے کی خواہش جو چنگاری کی شکل میں دبی ہوئی تھی شعلہ بن گئی، تقاضہ بڑھنے لگا، ادھر حالات خراب ہونے کی وجہ سے گھر والوں نے سفر سے روکا، مشفق چچا نے حالات کا حوالہ دیا کہ ابھی حیدرآباد کی جنگ چل رہی ہے، فضا خراب ہے، مگر آپ نے

ایک نہ مانا،اور رخت سفر باندھ لیا، بالآخر دیوبند پہونچے، یہاں ہم وطنوں میں مولانا صابر صاحبؒ اور مولانا عبدالباقی ململیؒ ملے،انہوں نے سہارنپور جانے کا مشورہ دیا، کہ وہاں امتحان آسان ہوتا ہے،داخلہ آسانی سے ہوجائے گا،چنانچہ آپ سہارنپور پہونچے،آگے کا واقعہ مولانا خود بیان کرتے ہیں:

> داخلہ کے ممتحن حضرت مولانا منظور احمد سہارنپوری تھے،انہوں نے مجھ سے عبارت پڑھنے کو کہا، میں نے اعلم کے بعد انّ بالکسر پڑھا،مولانا نے کہا آپ کا امتحان ہوگیا،داخلہ موقوف علیہ میں ہوگا،دورہ میں نہیں، میں نے یہ عذر کیا کہ میرے گارجین نے صرف ایک سال کے لئے اجازت دی ہے،مولانا نے فرمایا یہیں رہیں،موقوف علیہ کے بعد دورہ کریں،پھر مولانا نے کتابیں بھی تجویز کردی، جواس طرح تھیں،جلالین،مشکوۃ شریف،ہدایہ اولین،رسم المفتی اورسراجی، میں نے مولانا کے فیصلہ کو بسروچشم قبول کیا اور تعلیم شروع کردی۔

یہاں آپ کو مشہور ومعروف اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا،ان میں بطور خاص مولانا عبداللطیفؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ اور مفتی محمود الحسنؒ سے استفادہ کیا، بخاری شریف حضرت شیخ الحدیثؒ سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی،ان حضرات کے علاوہ حضرت تھانوی کے خلیفہ حضرت مولانا اسعداللہ صاحبؒ کی شفقتیں بھی آپ کو میسر آئیں،حضرت آپ پر خاص توجہ فرمایا کرتے تھے،مولانا نے بھی ان کی خوب خوب خدمت کی،اور بھرپور استفادہ کیا، سونے کے وقت بطور خاص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پاؤں دباتے،حضرت اس وقت طلبہ کو مستفید فرمایا کرتے تھے،کبھی نصیحت کرتے،کبھی حماسہ اورکبھی متنبّی کے اشعار سناتے۔

دورہ کی تکمیل کے سال ہی شعبان میں حضرت شیخ الحدیثؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی،حضرت نے اسے منظور فرمایا اور بیعت کی۔

مدرسہ رحمانیہ میں دوبارہ تدریس

مظاہر علوم سہارنپور سے دورۂ حدیث کی تکمیل اور وہاں کے اساتذہ اور مشائخ سے دو

سال استفادہ کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں وطن واپس آئے،اور سابقہ مشغولیت یعنی مدرسہ رحمانیہ میں تدریس شروع کی،جس وقت آپ تشریف لائے اس وقت مدرسہ میں ابتدائی تعلیم ہوتی تھی،دوتین اساتذہ مصروفِ تدریس تھے،مدرسہ کے سکریٹری سمیع الدین بابوؒ تھے۔

آپ نے آتے ہی تعلیم سے پوری دلچسپی لینا شروع کردی،بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت پر توجہ دی، مدرسہ کے حالات کو سنبھالا،تدریس کے ساتھ انتظامی امور بھی دیکھتے،اس طرح تدریس اوراہتمام دونوں کی ذمہ داریاں سنبھالنے لگے،آپ کی شب وروز محنت اور پیہم کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ کے تعلیمی معیار میں خاطرخواہ ترقی ہونے لگی، مدرسہ کی حالت پہلے سے اچھی ہوگئی،اسی درمیان بیرسٹر محمد شفیعؒ نے ۱۹۵۲ء میں مدرسہ کا الحاق اکزامیشن بورڈ پٹنہ سے وسطانیہ تک کرایا۔

تدریس کے ساتھ عصری تعلیم

آپ میٹرک کا امتحان پہلے پاس کرچکے تھے،تدریس کے زمانہ میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا،فاضل حدیث ،فاضل تفسیر کے ساتھ عصری تعلیم میں آئی اے(I.A)اوربی اواے(B.O.A) کے امتحانات دئے اور کامیابی حاصل کی۔

مسلم ہائی اسکول دربھنگہ میں ملازمت

آپ کی کوششوں سے مدرسہ ترقی کی راہ پر گامزن تھا کہ ۱۹۵۸ء میں فارسی واردو کے مدرس کی حیثیت سے مسلم ہائی اسکول دربھنگہ(جو بانی سکریٹری کی طرف منسوب ہوکر ''شفیع مسلم ہائی اسکول'' کے نام سے مشہور ہے) میں آپ کا تقرر ہوگیا،چنانچہ آپ مدرسہ چھوڑ کر یہاں کی تدریس میں مشغول ہوگئے،ابھی یہاں صرف چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ مدرسہ میں آپ کی کمی محسوس ہونے لگی،آپ کے مدرسہ سے چلے جانے کی وجہ سے وہاں کی تعلیم متاثر ہونے لگی۔

آپ کے جانے سے مدرسہ پر کیا اثر پڑا؟اس کا اندازہ کاروائی رجسٹر کی ایک تحریر سے

لگایا جاسکتا ہے، مولانا نے دربھنگہ جانے کے لئے دوسال کی رخصت لی تھی، اس سلسلہ میں ۲۸/مارچ ۵۹ءکو مجلس منتظمہ کی میٹنگ کی کاروائی اس طرح ہے:

> مولانا ممتاز علی صاحب کی درخواست منظور شدہ دوسالہ بلا مشاہرہ پر سکریٹری نے حسب ذیل باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اراکین مدرسہ سے پرزور انداز میں کہا کہ ان کی درخواست کو مسترد کرکے جلد از جلد ان کو اپنی جگہ پر واپس لے آئیں، ان کی عدم موجودگی کے باعث مدرسہ کے کاموں میں اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے بہت نقصان ہوا اور ہوتا رہے گا، اور بہت ممکن ہے کہ ان کی غیبوبت کے باعث مدرسہ کا وجود ہی ختم ہوجائے، ان کے چلے جانے سے میرے اوپر کاموں کا بوجھ بہت زیادہ ہوگیا ہے، اگر وہ نہیں بلائے جاتے ہیں تو میں اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں۔ (کاروائی رجسٹر)

چنانچہ ذمہ داران نے اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیا، اور یہ طے پایا کہ مولانا کو پھر مدرسہ بلایا جائے، اس وقت مدرسہ کے سکریٹری محبّ الحسن صاحبؒ تھے، مولانا کو بلانے پر ان کا اصرار سب سے زیادہ تھا، چنانچہ اراکین مدرسہ کی تجویز پر جناب حاجی عبدالرؤفؒ و حاجی منیرالدینؒ دربھنگہ پہونچے، آپ سے ملاقات کی، مدرسہ کی صورتحال سے آگاہ کیا اور سکریٹری صاحب کا پیغام سنایا، مولانا نے جب یہ صورتحال دیکھی تو بڑے متردد ہوئے، گہرائی سے سوچا، بعض احباب سے مشورہ بھی کیا، آپ کے بعض احباب کی رائے تھی کہ آپ اسکول کو نہ چھوڑیں، کیونکہ یہ سرکاری ملازمت ہے اور جملہ سہولیات موجود ہیں، جبکہ دوسرے احباب کی رائے تھی کہ مولانا مدرسہ واپس جائیں، اس وقت مدرسہ کو مولانا کی ضرورت ہے، اور مدرسہ کے اراکین بلانے بھی آئے ہیں، لہٰذا مدرسہ کو سنبھالنا زیادہ ضروری ہے، مولانا نے بالآخر دوسری رائے پر فیصلہ کیا اور ایک مہینہ کی تنخواہ چھوڑ کر مدرسہ آگئے۔

مدرسہ رحمانیہ میں تیسری بار آمد اور تعلیمی عروج

آپ جب گاؤں پہونچے تو لوگوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، آپ کی آمد سے مدرسہ میں

گویا بہار آگئی، نوخیز کلی جو مرجھانے لگی تھی، شبنم کے قطرے پاکر تازہ ہوگئی، آپ نے پہلے سے زیادہ محنت شروع کی، تعلیم پر توجہ دی، اور مدرسہ کو پھر سے آگے بڑھانے کی فکر میں لگ گئے۔

ایک طرف آپ کو اساتذہ کا پورا تعاون ملا، دوسری طرف مدرسہ کے اراکین نے ہر اعتبار سے آپ کو حوصلہ دیا اور بھرپور مدد کی، اس طرح ان سب کے مشترکہ تعاون سے تعلیم میں بڑی تیزی سے ترقی ہونے لگی، نئی عمارت بننے لگی، نئے نئے درجات کھلتے گئے، یہاں تک کہ وہ مبارک دن بھی آیا جب ۷۳-۱۹۷۲ء میں تعلیم فاضل تک پہونچ گئی۔

یہ موقع نہ صرف مدرسہ بلکہ پورے علاقہ کی تاریخ میں یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ مدرسہ کا نقطۂ عروج تھا، مدرسہ رحمانیہ علاقہ کے طلبہ کے لئے تعلیم کا ایسا مرکز قرار پایا جہاں ابتداء سے فاضل تک کی تعلیم کا نظم تھا، جس کی فضاء میں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں گونجتی تھیں، بڑی تعداد میں دور دراز سے طلبہ مدرسہ کا رخ کررہے تھے، بڑی عمر کے طلبہ دارالاقامہ میں رہتے تھے، پڑھائی کا خاص ماحول تھا، طلبہ اپنی پڑھائی میں مگن اور اساتذہ تربیت وافادہ میں مصروف۔

مدرسہ کی اس تاریخی کامیابی کا سہرا یقیناً مولانا ممتاز علی مظاہری کے سر جاتا ہے، کہ اس کامیابی کے پیچھے آپ کی بڑی محنتیں تھیں، پھر اس وقت آپ ہی پرنسپل تھے، یہ دراصل آپ کا ایک خواب تھا، جو آج شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا، کتنی خوشی ہوئی ہوگی اس وقت! اور کیسے احساسات رہے ہوں گے آپ کے!!

مدرسہ رحمانیہ میں تعلیم کو عروج تک پہونچانے میں مولانا کے ساتھ وہ اساتذہ بھی شامل ہیں جنہوں نے کندہ ناتراش کو قیمتی موتی بنانے اور ذرہ بے کار کو گوہر آبدار کرنے میں اپنا خون جگر جلایا، مدرسہ کے وہ اراکین و محسنین اور معاونین جو مولانا کی آواز پر لبیک کہنے کو ہر وقت تیار رہتے، جو ہر کام میں مولانا کے دست و بازو بنتے اور دوش بدوش چلتے، اور جن کے نقشِ پا مولانا کے نقش پا کے ساتھ مدرسہ کی چہاردیواری میں آج بھی دل کی آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں، یقیناً یہ سارے حضرات مولانا کے ساتھ اس کامیابی میں برابر درجہ کے شریک ہیں، ان

سب کی خدمات قابل صد افتخار اور ہماری تحسین کے مستحق ہیں۔

اس انداز سے سوچتے ہوئے پیچھے مڑیے اور ذرا تاریخ کے صفحات کو پلٹئے: اساتذہ کی فہرست میں کچھ معروف نام نظر آئیں گے، اور آگے بڑھئے، کچھ غیر معروف بلکہ گمنام نام نظر آئیں گے، اور آگے بڑھئے، ہوسکتا ہے نام نظر نہیں آئیں، ان کے صرف کام نظر آئے گے، یہ وہ بنیاد کے پتھر ہیں، جنہوں نے خود کو دفن کر کے دوسروں کے ناموں کو زندہ کیا ہے، اب دوسری فہرست بھی دیکھئے، یہ مدرسہ کے معاونین اور محسنین کی فہرست ہے، اس فہرست میں بھی کچھ معروف، کچھ غیر معروف اور بہت سی گمنام شخصیتیں شامل ہیں، ان کی بڑی خدمات ہیں، مدرسہ کی تعمیر وترقی میں ان کے ہاتھ سب سے اونچے نظر آئیں گے، اس فہرست میں ان کے علاوہ بھی کچھ نام ہوں گے، جن کا نام آج کسی کو یاد نہیں، لیکن ان کا تعاون سب سے زیادہ مخلصانہ رہا ہوگا، ہوسکتا ہے اخلاص سے دیا ہوا ایک آنہ لاکھوں روپے کے مقبول ہونے کا ذریعہ بن گیا ہو۔

کاش یہ ماضی کی تاریخ نہیں، حال کا واقعہ ہوتا، تاریخ تھم جاتی، اور ہماری آنکھیں بھی اس بام ودر کو ایک بار دیکھ لیتی، جہاں درویش صفت اساتذہ بوریوں پر بیٹھے ہوتے، سامنے مستقبل کے معمار، طالبانِ علومِ نبوت کی صفیں ہوتیں، مشکوۃ اور ترمذی کے صفحات کھلے ہوتے، مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اسے قصۂ پارینہ لکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ناچتے ہوئے مور کو اچانک اپنا پیر نظر آگیا ہو، بہر حال حقیقت خواہ کتنی تلخ کیوں نہ ہو، حقیقت ہوتی ہے، حقیقت سے آنکھیں چرا نہیں سکتے، اسے ماننا ہی پڑتا ہے، مدرسہ کہاں سے کہاں پہونچ چکا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، یہ صورتحال مدرسہ کے ذمہ داران کے ساتھ قصبہ کے باشعور افراد کے لئے بھی لمحۂ فکریہ ہے، اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، قومی ورثہ کی حفاظت تمام لوگوں پر فرض ہوتی ہے، اسباب ومشکلات بتا کر اس سے دامن بچانا دنیا میں آسان ہوتو ہو، آخرت میں شاید آسان نہ ہوگا۔

اساتذہ کی تقرری کا نظام

اس وقت اساتذہ کی تقرری کے سلسلہ میں نظام یہ تھا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

کے مشورہ سے ہی یہ کام ہوتا تھا، گویا آپ ہی مدرسہ کے سرپرست اور تعلیمی امور کے نگراں تھے، مدرسہ کے دیگر مسائل ومعاملات میں بھی آپ سے مشورہ کیا جاتا تھا، حضرت بھی مدرسہ پر خاص توجہ فرماتے، اور یہاں کے نظام اور تعلیمی امور سے دلچسپی لیتے تھے۔

آپ کے بھیجے ہوئے اساتذہ میں مولانا قاضی یعقوب قاسمی صاحبؒ (سستی پوری) جو بعد میں جامع العلوم چلے گئے، اور وہاں صدر مدرس اور قاضی مقرر ہوئے، اور مولانا ہارون رشید صاحب جمالپوری تھے، جو یہاں سے جانے کے بعد مدرسہ رحمانیہ افضلہ سوپول میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

نظام کی پابندی

مولانا کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ آپ نظام کی پابندی کرتے ہیں، کہیں جانا طے ہے، تو وقت سے پہلے پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں، کسی کو وقت دیا ہے، تو متعین وقت سے پہلے ہی تیار رہیں گے، یہ چیزیں آج بھی موجود ہیں، جوانی کے ایام میں یہ صفت اور نمایاں تھی، ہمیشہ وقت سے پہلے مدرسہ حاضر ہوتے، اساتذہ کی حاضری پر خاص دھیان دیتے، اور دیر حاضری پر باز پرس کرتے، جو کام جس طرح طے پاتا، اس کو اسی طرح کرنے یا کروانے کی کوشش کرتے۔

اس زمانہ میں آپ کے رعب کا یہ حال تھا کہ طلبہ کے علاوہ اساتذہ بھی آپ سے ڈرتے تھے، سب وقت پر حاضر رہتے، یہاں تک کہ موسلا دھار بارش یا خراب سے خراب موسم میں بھی دیکھا گیا کہ آپ سب سے پہلے مدرسہ پہونچ رہے ہیں، آپ کی پابندی کی وجہ سے اساتذہ اور ملازمین بھی پابند تھے، نظام چوکس تھا اور سارے کام اچھے انداز میں انجام پاتے تھے۔

تعمیری کاموں سے دلچسپی

تعلیمی ترقی کے ساتھ آپ نے تعمیری کاموں پر بھی توجہ دی، اور جس طرح آپ کی کوششوں سے تعلیم اپنی منزل تک پہونچی، اسی طرح تعمیری ترقی بھی خوب ہوئی، مدرسہ خس پوش اور کھپریل کمروں سے نکل کر بلند وبالا عمارتوں میں تبدیل ہوگیا، مدرسہ کی یہ بلندی بھی

آپ ہی کی رہین منت ہے، مدرسہ کی موجودہ عمارت آپ کی یادگار ہے، حیرت کی بات ہے کہ یہ سارا تعمیری کام اس وقت انجام پایا جب سرمایہ کی فراوانی نہیں تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے مدرسہ کے لئے کتنی محنت کی ہوگی، کس طرح تنکا تنکا جوڑ کر یہ آشیانہ بنایا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے مدرسہ کے لئے بڑی محنتیں کیں، گاؤں گاؤں جانا، مالیات کی فراہمی، مدرسہ کے داخلی مسائل سے نبرد آزما ہونا، یہ سب دل گردے کا کام ہوتا ہے، آپ نے یہ سب کر دکھایا، مدرسہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا، اور اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی، مدرسہ کی ایک ایک اینٹ آپ کی اس قربانی کی گواہ ہے، یہ سب اس لئے کیا کہ یہی آپ کی امیدوں کا مرکز، اور آپ کا نخل آرزو تھا، اس محنت کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما تھا، ایک جوش تھا جو حالات کے سرد وگرم کو جھیلنے کا حوصلہ دے رہا تھا، یہ جذبہ کیا تھا، پورے علاقہ میں دینی تعلیم کا فروغ، دینی بیداری، مدرسہ کا تعارف۔

آپ کی فکر تھی کہ مدرسہ پورے علاقہ کے لئے ایک دینی اور تعلیمی مرکز بنے، اس سے علاقہ کی ضرورت پوری ہو، اس کی حیثیت روشنی کے مینار کی سی ہو، جس کی روشنی دور دور تک پہونچے، اسی مقصد کے لئے آپ نے اس باغ کو خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا، مدرسہ کا دور ماضی اور اس کے فارغین یقیناً آپ کی محنتوں کا حقیقی ثمرہ ہیں۔

عاجزؔ نے شاید اسی پس منظر میں کہا ہوگا:

یہ تو ہے ممتاز کی آخرت کا اہتمام
دولت ارض وسما ہے مدرسہ رحمانیہ

مدرسہ کے سالانہ جلسے

جلسہ اور دینی پروگرام مدارس کی زندگی میں خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اسکا اصل مقصد تو علاقہ میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا ہوتا ہے، عوام الناس تک دین کی تعلیمات پہونچانے، ان کے اندر شریعت پر چلنے کا جذبہ پیدا کرنے اور غلط رسومات کی اصلاح کا یہ بہترین موقع فراہم کرتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ مدرسہ کے تعارف کا ذریعہ بھی ہوتا ہے، ادارہ کی کارکردگی

عوام کے سامنے پیش کی جاتی ہے، جلسہ کے نام پر اطراف واکناف بلکہ دور دور سے لوگ بڑی تعداد میں آتے ہیں، دیر رات اور پوری پوری رات جاگ کر مقررین اور علماء کرام کی باتیں سنتے ہیں، اور جلسہ ختم ہونے کے بعد ایک پیغام کے ساتھ، کچھ کرنے کے ارادہ کے ساتھ اور نئے جوش وولولہ کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔

مدرسہ رحمانیہ میں بھی سالانہ جلسوں کی روایت رہی ہے، ہمارے ممدوح مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم اپنے زمانہ میں بڑے اہتمام اور محنت سے یہ جلسے کرایا کرتے تھے، ایک اندازہ کے مطابق تقریباً آٹھ بڑے جلسے آپ کی نگرانی میں ہوئے، ان جلسوں کا عنوان عموماً ''جلسہ دستار بندی'' ہوا کرتا تھا، صدارت کے لئے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو دعوت دی جاتی، وہ صدر محفل ہوتے، ان کے علاوہ جو مشاہیر اس بزم کی رونق ہوتے، اور زینت محفل بنتے، ان میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت مولانا منور حسین صاحبؒ (کٹیہار)
حضرت مولانا قریش صاحبؒ (مفسر قرآن، کلکتہ)
مولانا محمد عثمان صاحبؒ (مہتمم مدرسہ سوپول)
مولانا فصیح صاحبؒ (استھاواں)
مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار)
مولانا شمس الہدی صاحبؒ (مہتمم مدرسہ رحمانیہ سوپول) وغیرہ۔
مولانا سید نظام الدین صاحب (امیر شریعت بہار)
مولانا محمد ولی رحمانی صاحب (خانقاہ رحمانی مونگیر)
مولانا محمد قاسم مظفر پوری صاحب (قاضی شریعت امارت شرعیہ)

یہ ان بزرگوں کے نام نامی ہیں، جن کے تعارف کی ضرورت نہیں، یہ اپنے وقت کے آفتاب وماہ تاب تھے، سرزمین یکہتہ کی خوش نصیبی کہنا چاہیے کہ ان جیسی شخصیات نے اس علاقہ کو شرف بخشا، اور یہاں کے باشندے ان عظیم ہستیوں کی ضیافت، ملاقات اور ان کی زیارت

سے فیضیاب ہوئے، ان بزرگوں کی آمد، اوران کی دعائیں بھی اس علاقہ کی ترقی میں شامل ہیں۔

یہ جلسے عموماً چند سالوں کے وقفہ سے منعقد ہوتے، اس دوران حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے والے حفاظ کے سروں پر دستار رکھی جاتی، دستار بندی کا منظر بڑا دلکش اور خوشنما ہوتا، جلسہ میں موجود بزرگان اور علمائے کرام کے ذریعہ حفاظ کی دستار بندی ہورہی ہے، تکمیل حفظ قرآن کی سعادت پانے والوں میں بعض نوجوان ہیں، کچھ نوخیز ہیں، کچھ تو ابھی بالکل چھوٹے ہیں، مگر ان سب کے دل قرآن کی دولت سے مالا مال ہیں، ان کے چہروں سے خوشیاں عیاں ہیں، یہ ننھے منے بچے اپنے سروں پر عمامہ باندھے، دستار سجائے ادھر ادھر گزر تے ہیں، تو دیکھنے والے خود بخود متوجہ ہوجاتے ہیں، یہ منظر جہاں ان کو بھلا محسوس ہوتا ہے، وہیں ایک سرد آہ بھی دل کے کسی گوشہ سے نکلتی ہے، کاش! ان بچوں میں ہمارا بھی کوئی لخت جگر ہوتا، آج یہ سعادت ہمارے بھی نصیب آتی!!

مسجد رحمانی کی تعمیر

مسجد مسلم معاشرہ کی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے، یہ ان کا سب سے بڑا دینی مرکز ہوتا ہے، اخیر زمانہ میں مولانا کو یہ احساس ہوا کہ مدرسہ کی چہار دیواری میں ایک مسجد بھی ہونی چاہیے، اب تک طلبہ کسی کمرہ یا ہال میں نماز ادا کرتے تھے، باضابطہ مسجد نہیں تھی، چنانچہ مولانا نے سوچا کہ اگر یہاں مسجد بن جاتی تو طلبہ واساتذہ کے لئے نہ صرف سہولت ہوتی بلکہ اس کو حفظ کی تعلیم کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا، اس کے علاوہ یہ مدرسہ کی تکمیل ہے، مسجد کے بغیر مدرسہ ناقص ہوتا ہے، مولانا کے ذہن نے اسے سوچا اور پھر کام کا پروگرام بنالیا۔

مدرسہ کے اراکین اس کے لئے تیار نہیں تھے، ان حضرات کی رائے تھی کہ مدرسہ گاؤں سے باہر واقع ہے، تعلیم کے زمانہ میں تو یہ آباد رہے گی، مگر چھٹیوں میں نمازیوں سے خالی ہوجائے گی، اور رمضان میں شاید یہاں نماز بھی نہ ہوپائے، اس لئے یہاں مسجد کی تعمیر مناسب نہیں ہے، یہاں بھی مولانا کی ہمت اور قوت ارادی سامنے آئی، آپ نے اراکین کے سامنے اپنی بات رکھی، اور پھر ان کی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر تعمیر کا کام شروع کروادیا۔

۱۹۸۲ء میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے ہاتھوں اس کی پہلی اینٹ رکھی گئی، مولانا نے شب وروز محنت شروع کی، سرمایہ جمع کرتے رہے، اور مسجد کی تعمیر ہوتی رہی، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں مسجد تیار ہوگئی، یہ مسجد مولانا منت اللہ رحمانی کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''مسجد رحمانی'' کہلاتی ہے، مسجد کی تعمیر کے بعد آپ نے خود وہاں اعتکاف کیا اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کیا، چنانچہ چند سالوں تک یہ مسجد رمضان میں بھی آباد رہی۔

علاقہ میں تعلیمی فروغ کے لئے آپ کی کوششیں

مولانا محترم نے مدرسہ کی تعلیمی ترقی کے ساتھ علاقہ کی تعلیم پر بھی توجہ دی، قصبہ میں علم کی روشنی بھی تھی، مگر اطراف واکناف کے دیہات اور بطور خاص نیپال سے ملحق علاقے اب بھی جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے، غیر مسلموں کے ساتھ عرصہ سے رہنے کی وجہ سے ان کے تصورات اور رسم ورواج کی چھاپ مسلمانوں پر خاصی تھی، مختلف ہندوانہ رسومات مسلم معاشرہ میں انجام پاتے تھے، مولانا اس صورت حال کو دیکھ کر فکر مند ہوتے، آپ نے ان علاقوں کا دورہ کرنا شروع کیا، اپنے ساتھ اساتذہ کو بھی لے جاتے، اور لوگوں کو دین وشریعت سے آگاہ کرتے، رسومات کو ختم کرنے کی تلقین کرتے، اور شریعت کے احکام بتاتے۔

ان علاقوں میں آپ لوگوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے، تعلیم کی اہمیت اور جہالت کے نقصانات سے لوگوں کو واقف کراتے، اس طرح جب ان میں تعلیم کے تعلق سے کچھ بیداری آتی تو وہاں مکتب قائم کرواتے، مسجد بنانے کی طرف متوجہ کرتے، اس طرح کی کوششوں سے علاقہ میں تعلیمی بیداری عام ہوئی، دینی تعلیم کا رجحان عام ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ بہت سے مکاتب اور مدارس وجود میں آئے، اب صورت حال یہ ہے کہ اکثر گاؤں میں مکاتب موجود ہیں، مساجد ہیں، بہت سے مدارس بھی قائم ہوچکے ہیں، ان مکاتب اور مدارس کے ذمہ داران یا اس کے بانیان میں اکثر کا تعلق مولانا سے اور مدرسہ سے رہا ہے، یہ سب مدرسہ رحمانیہ کے فیض یافتہ ہیں، اور آپ سے شاگردی کا رشتہ رکھتے ہیں۔

مدرسہ کی ۴۵ سالہ خدمات پر ایک نظر

۱۹۵۰ء میں مولانا نے مدرسہ رحمانیہ سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، اور ۱۹۹۱ء میں سبکدوش ہونے والے تھے، مگر بیسٹ ٹیچر نیشنل ایوارڈ کی وجہ سے ملازمت میں تین سال کی توسیع ہوگئی، جس کی وجہ سے ۱۹۹۴ء میں مدرسہ آپ کی خدمات سے محروم ہوا، اس طرح آپ نے تقریباً نصف صدی تک مسندِ تدریس واہتمام کو زینت بخشی، نصف صدی سے زائد عرصہ تک مدرسہ کی خدمت کی۔

اس موقع پر یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس طویل مدت میں آپ سے مدرسہ اور علاقہ کو کیا فائدہ پہونچا، اسی طرح یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس مدت میں مدرسہ کن حالات اور کن مراحل سے گذرا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرسہ کے لئے آپ نے بڑی قربانیاں دی ہیں، مدرسہ کی تعلیمی اور تعمیری دونوں ترقیاں آپ کی مرہون منت ہیں۔

تعلیم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو آپ جس وقت آئے ہیں اس وقت مکتب اور حفظ کی تعلیم ہوتی تھی، آپ نے خود بیان کیا ہے کہ اس وقت ابتدائی تعلیم تھی، دو یا تین اساتذہ ہوا کرتے تھے، آپ کے زمانہ میں فاضل تک تعلیم پہونچ گئی، فاضل کا درجہ ختم ہونے کے بعد بھی بہت دنوں تک مشکوٰۃ کی تعلیم باقی رہی، ایک قصبہ میں فاضل اور مشکوٰۃ کی تعلیم!! شاید اس کا خواب بھی کبھی قصبہ والوں نے نہیں دیکھا ہوگا، مگر چشم فلک نے وہ دور بھی دیکھا، اس عظیم اور تاریخی کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر زیب دیتا ہے، اور اس منزل تک پہونچنے میں اراکین مدرسہ، اعیان یکھتہ اور اساتذہ کا تعاون شامل ہے، ان سب کے تعاون سے ہی یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

آپ جب آئے تو مدرسہ چند کمروں پر مشتمل تھا، آپ کی محنت وخلوص، اساتذہ اور اعیان قصبہ کے تعاون سے پورا گلستان وجود میں آیا، مدرسہ کی پرشکوہ عمارت، مسجد رحمانی کی تعمیر (۱۹۸۲ء) اور بنات سیکشن کی تعمیر نو آپ کے دور کی یادگار ہیں۔

تعلیم کے سلسلہ میں مدرسہ کا تعارف اور شہرہ دور دور تک پہونچا، دور دراز کے طلبہ بھی اس چشمۂ علم وعرفان سے سیراب ہوئے، قصبہ کے لوگوں نے مدرسہ کو استحکام بخشا تو دوسری طرف مدرسہ کی نسبت سے قصبہ کے وقار میں اضافہ ہوا، اور اس ادارہ کی وجہ سے قصبہ کو علمی شناخت ملی، یہ ساری چیزیں مولانا کی محنت اور کاوش کا حصہ ہیں۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح مولانا کی زندگی میں مدرسہ ترقی کے بام عروج تک پہونچا، اسی طرح مدرسہ کا تعلیمی زوال بھی آپ کی زندگی میں شروع ہوگیا، ترقی کا خواب دیکھنے والی آنکھوں نے جہاں ترقی کے حسین مناظر دیکھے، انہی آنکھوں نے انحطاط وپستی کو حد سے گذرتے بھی دیکھا، مدرسہ اپنے عروج کو پہونچا ضرور، مگر کچھ عرصہ بعد ہی اسے گہن لگ گیا، گلستاں میں بہار آئی مگر خزاں بھی ساتھ چلا آیا، عروج وزوال کی یہ داستان بڑی عجیب ہے، اور باشعور قاری کو تھوڑی دیر کے لئے محو حیرت بنائے گا، وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا، عروج کے بعد زوال ایک حقیقت ہے، مگر یہاں سوال یہ ہے کہ مولانا کی محنت، آپ کا اخلاص اور دردمندی اور اعیان قصبہ کا تعاون اگر مدرسہ کی ترقی کا ذریعہ تھے، تو یہ ساری چیزیں اسے بعد کو بھی میسر رہیں، مدرسہ کی شہرت اس پر مزید تھی، مگر یہ سب اسے زوال پذیر ہونے سے روکنے کی ضمانت نہیں بن سکے، آخر ایسا کیوں؟

اس سوال کا صحیح جواب تو وہی دے سکیں گے جن کی آنکھوں نے عروج وزوال کو قریب سے دیکھا ہے، منجدھار میں پھنسے ناخدا ہی ملت کی کشتی کے ڈوبنے کے اسباب بتا سکتے تھے، مگر اب ایسے لوگ کہاں، ساحل کے تماشائی اپنے طور پر کچھ سوچ ہی سکتے ہیں، راقم نے عروج وزوال کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے، جس کی تفصیل مدرسہ رحمانیہ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

بیسٹ ٹیچر ایوارڈ

تعلیم کے میدان میں مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً غیر معمولی اور قابل قدر ہیں، آپ کی محنت ولگن، اور مدرسہ وتعلیم کے تئیں خلوص وقربانی کے آثار واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علاقہ میں جو تعلیمی بیداری آئی اور تعلیم کی طرف رجحان

عام ہوا، اور ہر سطح کے لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے کوشاں ہیں، ان سب کا سہرا بڑی حد تک مولانا کو جاتا ہے، اس بیداری کا اثر آج بھی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کی کوششوں کا مقصد ظاہر ہے علاقہ میں تعلیم کا فروغ تھا، اور یہ دراصل اپنی ذمہ داری کی ادائیگی تھی جو شریعت کی طرف سے ہر اہل علم وذی شعور پر عائد ہوتی ہے، اس کام کے بدلے جو نیک نامی اور شہرت وناموری حاصل ہو وہ جزوی چیز ہے، اصل اللہ کی رضا ہے، اور ان کی طرف سے ملنے والا انعام جو قیامت میں ملے گا۔

حکومت ہند کی طرف سے ۱۹۹۰ء میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ (نیشنل ایوارڈ) کے لئے آپ کا انتخاب ہوا، اور ۵؍ستمبر ۱۹۹۱ء کے ایک باوقار تقریب میں یہ ایوارڈ آپ کو پیش کیا گیا، یہ حکومت کی طرف سے گویا آپ کی خدمات کا اعتراف تھا، شمالی بہار کی تاریخ میں وہ دن یقیناً بڑا تاریخی دن تھا جب اس دور افتادہ علاقہ کے ایک فرد کو اس قابل قرار دیا گیا کہ ان کی خدمات کو سراہا جائے، اور انعامات سے نوازا جائے۔

۵؍ستمبر ۱۹۹۱ء کا دن یقیناً بڑا خوبصورت اور یادگار تھا جب تقسیم ایوارڈ کی بزم سجی، اس وقت کے صدر جمہوریہ آر بنکٹ رمن بزم کے صدر نشین تھے، جبکہ ارجن سنگھ وزیر تعلیم اور دیگر معززین، وزراء، اعلی افسران اور تعلیم سے متعلق حضرات شریک پروگرام تھے، اس پروقار تقریب میں آپ کو ایوارڈ دیا گیا، ایوارڈ کی خبر سے قصبہ اور علاقہ کے لوگ شاداں وفرحاں تھے، جب آپ ایوارڈ لے کر لوٹے تو ہر طرف سے مبارکبادیاں پیش کی گئیں، قصبہ کی طرف سے باضابطہ تہنیتی تقریب منعقد ہوئی، متعلقین اور تلامذہ نے تہنیتی خطوط بھیجے، اس ایوارڈ نے نہ صرف مولانا کا بلکہ مدرسہ، قصبہ اور علاقہ سب کا نام روشن کیا۔

معہد البنات یعقوبیہ کا قیام

مدرسہ رحمانیہ سے ریٹائر ہونے کے بعد امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب نے آپ کو مشورہ دیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک ادارہ قائم کریں، تاکہ اس کے ذریعہ لڑکیوں کی تعلیم کا مناسب انتظام ہوسکے، مولانا محمد قاسم مظفرپوری نے نہ صرف اس مشورہ کی

تائید کی بلکہ مستقل اصرار کرتے رہے، تا آنکہ مولانا اس کے لئے تیار ہوگئے، کسی ادارہ کا قیام ظاہر ہے بڑی جدوجہد کا طالب ہوتا ہے، اور مولانا اب اس حال میں نہیں تھے، اس لئے مولانا کو اس سلسلہ میں تردد تھا، مگر ان دونوں بزرگوں کے مشورہ اور اصرار پر آپ نے بنام خدا اس راہ میں قدم بڑھایا اور ۱۹۹۶ء میں معہد البنات یعقوبیہ کے نام سے لڑکیوں کا ادارہ قائم کیا، جس میں فی الحال الفقہ المیسر تک لڑکیوں کی تعلیم ہو رہی ہے، سلائی سکھانے کا بھی انتظام ہے، مولانا بذات خود اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

علماء ومشائخ سے تعلق واستفادہ

مولانا دامت برکاتہم اپنے کاموں کے سلسلہ میں ہمیشہ بڑوں سے مشورہ کرتے رہتے ہیں، بچپن سے اسکی عادت ہے، آپ زمانۂ طالب علمی سے اپنے اساتذہ سے قریب رہے، ان کی شفقتیں حاصل کیں، جب مدرسہ رحمانیہ سے وابستہ ہوئے تو بہار کے مؤقر علماء اور بطور خاص امارت شرعیہ کے ذمہ داران سے ربط وتعلق بڑھا، اور دھیرے دھیرے یہ تعلق قربت کی شکل اختیار کرتا گیا، مولانا ان بزرگوں کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے، اور ان سے استفادہ کرتے، وہیں ان حضرات کے دل میں بھی مولانا کی قدر تھی، یہ حضرات آپ کے کاموں کی تحسین فرماتے، اور آپ کی حوصلہ افزائی کرتے۔

جن علماء سے زیادہ قربت رہی ان میں سر فہرست امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ ہیں، آپ کی درخواست پر حضرت امیر شریعت بار بار مدرسہ تشریف لاتے رہے، اور قصبہ اور اس پورے علاقہ کو فیض یاب کرتے رہے، حضرت امیر شریعت کا آپ کے ساتھ مدرسہ اور اس قصبہ سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا، اس قصبہ میں یہاں حضرت کو اپنائیت سی محسوس ہوتی تھی۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا بھی یہی حال تھا، آپ بھی متعدد بار تشریف لائے، اور ہمیشہ اس قصبہ کو اپنا گھر سمجھتے تھے، موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب سے طویل عرصہ سے ربط وتعلق ہے، آپ ہی کے مشورہ پر مولانا نے معہد البنات قائم کیا، حضرت امیر شریعت سے خود میں نے کئی بار آپ کا ذکر خیر سنا، مولانا محمد قاسم مظفرپوری اور

مولانا محمد ولی رحمانی بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن سے مولانا کو قربت رہی ہے، ان کے علاوہ مولانا عثمان صاحب (مدرسہ افضلہ سوپول)، مولانا قریش صاحب (کلکتہ)، ڈاکٹر عبد الحفیظ سلفی صاحب وغیرہ سے خصوصی تعلقات رہے ہیں، یہ وہ حضرات ہیں جو ملت کے ارباب حل وعقد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے سہارنپور کے زمانہ قیام میں استفادہ کیا، اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ تو آپ کے مرشد اول تھے، ان حضرات سے تعلق ظاہر ہے۔

جن اداروں سے آپ کا گہرا تعلق رہا ہے ان میں امارت شرعیہ بہار، خانقاہ رحمانی مونگیر، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا نام آتا ہے، پرسنل لا بورڈ کے اجلاس بمبئی اور احمد آباد میں بحیثیت مدعو خصوصی شریک ہوئے، سال گذشتہ ۲۰۱۰ء میں لکھنؤ میں ہونے والے بورڈ کے اجلاس میں بھی آپ کو دعوت ملی، اور آپ اپنی ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود شریک ہوئے، خانقاہ میں اکثر حاضری ہوتی رہتی ہے، امارت شرعیہ کی مجلس شوری کے رکن ہیں اور ایک طویل عرصہ سے اس سے وابستہ ہیں۔

حضرت شیخ الحدیثؒ سے تعلق اور بیعت

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا یہ امتیاز رہا ہے کہ وہاں طلبہ دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ باطنی علوم یعنی تصوف وسلوک کے مراحل بھی طے کرتے ہیں، عموماً طلبہ کا کسی نہ کسی شخصیت سے اس سلسلہ میں ربط وتعلق رہتا ہے، جن کی رہنمائی میں اپنی تعلیم بھی جاری رکھتے ہیں اور اپنے باطنی امراض کا علاج بھی کراتے ہیں، اس طرح وہاں کے استاد کی حیثیت بیک وقت مربی، مرشد اور معالج سب کی ہوتی ہے، اس علمی وروحانی فضا میں مولانا نے دوسال گزارے، جہاں قرآن وحدیث کے ساتھ بزرگوں کے تذکرے، تصوف کے مسائل، ذکر وشغل، مراقبہ، کشف وکرامات کی باتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں، اسی ماحول کا نتیجہ تھا کہ آپ کے اندر بھی کسی ایسے استاذ سے تعلق پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہوئی جو مرشد بھی ہو اور مربی بھی، چنانچہ آپ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں آنے جانے لگے، خالی اوقات میں حضرت سے استفادہ کرتے۔

فراغت کا وقت جب قریب آیا تو خیال ہوا کہ یوں آزاد رہنا ٹھیک نہیں ہے، اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے دینا چاہئے، اور آئندہ کی تربیت کے لئے کسی کو اپنا مرشد بنالینا چاہئے، یہی سوچتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے سامنے اپنا مدعا رکھا، حضرت نے بیعت لی اور ذکر واذکار کی نصیحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ''مولوی ممتاز چٹائی پر بیٹھ کر علوم دینیہ کی خدمت کرو''۔

مدرسہ کی مصروفیات اور رمضان میں سرمایہ کی فراہمی کے لئے اسفار کی وجہ سے ابتدائی چند سالوں تک حضرت سے کوئی رابطہ نہیں رہا، مگر جلد ہی حضرت سے دوبارہ رابطہ استوار کیا، اس جدید تعلق کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث مدینہ ہجرت کر گئے، مولانا جب اپنے دوسرے حج میں مدینہ پہونچے تو حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ نے آپ کو مفتی محمود الحسن صاحبؒ سے رابطہ رکھنے اور ان سے اکتساب فیض کرنے کا مشورہ دیا۔

سفر حج سے واپسی پر مولانا نے حضرت شیخ الحدیث کے دوسرے خلیفہ مولانا منور حسینؒ سے تجدید بیعت کی درخواست کی، مگر انہوں نے انکار کیا، اور حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ کے مطابق مفتی صاحبؒ سے رابطہ رکھنے کا حکم دیا، حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال کے بعد آپ نے حضرت شیخ الحدیث کے صاحبزادے حضرت مولانا طلحہ صاحب دامت برکاتہم کے ہاتھوں پر تجدید بیعت کی۔

اس کے بعد سے حضرت مولانا محمد طلحہ دامت برکاتہم سے تعلق ہے، رمضان سہارنپور میں گزارنے کا اہتمام کرتے ہیں، جہاں حضرت شیخ الحدیثؒ کے مریدوں اوران سے انتساب رکھنے والوں کا بڑا اجتماع ہوتا ہے، چند سال قبل مولانا محمد طلحہ صاحب دامت برکاتہم نے آپ کو بیعت کی اجازت مرحمت فرمادی، اور خلافت سے سرفراز فرمایا۔

چند یادگار خطوط

مولانا کے مختلف اہل علم اور سیاسی رہنماؤں سے خصوصی مراسم اور قریبی تعلقات رہے ہیں، ان میں بہت سے لوگوں سے مراسلت بھی تھی، بطور خاص مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا

مفتی محمود صاحبؒ، مولانا قریش صاحبؒ، مولانا قاری صدیق باندویؒ، ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا سابق وزیراعلی بہار، دھنک لال منڈل سابق گورنر ہریانہ وغیرہ سے اکثر مراسلت ہوتی رہی ہے، یہ خطوط محفوظ ہوتے تو مولانا کے ان حضرات سے تعلقات کی کئی جہتیں سامنے آتیں، مگر یہ سرمایہ محفوظ نہیں رہا، البتہ مدرسہ رحمانیہ کے ریکارڈ میں چند اہم خطوط ملے، جنہیں یہاں درج کیا جاتا ہے:

مولانا منت اللہ رحمانی کا گرامی نامہ جس پر ۱؍مئی ۸۰ء درج ہے، اس طرح ہے:

مکرم مولانا!　　وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا دعوت نامہ آج ڈاک لکھاتے وقت سامنے آیا، اس سے پہلے آپ سے ملاقات ہوئی تھی، اور میں نے معذرت کردی تھی، آپ نے شاید تاریخ کا اعلان کردیا تھا، ستروپٹی سے دعوت نامہ آیا کہ یکہتہ آرہے ہیں، یہاں آئیں، آپ کا جو اسٹیشن ہے وہاں سے بھی خط آیا کہ یہاں آئیں، پھر معلوم ہوا کہ آپ نے اجلاس ملتوی کردیا، آپ کے کیا مصالح تھے، اس کو آپ جانیں　ع

رموز سلطنت خویش خسروان دانند

جیسا کہ میں نے آپ سے نیپال میں کہا تھا بھاگل پور اجتماع سے پہلے اور اس کے بعد بہت بھیڑ رہی، پچاسوں جماعتیں آئیں اور گئیں، حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ اپنے تمام رفقاء کے ساتھ جس میں مولانا محمد عمر پالنپوری مولانا محمد عبید اللہ، قاری محمد ظہیر، منشی بشیر صاحب وغیرہ وغیرہ خانقاہ تشریف لائے، اور یہاں سے دلی تشریف لے گئے، مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری اور مولانا انعام الحسن صاحب کی تقریریں بھی یہاں ہوئیں، ان حضرات کا آنا بہتر ہی ہوا، الحمد للہ۔

خدا کرے آپ اور تمام مدرسین بخیر ہوں، آپ سے ملاقات بھاگلپور میں کسی سے نہیں ہوئی، خدا کرے بعافیت ہوں اور تمام مدرسین سے سلام مسنون فرمادیں۔

والسلام

منت اللہ

خانقاہ رحمانی مونگیر

امیر شریعت کا دوسرا خط جس میں تفصیل سے دیوبند کے حالات لکھے ہیں:

مکرم مولانا　　زاد لطفہ　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، الحمد للہ اچھا ہوں، اور اس مبارک مہینہ کو صیام وقیام کے اہتمام کے ساتھ گزار رہا ہوں، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی قبول فرمائے۔

دیوبند میں اسٹرائک نہیں ہوئی ہے، باہر کے لوگوں کی ایماء اور اشارے سے بعض مدرسین اور کچھ طلبا نے ۱۸؍مئی سے سازش اور ہنگامہ شروع کیا، اس طرح کہ اسباق نہیں پڑھائے جارہے ہیں، اور ہر صبح وشام خفیہ اور کھلے جلسے ہورہے ہیں۔

۷؍اور ۸؍جولائی کو مجلس شوری تھی، ان اللہ کے بندوں نے شوری کے جلسے نہ ہونے دیئے، ہم لوگ جمع ہوتے اور یہ لوگ سامنے آکر تقریر کررہے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر لگا کر بول رہے ہیں، اگر کبھی ملاقات ہو تو تفصیلات بتاؤں، اسٹرائک تو طلبہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور کچھ ان کے مطالبات ہوتے ہیں، ان کے منوانے پر زور دیا جاتا ہے، نہ ماننے پر اسٹرائک ہوتی ہے، ان میں سے کوئی بھی بات وہاں نہ تھی۔

میں نے ابھی دفتر سے معلوم کرایا تو معلوم ہوا کہ حافظ مشتاق علی سلمہ کے طرف سے کوئی بھی درخواست نہیں آئی ہے، اور ناظم تعلیمات کے آئے ہوئے خطوط کو منگوا کر میں نے دیکھا، آپ کا کوئی خط نہیں۔

جامعہ رحمانی پہلے ہی اعلان کرچکا ہے کہ جو درخواستیں ۲۰؍رمضان سے پہلے آئینگی ان پر غور ہوگا، اگر آپ اس خط میں مشتاق علی سلمہ کے متعلق تفصیلات لکھدیتے تو میں اسی کو درخواست بنادیتا۔

بہر حال آپ فوراً درخواست بھیجیں، جس میں نام مع ولدیت، عمر، کہاں پڑھا ہے، اور کیا پڑھا ہے، اب کیا پڑھنا چاہتے ہیں، داخلہ امدادی چاہتے ہیں یا غیر امدادی، یہ ساری تفصیلات

لکھ کر بھیجیں، اگر ممکن ہو تو کسی شخص کے معرفت بھیج دیں، میں آپ کے اس خط کی بناء پر ایک جگہ رکوا رہا ہوں۔

اللہ تعالی آپ کی چچیری بھانجی کو شفاء عطا فرمائے، رمضان کے بعد اگر ممکن ہو تو مجھ سے تاریخ لے کر وہ آجائیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی صاحب ان کا چوبیس گھنٹہ پہنا ہوا کپڑا اور ان کا اور ان کی والدہ کا نام لے کر ۲۸؍اگست سے ۲؍ستمبر کے درمیان تک آویں، انشاء اللہ جو خدمت ممکن ہوگا کروں گا، سرِ دست آپ ایسا کریں کہ نیچے لکھا ہوا نقش چالیس پرچوں پر چاول کی روشنائی سے لکھ کر ان کے حوالہ کریں، اور وہ روزانہ صبح کو رمضان کے زمانہ میں افطار کے وقت ایک نقش پانی میں دھو کر مع کاغذ پی جایا کریں، میں آپ کو اس نقش کو لکھنے اور لوگوں کو دینے کی اجازت دیتا ہوں، اللہ فائدہ دے۔

اللہ آپ کی اہلیہ کو شفاء عطا فرمائے، تعویذ بھیج رہا ہوں، موم جامہ کر کے گلے میں ڈال دیں، اللہ انہیں شفاء عطا فرمائے۔

میرا انہیں سلام کہہ دیں۔ والسلام

منت اللہ

۱۵/۹/۱۴۰۰ھ

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے گرامی نامے اس طرح ہیں:

محترمی زید احترامہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ مبارک اپنی تاثیرات وکیفیات کے ساتھ ساتھ رخصت ہوا، نہ وہ حالات ہیں، نہ وہ کیفیات، جو شخص اس کے کچھ اجزاء واحوال کو اپنا لیتا ہے اور ان کا اہتمام کرتا ہے تو اس کو کچھ حصہ میسر بھی آجاتا ہے، جتنا کچھ آپ کے پاس باقی ہے اللہ تعالی اس کو دائمی بنائے، اور جو باقی نہیں وہ عطا فرمائے۔

اولاد کو حسن تدبیر کے ساتھ اس کا احساس دلانا چاہیے کہ بالغ ہونے پر اولاد ذکور کا نفقہ باپ کے ذمہ واجب نہیں رہتا بلکہ بعض صورتوں میں باپ کا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہوجاتا

ہے، مگر تفہیم کا طریقہ ایسا نہ ہو کہ باپ اپنی اولاد کو غیر سمجھ کر سر سے بوجھ اتارنا چاہتا ہے، اللہ تعالی ملاپ عطا فرمائے، خدائے پاک قلوب میں صلاحیت دے۔

املاہ العبد محمود غفرلہ

چھتہ مسجد، دیوبند

حضرت مفتی صاحبؒ کا دوسرا خط:

محترمی زید احترامہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لخت جگر سلمہ کی علالت سے بہت قلق ہے، اللہ تعالی ان پر اور سارے گھر پر اپنا فضل فرمائے، شفاء کامل عاجل مستمر عطا فرمائے، آپ کو صحت کلی دے، میرا تعویذ دینا عرصہ سے چھوٹ گیا ہے، دعاء پر اکتفاء کرتا ہوں، یہی تعویذ کی بنیاد بھی ہے، ہاں معمولات کی پابندی کا اہتمام کریں، پریشانی اور تکلیف میں تو معمولات کی زیادہ پابندی چاہیے۔

املاہ العبد محمود گنگوہی

۲۸/۳/۱۴۱۲ھ

مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم نے اپنے استاد و مرشد حضرت محمود حسن گنگوہی کی خدمت میں اپنے معمولات کے بارے میں لکھا، ساتھ ہی ایک ماہ آپ کی خدمت میں رہنے کی اجازت چاہی، اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب کا یہ گرامی نامہ شرف صدور ہوا:

مکرم ومحترم زید احترامہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اگر آپ رمضان المبارک میں میرے پاس نہیں رہ سکے بلکہ حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کے پاس رہے تو یہ نعم البدل ہے، اللہ تعالی قبول فرمائے، اب اس کے قضا کے لئے مستقل ایک ماہ کی فرصت لے کر یہاں آنے کی ضرورت نہیں، اور پھر جبکہ آپ صدر مدرس اور مہتمم بھی ہیں، ایک ماہ کی فرصت لینے میں امور مدرسہ کا حرج ضرور ہوگا، خدا کو منظور ہوا تو کسی دوسری تعطیل میں تشریف لے آئیں، اور جب آنے کا ارادہ ہو تو پہلے معلوم کرلیں کہ اس وقت میرا قیام کہاں ہے، اللہ تعالی آپ کو ترقیات سے نوازے، اذکار واشغال کے انوار سے منور فرمائے۔

عشاء کے بعد سونے سے پہلے چار یا آٹھ رکعت نفل تہجد کی نیت سے پڑھ لیا کریں، اور نیت یہ رکھیں کہ تہجد کے وقت اٹھوں گا اور تہجد پڑھوں گا، پھر اگر اٹھنے کا موقع مل جائے اس کو غنیمت سمجھیں، اور جس قدر ہو سکے پڑھ لیں، ورنہ انشاء اللہ تعالی عشاء کے بعد کی رکعات تہجد کے قائم مقام ہو جائیں گی۔

فقط والسلام

املاہ العبد محمود غفرلہ

چھتہ مسجد، دالعلوم دیوبند

۳۰/۱/۱۴۱۳ھ

محترمی زید احترامہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ اولاد ذکور کو نماز کے لئے جگا دیتے ہیں، انشاء اللہ ایک دن آئے گا کہ وہ خود جاگیں گے، اور سوتے ہوئے کو جگائیں گے، ابھی قدر نہیں کرتے، لیکن انشاء اللہ جلد ہی قدر کرنے لگیں گے، اس کا ثواب آپ کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، جب تک ساتھ رہ سکیں علیحدہ نہ کریں، صحیح یہ ہے کہ الگ کرنے سے آپ کو یکسوئی ہو جائے گی، لیکن اجر وثواب میں کمی ہو جائے گی، دعا کا زیادہ اہتمام رکھیں، کہ وہ لوگ دعا کے زیادہ مستحق ہیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالی اعلم

املاہ العبد محمود غفرلہ

چھتہ مسجد دیوبند

مشہور عالم، صاحب طرز ادیب وعربی انشاء پرداز مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) سے بھی مولانا کی مراسلت تھی، یہ مراسلت عموماً مدرسہ رحمانیہ کے لئے رابطہ عالم اسلامی سے تعاون کی فراہمی سے متعلق ہوتی رہی، اس سلسلہ کے چند خطوط ہمیں دستیاب ہوئے ہیں، جو اس طرح ہیں:

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، مدرسہ رحمانیہ کی خدمات کا علم ہوا، یقیناً مدرسہ اور اس کی ضروریات کا تقاضہ ہے کہ اس کے لئے مالی وسائل فراہم کرنے کی کوشش کی جائے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ آپ مدرسہ کا مختصر تعارف، اس کی ضروریات اور حضرت امیر شریعت کے تصدیق نامہ کی نقل درج ذیل پتہ پر براہ راست ارسال فرمادیں، میں وہاں زبانی بھی سفارش کر دوں گا، کامیابی اللہ کے حکم پر موقوف ہے۔

عبداللہ عباس ندوی

۱۰/۱۲/۱۹۸۷ء

مکرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مکتوب رجسٹرڈ موصول ہوا، میں اپنے خط میں رابطہ کے متعلق شعبہ سے درخواست کروں گا کہ وہ آپ کے مدرسہ کا معاملہ کسی قریبی جلسہ میں طے کر دیں، خود محرم سے پہلے چلا جاؤں گا، اگر اس وقت تک کچھ ہو سکا تو زبانی یاد دہانی کرا دونگا، رابطہ نے آپ کے خط کی کاپی جو آپ نے مجھے بھیجی ہے، وہ محفوظ کر لی ہے۔

عبداللہ عباس ندوی

۱۴/جون ۱۹۸۹ء

تیسرا خط مولانا کے نام اس طرح ہے:

محترمی ومکرمی زید لطفہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ (رجسٹرڈ) ملا، میں مکہ مکرمہ ذی الحجہ میں گیا تھا، محرم کے وسط میں واپس آیا، ۲۰/ذی الحجہ تک تمام دفاتر بند تھے، اور جب رابطہ عالم اسلامی کا دفتر ۲۱/ذی الحجہ کو کھلا تو معلوم ہوا کہ بیرون ممالک کو امداد جس شعبہ کی سفارش پر دی جاتی ہے اس کے مدیر ڈیپوٹیشن پر اسپین گئے ہوئے ہیں، اور واپسی صفر کے اخیر میں ہوگی، لیکن یہ بھی معلوم ہوا کہ اب کمیٹی ربیع الاول میں ہوگی، کیونکہ نیا مالی سال اسی وقت شروع ہوگا۔

بہرحال میں یہاں سے خط لکھتا ہوں جس میں منجملہ دوسری باتوں کے مدرسہ رحمانیہ کے

متعلق یاددہانی کراؤں گا، آپ نے رابطہ سے آئے ہوئے خط کی جو کاپی دی تھی وہ متعلقہ شعبہ کے کلرک کو دے آیا تھا، کہ فائل میں لگادیں۔

عبداللہ عباس ندوی
۲۳ستمبر۱۹۸۹ء
لکھنؤ

ان میں بہت سے خطوط گرچہ ذاتی نوعیت کے ہیں، مگر ان سے مولانا کے ان بزرگوں سے تعلقات اور قربت کا پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی ان شخصیات کی جو شفقتیں مولانا کو حاصل رہی ہیں، اس کا عکس ان خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔

امتیازی اوصاف

مولانا دامت برکاتہم نے دینی تعلیم حاصل کی، مختلف علماء ومشائخ سے استفادہ کیا، ان کی صحبتوں سے مستفید ہوئے، پھر پوری زندگی علم دین کی نشرواشاعت اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنے میں گزاردی، ان خدمات کے ساتھ اللہ تعالی نے اخلاق حمیدہ کی دولت سے نوازا ہے، گذشتہ صفحات میں آپ کی خدمات اور کمالات کا جائزہ پیش کیا گیا، یہاں آپ کے چند امتیازی اوصاف کو بیان کیا جاتا ہے۔

محنت اور لگن

محنت اور لگن دراصل آپ کی زندگی کا حاصل ہے، آپ کی پوری زندگی ان دوصفات سے مرکب ہے، اور یہی آپ کی کامیابیوں کا راز بھی ہے، جو کام کرنا ہے، اسے پوری لگن سے کرنا ہے، جو ذمہ داری ملی ہے، اسے اس انداز سے کرنا کہ گویا صرف ذمہ داری نہیں ادا کر رہے ہیں، بلکہ اپنا شوق پورا کررہے ہیں، ہمت اس بلا کی کہ جو ٹھان لیا وہ کرکے ہی دم لیں گے، خواہ اس کی کیسی بھی مخالفت کی جائے، اور دیکھنے والے کچھ بھی کہیں، آپ نے کبھی لوگوں کے تبصروں اور طعن وتشنیع کی پرواہ نہیں کی، بلکہ جس کو صحیح سمجھا اس کو کرکے دکھادیا، اسی محنت ولگن اور جرأت وہمت نے آپ سے وہ کام کروائے جن کو انجام دینے کے لئے آج بھی

لوگوں کو سوچنا پڑے گا، منزل تک پہونچنے کے یہی دوشاہ کلید ہیں، صحیح فیصلہ اور پھر اس پر عمل۔

ہر مجلس میں دین کی باتیں

آپ کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ جہاں بھی رہیں، جس مجلس میں رہیں، ہر جگہ اور ہر موقعہ پر دین کی بات کرتے ہیں، کوئی وقت دین کی باتوں سے خالی نہیں جانے دیتے، متعلقین کے بارے میں کسی کمی کا علم ہوا، شریعت کے کسی عمل میں کوتاہی نظر آئی، تو ان کو اس کی طرف ضرور متوجہ کرتے، اور انہیں مذکورہ عمل سے متعلق ہر ممکن آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عوام کو بزرگوں سے جوڑنا

آپ کا بڑا کمال یہ ہے کہ کسی سے متاثر کم ہوتے ہیں، اور ہر جگہ اپنی بات ضرور کہہ دیتے ہیں، خصوصاً بزرگوں کا تذکرہ کرنے، اور ان کے واقعات سنانے کا عمل ہر جگہ جاری رہتا ہے، پھر یہ تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ سننے والوں کے دلوں پر ان بزرگوں کی محبت بیٹھ جاتی ہے، ان سے ملنے کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے، جب کوئی موقعہ ان بزرگوں سے ملنے کا آتا، کہیں ان کی آمد ہوتی، تو لوگوں کو تشکیل کرکے لے جاتے ہیں، کوئی کہیں جانے کو کہے تو ان کے ساتھ جانے کے لئے فوراً تیار ہوجاتے ہیں۔

حج کی تلقین

مولانا ہر طبقہ کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جو لوگ حج کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں مگر ابھی تک اس سعادت سے محروم ہیں، اور اب تک حج کا ارادہ نہیں کیا ہے، ایسے لوگوں سے جب ملاقات ہوتی تو انہیں اس فریضہ کی ضرور یاددلاتے ہیں، اس کے لئے آمادہ کرتے ہیں، فضائل وبرکات سنا کر دیارِ شوق کا شوق دلاتے ہیں، اور ممکن حد تک اصرار بھی کرتے ہیں، اس تحریک سے بہت سے لوگوں کو حج کی توفیق ہوئی، اور وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، دیہاتوں میں آپ کے اس عمل کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا، اور اللہ نے بہت سے لوگوں کو آپ کے ذریعہ حج کی توفیق سے نوازا۔

منازعات کا تصفیہ

آپسی معاملات حل ہوجائیں، گھریلو مسائل سلجھ جائیں، سب لوگ اتفاق اور محبت سے رہیں، مولانا کو اس کی بڑی فکر رہتی ہے، اگر کہیں اختلاف وانتشار ہے، دلوں میں فاصلہ بڑھ رہا ہے، اداروں کے درمیان کشیدگی ہے، اور مولانا کو خبر ملی تو آپ اسے حل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے وقت نکال کر ملتے ہیں، اور ان کی پوری بات سن کر معاملہ ختم کرانے کی کوشش کرتے ہیں، اس سلسلہ میں کوئی جھجھک نہیں ہوتی، اس طرح آپ کے ذریعہ بہت سے معاملات حل ہوئے ہیں۔

ایک عظیم اور مثالی شخصیت

اوپر جن خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ اکثر لوگوں کے مشاہدہ میں ہے، لیکن اب جو عنوان آپ نے پڑھا ہے وہ میرا ذاتی تاثر ہے، میں مولانا کو کئی حیثیتوں سے مثالی شخصیت مانتا ہوں، ایسی شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں، کبھی شخصیت علاقہ کی شناخت ہوتی ہے، اور کبھی علاقہ سے افراد کی شناخت ہوتی ہے، مولانا کا شمار ان شخصیات میں سے ہے جن سے علاقہ کو شناخت ملی ہے، مولانا یہاں کی شناخت ہیں، یہاں کی ایک عظیم ملی شخصیت جناب عبدالحقؒ نے اس علاقہ کو ایک شناخت دی، اور مسلمانوں کو سر اٹھا کر چلنے کا سلیقہ سکھایا، اسی سرزمین کے ایک فرد ملی قائد مجاہد آزادی بیرسٹر محمد شفیعؒ نے اس علاقہ کو شہرت وعظمت کا تاج پہنایا تو مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم نے اس تاج میں ایک خوبصورت نگینہ کا اضافہ کیا۔

یہاں تعلیمی بیداری کے سلسلہ میں آپ کی کوششوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، جب مواقع اور وسائل فراہم ہوں تو کام کرنا آسان ہوتا ہے، مگر وسائل کی کمی کی صورت میں آسان کام بھی مشکل نظر آتا ہے، بنجر زمین کو لالہ زار بنانا جگر کاوی چاہتا ہے، یہ جگر کاوی اللہ نے آپ کے لئے مقدر کی تھی، اسلئے آپ عظیم ہے، مثالی ہیں، آپ کی حیثیت ایک روشن چراغ کی ہے، جس کی روشنی سے پورا علاقہ جگمگا رہا ہے، اور جس کے بجھنے کے باوجود روشنی کی تابش باقی رہے گی۔

حضرت مولانا کی زندگی کے چند ممتاز گوشے

مولانا محمد قاسم مظفر پوری

(قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ)

حضرت استاذ العلماء الشیخ، مولانا ممتاز علی صاحب سابق رئیس الاساتذہ والمعلمین مدرسہ رحمانیہ یکہتہ، مدھوبنی بہار کی حیات وخدمات اور دین وعلم کے لئے مجاہدات کا جو ساٹھ ستر سالہ تسلسل ہے اسے تو کوئی صاحب قلم ہی جمع کرے گا، اس ناچیز کو حضرت دامت برکاتہم سے تقریباً پچاس سالہ رابطہ ہے، جب میں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں زیر تعلیم تھا تو پہلی بار غالباً ۱۹۵۲ء میں حضرت سے اس وقت ملاقات ہوئی جب حضرت مولانا اپنے رفیق درس حضرت مولانا عبد الوہاب صاحب بریار پور سیتا مڑھی استاذ مدرسہ امدادیہ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، ہمارے مشفق استاذ مولانا عبدالوہاب صاحب نے فرمایا کہ یہ ہمارے مخلص و محسن دورۂ حدیث کے رفیق ہیں، پھر جب دارالعلوم سے فارغ ہوکر ۱۹۵۷ء میں مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ میں تدریسی خدمت پر لگا تو حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ کے ہمراہ کئی بار مدرسہ رحمانیہ یکہتہ کے اجلاس میں شرکت ہوئی، پھر تو حضرت مولانا کی مشفقانہ سرپرستی ہی شروع ہوگئی اور بہت سارے امور میں حضرت نے اپنا معتمد سمجھا، یہ ہمارے اکابر کی عالی ظرفی ہے۔

میں اس تحریر کے ذریعہ حضرت مدظلہ کی زندگی کے چند ایسے ممتاز گوشوں کی طرف رہنمائی کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے علماء کے لئے مشعل راہ ہوں اور ان کی زندگی کے رہنما اصول بنیں۔

الف۔ تعلیمی تحریک اور تعلیمی بیداری

ب۔ دعوت الی اللہ کے لئے مجاہدہ

ج۔ مصلحین امت اور مشائخ کبار سے علماء اور دیندار کو جوڑنا

د۔ فریضہ حج کے لئے صاحب ثروت حضرات کو ترغیب

ہ۔ امارت شرعیہ، جمعیۃ العلماء، خانقاہ رحمانی مونگیر اور مسلم پرسنل لا سے وابستگی

و۔ سادگی و مہمان نوازی

حضرت مولانا کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ مولانا نے فراغت کے بعد خود کو دینی تعلیم وتربیت سے وابستہ فرمایا اور دراصل یہ ان کے مربی چچا جناب حافظ یعقوب صاحب اور مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کے بافیض اساتذہ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب اور مظاہر علوم کے مشائخ کبار کی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا، ۱۹۵۰ء میں مدرسہ مظاہر علوم سے فراغت ہوئی، یہ مرکز ہر دور میں علوم ومعارف اور روحانیت کا مرکز رہا ہے، اس کے فارغین پر ایک خاص رنگ ہو جاتا ہے، مولانا مسند درس پر جب آئے تو ایک طرف طالبان علوم نبوت کو فیض پہونچاتے رہے ہیں اور دوسری طرف مولانا کو یہ فکر رہی کہ ہر آبادی میں مکاتب کا جال بچھ جائے، چنانچہ قریہ قریہ اس تحریک کو آپ پیش کرتے رہے ہیں، اصلاحی مجالس میں محراب ومنبر سے اس موضوع کو انتہائی دل سوزی سے بیان کرنے کو اپنی اہم ذمہ داری محسوس کرتے، اور اللہ کی مہربانی سے ہر آبادی میں چھوٹے چھوٹے مدرسے اور مکاتب کے قائم کرنے کے سلسلہ میں لوگوں میں تحریک کی اور کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔

دعوت الی اللہ

حضرت مولانا کی زندگی اخلاص کے ساتھ دعوت الی اللہ میں مصروف رہی ہے، دعوت و تبلیغ کی جو عالمی محنت چل رہی ہے، مولانا اس سے مربوط رہے کہ تمام لوگوں کی طرح جماعت کے حلقوں میں بیٹھتے، ہٹو بچو کا کوئی مزاج نہیں، جماعتوں کے درمیان عام انداز میں برابر رہنے کا مزاج رہا، اور ہمیشہ آپ کے ذکر قلبی ولسانی سے پاس وقریب کے رہنے والوں کو اس کی حرارت پہونچتی رہی، دعوت کے کاموں کی برکت سے کبھی یہ مزاج نہیں کہ ان کے نام اخبارات میں آئیں، دعوت الی اللہ کی راہ وہ راہ ہے کہ اس میں صبر ہے، مجاہدہ ہے، اور تمام

عرفی رشتوں کو یکسر آدمی بھول جاتا ہے۔

مولانا اس کے بہترین نمونہ ہیں، کتنی بار محترم الحاج عبد الحکیم صاحب سونرے کے ہمراہ میں ان کو دیہات کے دعوتی اجتماع میں دیکھا تو حیرت ہوئی، کتنی سادگی کے ساتھ تمام نظام عمل سے جڑے رہتے اور ہر ایمان والے کو اس کی برکات بتاتے اور ان کو دعوتی اعمال سے جوڑتے، دعوت الی اللہ کی اس مخلصانہ جدوجہد نے علماء سے لے کر خواص وعوام کے دلوں میں محبوبیت و مقبولیت پیدا کی۔

دربھنگہ شہر میں غالباً ۱۹۷۲-۷۳ء میں ایک بڑا اجتماع تھا، اس کی محنت کے لئے جناب اقبال نیر صاحب، محمد ذکی انجینئر بھوپال، حافظ ظہور احمد صاحب یکہتہ، عبد القیوم صاحب یکہتہ وغیرہ کی ایک جماعت تھی، مدرسہ رحمانیہ سے حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ کے ایماء پر میں اور میرے مخلص ساتھی مولانا شمیم احمد صاحب استاد مدرسہ رحمانیہ بھی تھے، یکہتہ میں تشکیل کی اہمیت اور کام کرنے کے طریقے پر تفصیلی گفتگو ہوئی، اس کی سربراہی حضرت مولانا فرماتے رہے، اور سفر کا اختتام ایک بڑے علمی قصبہ پر ہوا، جہاں مسجد کے ذمہ داروں میں سے بعض نے اعتراضاً یہ کہا کہ اس تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ حضرات کسی اور آبادی میں جائیں، بہرحال مولانا کی زندگی کا اہم ترین پہلو یہ دعوت الی اللہ کا پہلو ہے اور آج تک اس سے وابستہ ہیں۔

دعوتی اجتماعات میں خالص توحید اور اتباع سنت کا اہتمام ان کا موضوع بیان رہتا ہے، پس مولانا کی زندگی کا زرین باب یہی دعوت الی اللہ ہے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو بحیثیت خیر امت ہر جگہ پیش فرمایا، ہمارے علماء کی بھی اہم ذمہ داری ہے، علماء کو ابر کے ٹکڑوں کی طرح گھوم گھوم کر برسنا چاہئے اور ہر پیاسی زمین کو سیراب کرنا چاہئے۔

مشائخ اور اہل اللہ سے لوگوں کو قریب کرنا

انسانی اور ایمانی زندگی میں صحبت کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اسے ہر صاحب حکمت وبصیرت خوب جانتے ہیں، خود قرآن کریم میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تقوی کو اختیار کریں، اور

تقوی حاصل ہونے میں عارفین وصالحین کی صحبت کا اثر پڑتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا علیہ الرحمۃ، حضرت مفتی محمود حسن اور حضرت مولانا محمد طلحہ اور دعوت وتبلیغ کے مشائخ سے رابطہ پیدا کیا اور خود بھی اعتکاف کے لئے سہارنپور جاتے رہے ہیں، اور اپنے ہمراہ مختلف آبادیوں کے مختلف اصحاب طلب کو لے جاتے رہے ہیں، جو بھی اعتکاف اور بزرگوں کی نصیحت سے فیض یاب ہوجاتا تو اس کے دل کی دنیا منور ہوگئی، اور اس کی نسلوں میں علم اور دین کا سلسلہ جاری ہوگیا، اس کی وجہ سے مذکورہ حضرات کو بار بار یہاں اور اس کے مضافاتی علاقے میں مدعو فرماتے اور خود بھی فاتحہ کے اجتماع میں بالالتزام جاتے رہے ہیں، اور طالبین کو سلسلہ رحمانیہ سے وابستہ کراتے رہے ہیں۔

اس وقت علماء کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی، چنانچہ نئی نسلوں میں عملی بگاڑ کے ساتھ فکری اور اعتقادی کمزوریاں رونما ہونے لگی ہیں۔

سفر حج کے لئے وفود

حضرت مولانا کا یہ گاؤں (قصبہ) شروع سے حج کی برکتوں سے فیضیاب ہوتا رہا ہے، اس بارے میں حضرت مولانا نے ہر صاحب استطاعت کو اپنی پرخلوص محنت کے ساتھ حج کے لئے آمادہ کیا۔

آج الحمدللہ ان مساعی جمیلہ کی بناء پر ہر خاندان میں دو چار پانچ حجاج ہیں، بلکہ اب تو دوبارہ حج میں جانے والوں کی ایک لمبی قطار ہے، جن میں مردوں کے علاوہ خواتین بھی کثیر تعداد میں ہیں، حج وغیرہ کی برکت سے یہاں لوگوں میں دینی، اقتصادی، اخلاقی حالت بہتر سے بہتر ہوئی ہے، یہ بھی ادع الی سبیل کی مجاہدانہ سرگرمی ہے۔

رفع نزاع ومصالحت کے لئے سعی

مولانا مدظلہ ہمیشہ مسلم آبادیوں کے درمیان اگر کوئی اختلاف وانتشار ہوجاتا تو بہت فکر مندی سے آپس میں اتفاق واتحاد پیدا کرانے کی انتہائی سعی فرماتے، اور اگر فریقین کے

درمیان سنجیدگی پیدا ہوجاتی تو مجھ قاضی شریعت کو بھی کتنے معاملات میں مدعو فرماتے اور حکم دیتے کہ فریقین کے درمیان مصالحت کی پوری کوشش کیجئے، اور خود دعا میں مشغول ہوجاتے، اور فریقوں کے معاملات اور نزاعات کو حل کرنے کے لئے مجھ پر اعتماد فرماتے، مدھوبنی ضلع کے مختلف گاؤں کے اہم مقدموں میں یہ جدوجہد مولانا کے ذریعہ عمل میں آتی، بعض مدارس کے جھگڑوں کو بھی مولانا کی وساطت سے حل کیا گیا ہے۔

یہ سب کچھ اخلاص کے ساتھ کیا گیا، اس لئے مولانا کی علاقہ میں بڑی مقبولیت پیدا ہوئی، علاقہ کے حالات کو دیکھ کر اس موضوع پر برابر گفتگو ہوتی رہی کہ یہاں نظام قضاء کا قیام ضروری ہے، چنانچہ الحمدللہ ۲۲ اپریل ۲۰۰۸ء کو دارالقضاء کا قیام بھی بڑے مجمع میں آیا۔

حضرت مولانا کی زندگی میں تقوی وطہارت کے ساتھ انتہائی سادگی ہے، اور اکرام مسلم کا خوب خیال رہتا ہے، مہمان نوازی کا خاص جذبہ ہے، ملی، اجتماعی کاموں سے شروع سے وابستگی رہی ہے، ایام طالب علمی میں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں جمعیۃ العلماء کے حامی رہے اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کے رکن رکین رہے، ساتھ ہی مسلم پرسنل لا بورڈ کے تمام تجاویز کو ہر چھوٹے بڑے اجتماع میں پوری قوت سے پیش فرماتے رہے جو ہمارے اکابر کا مشن ہے۔

حضرت مولانا کی زندگی کے یہ چند گوشے تھے، جو اس وقت میرے ذہن میں آئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی خصوصیات کو ہم خوشہ چینوں میں بھی پیدا کردے، حق تعالیٰ حضرت کی عمر دراز فرمائے اور ان کے تمام تلامذہ وجانشین کو ان کی زندگی کے تقدس زریں کا حامل بنائے، اللہ تعالیٰ حضرت کی عمر میں برکت عطا فرمائے، آمین

ایک شخص، ایک انجمن

مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
(نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ)

بہار میں تعلیمی بیداری لانے اور اس کو گھر گھر عام کرنے کے لیے جن چند لوگوں کی خدمات غیر معمولی رہی ہیں اور اس کے دور رس اور دیر پا اثرات سامنے آئے ہیں، ان میں ایک بہت معتبر، انتہائی قد آور نام، دلآویز اور دلکش شخصیت حضرت مولانا ممتاز علی (ولادت 1930) بن محمد سلیم سابق پرنسپل مدرسہ رحمانیہ یکہتہ مدھوبنی کی ہے۔ ہر دم رواں اور بڑھاپے میں بھی پیہم دواں مولانا کی ذات ہم جیسوں کے لیے قابل تقلید ہے، عمر کی اس منزل میں جب قویٰ جواب دے رہے ہیں، جسم بھی بارگاہ ایزدی میں ان کے دل کی طرح جھکا جا رہا ہے۔ اس حالت میں بھی علاقہ کی فکر اور اسفار ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے، وہ علم، صلاح، تقویٰ میں بہت بڑے ہیں؛ لیکن تواضع اور انکساری میں ثمر دار درخت کی طرح چھوٹوں کے لیے بھی اپنے بازو پھیلا دیتے ہیں، اب جبکہ مردم سازی کا فن ختم ہوتا جا رہا ہے اور ہر قد آور شخص برگد کی درخت کی طرح بنا ہوا ہے جس کے نیچے کوئی پودا تناور درخت نہیں بن سکتا، ایسے میں مولانا موصوف کا وجود غنیمت ہے، انہیں مردم سازی کا فن آتا ہے اور وہ پوری دریا دلی کے ساتھ اس کو برتتے ہیں، اپنے اس فن سے انہوں نے کتنوں کو کام کا بنا دیا، دراصل یہ مزاج ان کا بنا، امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ اور حضرت شیخ زکریاؒ کی صحبت ومحبت، تربیت، بیعت وطریقت سے، مولانا ممتاز علی نے ان حضرات سے کسب فیض کیا، مولانا محمد طلحہ دامت برکاتہم سے خلافت پائی اور اس فیض کو ابر رحمت کی طرح علاقہ پر

برسایا، گلی گلی، محلے محلے گشت کیا، مدرسوں، خانقاہوں، مکاتب اور دور دراز کی بستیوں تک پیغام ربانی کو پہونچایا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، اللہ کرے تا دیر جاری رہے۔

مولانا ممتاز علی مظاہری کی پیدائش ضلع مدھوبنی (سابق ضلع دربھنگہ) کی مردم خیز بستی یکہتہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار شریف تشریف لے گیے اور مولانا ریاض احمد صاحب مولانا محمد ابراہیم صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب رمضان پوری اور مولانا محمد حنیف نیموی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے نصاب کے مطابق عالم تک تعلیم حاصل کیا اور بورڈ امتحان میں اچھے نمبرات سے کامیاب ہوئے، ۱۹۴۷ء میں آزادی کا سورج طلوع ہوا تو نقل مکانی کے ساتھ خون ریز فساد کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس کی وجہ سے فاضل کی تعلیم ملتوی کرنی پڑی، ۱۹۴۸ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی، بعض کتابیں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھیں، بعد میں مولانا نے مدرسہ اکزامینیشن بورڈ سے فاضل حدیث، فاضل تفسیر، بی اے آنرس فارسی بھی کیا۔ دوران درس حضرت شیخ کی خصوصی شفقت ومحبت مولانا کو حاصل رہی، چنانچہ حضرت شیخ نے مدرسہ چھوڑتے وقت نصیحت کیا کہ ”کسی دینی مدرسہ میں رہنا“ مولانا کے دل میں یہ بات گڑ گئی، صلاحیت بھی تھی اور مواقع بھی تھے، لیکن مولانا نے دینی تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔

۱۸۸۰ء سے یکہتہ میں ایک مدرسہ چل رہا تھا، مولانا زین الدینؒ کی ذات بابرکات اور غیر معمولی توجہ اور انہاک کی وجہ سے اطراف وجوانب کے طلبہ ان سے فارسی پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے، فارسی کا چلن تھا اور آج کی طرح یہ زبان متروک نہیں تھی، مولانا کے وصال کے بعد مدرسہ کا وجود تو باقی رہا لیکن وہ بات کہاں میر مدن کی سی۔

۱۹۵۰ء میں مولانا نے بحیثیت مدرس اول اس مدرسہ کی کمان سنبھالی اور مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ کا مشکل اور دشوار ترین کام شروع کیا، مدرسہ میں مطبخ نہ ہونے کے باوجود اطراف و جوانب ہی نہیں دور دراز علاقوں مثلاً پورنیہ، سہرسہ، بھاگل پور، وغیرہ سے طلبہ آنے لگے، ان کی

رہائش کے لیے اس وقت مدرسہ کے پاس چند کھپڑے پوش کوٹھریاں تھیں، کھانے پینے کا سارا نظم گاؤں کے لوگ کیا کرتے تھے۔

یکہتہ کے نامور سپوت جناب محمد شفیع بارایٹ لا حکومت بہار میں وزیر تعمیرات ہوئے تو انہوں نے اس مدرسہ کا الحاق ۱۹۵۲ء میں مدرسہ اکزامینیشن بورڈ سے کرایا اور مولانا موصوف کی محنت سے یہ مدرسہ ترقی کرتا ہوا فاضل معیار تک پہونچا، آج اس مدرسہ کی عالیشان عمارت کھڑی ہے، دارالقدیم میں بارہ کمرے ہیں اور دارجدید اٹھارہ کمروں پر مشتمل ہے، مدرسہ کے قریب عالی شان مسجد بھی مولانا ہی کی محنت کا ثمرہ ہے، گاؤں کے چھ سو سے زائد طلبہ مولانا کے وقت میں اس مدرسہ سے استفادہ کرتے تھے، اساتذہ کی تعداد ۲۴ر تھی، جس میں سے بارہ کی تنخواہ عوامی چندے سے پوری کی جاتی تھی، مطبخ سے ایک سو غریب ونادار کی کفالت ہوتی تھی، یہ اعداد وشمار مولانا کے وقت کے ہیں۔

مولانا کی محنت سے جو اس مدرسہ سے رجال تیار ہوئے، ان میں کئی نامور پروفیسر اور استاذ ہوئے، ڈاکٹر یٰسین انصاری، ڈاکٹر بدیع الزماں آر کے کالج مدھوبنی، ڈاکٹر توحید عالم آر ڈی ایس کالج مظفر پور، مولانا نور الہدیٰ شمسی مسلم ہائی اسکول پٹنہ، شفیع الرحمٰن اور ینٹیل ہائی اسکول پٹنہ سٹی اسی مدرسہ کے ابناء قدیم ہیں، یقیناً کوئی بھی ادارہ اپنے ایسے سپوت پر ناز کر سکتا ہے، لیکن میرے نزدیک مدرسہ رحمانیہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے بہار اور بیرون بہار مساجد اور مکاتب کے لیے امام اور معلمین فراہم کئے، پورے ملک میں اس کام کے لیے جتنے افراد اس گاؤں نے فراہم کیے اتنے میرے علم کے مطابق کسی اور ادارے نے نہیں فراہم کیا، مولانا نے یہاں کے فارغین کا جو ذہن بنایا وہ قوت لایموت پر قناعت کا، سب جانتے ہیں کہ مکتب کے معلمین اور مساجد کے ائمہ کو کیا تنخواہ ملتی ہے، لیکن یہاں کے فارغین نے توکل اور قناعت کے ساتھ مولانا کے دینی تعلیمی مشن کو گاؤں گاؤں گھر گھر اور گلی گلی تک پہونچا دیا، تنہا یہی خدمت اتنی بڑی ہے کہ اس میں مولانا کی کوئی ہم سری نہیں کر سکتا اور مولانا کی مغفرت کے لیے کافی ہے۔

مولانا کی خدمت کا دائرہ بڑھتا گیا۔ دینی تعلیم اصلاح معاشرہ اور اصلاح ذات پر مولانا نے اپنی توانائی صرف کردی، درجنوں مدرسوں کے سرپرست رہے، مولانا کی یہ خدمت عنداللہ تو مقبول تھی ہی، عندالناس بھی مقبول ہوئی، شہرہ عام ہوا تو یوم اساتذہ کے موقع سے ۵ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو ملک کا باوقار قومی انعام برائے اساتذہ بھی صدر جمہوریہ کے ہاتھوں آپ کو ملا، اس طرح حکومتی سطح پر آپ کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

مولانا حضرت امیر شریعت رابع کے خصوصی معتقد اور اکابر امارت شرعیہ کے ہر دور میں خصوصی معتمد رہے، حضرت امیر شریعت رابع سے لے کر امیر شریعت سادس تک مسلسل مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور جب تک قُویٰ نے جواب نہیں دیا بڑی پابندی سے مجلس شوریٰ کے حاضر باش رہے، کوئی موقع ہوا اور کوئی کام آپڑا ہو، امارت شرعیہ کا خط گیا اور مولانا مہم میں جُٹ گئے، اپنی بڑائی کے ساتھ دوسرے علماء کا ادب واحترام اور سمع وطاعت کے ساتھ کام کرتے مولانا کی طرح میں نے کم لوگوں کو پایا۔ امارت شرعیہ سے خصوصی محبت کے نتیجے میں ان کی تگ ودو اور جد وجہد سے ہی یکہتہ میں دارالقضا کا قیام عمل میں آیا اور الحمد للہ اس شعبہ کے ذریعہ وہاں اچھا کام ہو رہا ہے، یکہتہ میں چھوٹی بڑی کوئی تقریب تعلیمی بیداری کانفرنس یا جلسہ ہو وہ اکابر امارت شرعیہ کے بغیر نہیں کر سکتے، بڑے نہیں دستیاب ہو سکے تو ہم جیسے چھوٹوں کو ہی بلائیں گے، لیکن امارت کا نمائندہ ضرور ہوگا، ان کے حلقے میں بھی اگر کوئی پروگرام ہوگا تو امارت شرعیہ کے لوگ کو ضرور مدعو کراتے ہیں۔

انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے دو اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور علاقہ میں مسلم پرسنل لا کے ذریعہ چلائے جارہے اصلاح معاشرہ کی تحریک کو عام کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔

مدرسہ رحمانیہ سے ۱۹۹۴ء میں سبکدوشی کے بعد انہوں نے معہد البنات یعقوبیہ کے نام سے یکہتہ میں ہی لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا یہ مدرسہ وفاق المدارس الاسلامیہ امارت سے ملحق ہے اور اچھے انداز میں چل رہا ہے، میں اسے مولانا کی کرامت سمجھتا ہوں۔

مولانا سے میری ملاقات مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور کے زمانہ تدریس سے ہے، جس زمانہ میں، میں ''بہار مدرسہ بورڈ ___ تاریخ وتجزیہ'' کی تصنیف میں مشغول تھا اور شمس الہدیٰ کے قبل قائم شدہ اداروں کی تاریخ مرتب کر رہا تھا، مولانا سے میری ملاقات ہوئی تھی مولانا نے مدرسہ رحمانیہ کی اجمالی تاریخ بتائی تھی، جسے میں نے شامل کتاب کرلیا تھا وہ دن اور آج کا دن، مولانا کی محبت وشفقت اس حقیر پر مسلسل اور بے پایاں ہے۔ نہ معلوم کتنے پروگرام میں یکہتہ بلایا اور کن کن عنوانوں سے بلایا۔

ایسے بافیض شخص کے لیے صحت وسلامتی اور درازیٔ عمر کی نہ دعا کرنا اپنے لیے محرومی کی بات ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن ہزار

ایک ایسی شمع جس کے بجھنے سے اندھیرا ہوگا

مولانا محمد رضوان عالم قاسمی
(مدرسہ رحمانیہ سوپول، دربھنگہ)

صوبہ بہار ہمیشہ سے علوم ومعرفت کے ماہ ونجوم کا مرکز رہا ہے، خدائے تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے فضل وکرم سے اس سرزمین پر مایہ ناز وقابل صد افتخار علماء، مشائخ وصالحین کی جماعت اور سیاسی وسماجی خدمت گاروں کو جنم دیا ہے، اسی پر بس نہیں، بلکہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کی فضاء میں جینے کا جذبۂ حریت سب سے زیادہ اسی سرزمینِ بہار کے باشندوں میں پائی جاتی ہے، جبھی تو تحریکِ آزادی کی جوت لگانے کے لئے گجرات کے رہنے والے مہاتما گاندھی نے اسی سرزمینِ بہار کا رخ کیا۔

ہاں! ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ دنیا تغیرات کی دنیا ہے، لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں، اس دنیا کی ہر مقبول ومحبوب، دلکش ودلنواز ہستی کو ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑنی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کے چھوڑنے سے ایک گھر یا ایک خاندان روتا ہے اور کسی کے چھوڑنے سے نہ صرف پورا ملک بلکہ پوری ملت غم واندوہ کے ماحول میں ڈوب جاتی ہے، ابھی کل کی بات ہے، ایک دہائی قبل تک پورا ملک علماء ومشائخ، سلف صالحین اور بزرگ شخصیتوں سے بھرا پڑا تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس قلیل عرصہ میں اکابر علماء ومشائخ کی محفلیں اجڑتی چلی گئی، اب علمی وعملی انحطاط بڑھتا جارہا ہے، ملت دن بہ دن عظیم خلاء سے دوچار ہوتی جارہی ہے، اور سب سے پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہر جانے والے اپنا بدل چھوڑ کر نہیں جارہے ہیں، ایسے عالم میں شمال مشرقی ہندوستان کی اس عظیم علمی، دینی وملی اور روحانی شخصیت جنہیں دنیا حضرت

مولانا ممتاز علی صاحب مظاہری دامت برکاتہم (سابق پرنسپل مدرسہ رحمانیہ یکہتہ، ضلع مدھوبنی)
کے نام سے جانتی ہے، کا سایہ اوران کی زندگی ہم سبھوں کے اوپر عظیم نعمتِ خداوندی سے کم
نہیں، کیونکہ حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ذریعہ نہ صرف مدھوبنی ضلع بلکہ ہندونیپال کے
سرحدی علاقے کے دونوں طرف جو علمی، دینی وروحانی فیض پہونچا ہے وہ بے مثال ہے، یا
یوں کہیے خدمتِ دین کے راستے میں حضرت مولانا ممتاز علی صاحب مظاہری دامت برکاتہم
کی شخصیت اس گوہرِ کمال کی ہے جن کے تذکرے کے بغیر اس علاقے کی تاریخ ہمیشہ ادھوری
رہے گی۔

حضرت مولانا کو بار بار مدرسہ رحمانیہ سوپول میں قریب سے دیکھا ہے، لمبا قد، چوڑی
جسامت، سانولی رنگ، بڑا گول سر، چہرہ پر سفید لمبی داڑھی، میانہ پیشانی پر ذہانت کی جھلک،
چہرہ پر شرافت کی چمک، اور گفتگو کا نرم لہجہ، سبحان اللہ! خدمتِ دین کے راستے میں حضرت
مولانا کو ہندونیپال کے اس سرحدی علاقہ میں جن سخت مجاہدات کی راہوں سے گزرنا پڑا، آج
اس کا تصور بھی مشکل ہے، اپنی پوری جوانی بلکہ پوری زندگی اطراف کے علاقے کے دینی،
دعوتی، اصلاحی دوروں میں گزار دیا، اور آج بھی بڑھاپے میں اسی راہ پر گامزن ہیں، دھوپ،
گرمی، بارش برسات، بھیڑ بھاڑ والی بسوں کا سفر، رکشہ اور ٹم ٹم تک کی سواریوں سے سابقہ، کبھی
کبھی میل ومیل پیدل کا سفر، مگر کبھی بھی کارِ دین میں آپ کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔

حضرت مولانا کے طالب علمی کا زمانہ تو ہم لوگوں کو معلوم نہیں، مگر یہ ضرور ہے کہ آپ ان
باکمال لوگوں کے ہم عصر رہے ہیں جن پر زمانہ رشک کرتا ہے، یقیناً زمانہ طالب علمی سے ہی
تقوی وطہارت کے آثار نمایاں رہے ہوں گے، کیونکہ آپ کو گھر کا پاکیزہ ماحول بھی ملا، اور
عالم اسلام کی ممتاز دینی، علمی وعرفانی درسگاہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی نورانی فضاء بھی میسر
آئی، جس نے آپ کو حقیقی ممتاز بنا دیا، آپ کی پوری زندگی معاملہ چاہے معاشرتی امور کا ہو، یا
امر بالمعروف کا پھر نہی عن المنکر کے باب میں اولوالعزمی کی شاندار جدوجہد کا، یا اتباع سنت و
احیاءِ سنت جیسی عظیم خدمات کا، ان سب میدان میں اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ سے بڑا کام لیا

ہے، بے شک آپ کی زندگی دین کا کام کرنے والوں کے لئے نہ صرف نمونہ ہے بلکہ تحریک
حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے، کیونکہ حضرت مولانا ممتاز علی صاحب دامت برکاتہم اس عظیم
شخصیت کا نام ہے جو نزاعی معاملات میں اصول پسند ہیں، جو مرجع خلائق ہیں، جو اہل تقوی و
طہارت مشائخ میں سے ہیں، جو متبع سنت اور محتاطِ طرزِ حیات رکھنے والے چند اکابر علماء و
مشائخ میں ایک ہیں، جنہیں پورے ملک کے علمی ودینی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے
دیکھا جاتا ہے، جو مرجعِ خلائق ہونے کے باوجود بھی ہمیشہ اپنے کو اصلاح ومشورہ کا محتاج خیال
فرماتے ہیں، جو دراصل ہمارے اکابر کی شان رہی ہے۔

جنہوں نے ملک کی تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جن کے شاندار علمی کارنامے
کی وجہ سے نائب صدر جمہوریہ ہند نے راشٹرپتی بھون دہلی میں خصوصی ایوارڈ سے نوازا، جو
بڑوں کے اکرام اور چھوٹوں سے محبت وشفقت کے برتاؤ میں اپنی مثال آپ ہیں، حضرت
مولانا اگر ایک مدرسہ رحمانیہ کے پرنسپل رہے تو دوسرے مدرسہ رحمانیہ سے بھی ان کا بہت ہی
قریبی رشتہ رہا ہے، یہ دوسرا مدرسہ رحمانیہ ملک کی عظیم وقدیم دینی واسلامی درسگاہ ہے، جسے آج
سے ایک صدی قبل مسلمانوں کے غریب ویتیم، بے سہارا بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے
۱۳۲۲ھ میں مجدد العلم والعرفان، قطب عالم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء
نے قائم فرمایا تھا، گذشتہ نصف صدی کے زائد عرصہ سے اس کی ہر مجلس شوری اور اجلاسِ دستار
بندی کے موقع پر مولانا ممتاز صاحب کو خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا رہا ہے، آپ ہر موقع پر اس
میں شرکت کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے تمام احوال کی خیر وخبر، مدرسہ کے انتظامی امور میں
رہنمائی، طلبہ کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں مفید مشورے سے نوازتے رہے ہیں، مدرسہ رحمانیہ
سوپول کے تمام اساتذہ وطلبہ آپ کی آمد کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں، میں نے بارہا دیکھا کہ
مدرسہ رحمانیہ کے سن رسیدہ بزرگ مہتمم ومربی، نمونہ سلف حضرت الحاج مولانا محمد شمس الہدی
صاحبؒ اپنی کبرسنی اور ضعف کے باوجود آپ کے قیام وطعام کا پورا خیال فرماتے، ہمہ وقت
خیریت دریافت کرتے اور آپ پر بے حد اعتماد کرتے۔

افسوس صد افسوس! کہ اب بزرگوں کی زندگی کی شام ہورہی ہے، ان حضرات کے بعد اپنے چھوٹوں کی اصلاح ورہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنے کا یہ سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے، ایسے وقت میں یقیناً حضرت مولانا دامت برکاتہم کی ذات گرامی ایک ایسی شمع ہے جن کے بجھنے سے اندھیرا ہوگا، دعا ہے کہ حق شانہ حضرت مولانا کے سایہ مبارک کو تادیر ملت کے سروں پر قائم ودائم رکھے اور ان کے فیض کو عام فرمائے۔

شمالی بہار کی دو نامور شخصیات

مولانا رضوان احمد ندوی

(سب ایڈیٹر 'نقیب' پھلواری شریف پٹنہ)

شمالی بہار کا ضلع دربھنگہ اور مدھوبنی اپنی گوں ناگوں خصوصیات کی وجہ سے ہر زمانہ میں علماء وصلحاء کا مرکز توجہ رہا ہے، اس کی خاک میں نہ جانے کتنے گنج ہائے گرانمایہ مدفون ہیں، جو اپنی تاریخی اور علمی خصوصیات کے لحاظ سے شہر پٹنہ اور نالندہ سے کسی طرح کم نہیں، اور اس وقت بھی ایسے لعل وگہر سرزمین ہندوبیرون ہند کی زینت بنے ہوئے ہیں جو اپنی علمی وفکری ضیاء پاشیوں سے لوگوں کے ذہن کو منور کررہے ہیں، مگر افسوس کہ اس کی قدیم وجدید تاریخ پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، جس کی وجہ سے ان کے علمی کارنامے منظر عام پر نہ آسکے۔

ضلع مدہوبنی کا موضع یکہتہ اس حیثیت سے ممتاز قصبہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے اصحاب فضل وکمال پیدا ہوتے رہے ہیں، جنہوں نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا، اس سلسلہ میں مجاہد آزادی اور قائد ملت جناب محمد شفیع بیرسٹرؒ کی تحریک آزادی میں سرفروشانہ قربانیاں ناقابل فراموش ہیں، جب اٹھارہویں صدی میں ہندوستان برطانیہ کے زیر اقتدار آیا تو اس مرد مجاہد نے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے ملکی اور ریاستی سطح پر تحریک چلائی، صعوبتیں برداشت کیں، اور آزادی حاصل کرنے کے لئے جانثاری اور سرفروشی کے مظاہرے کئے، اور پھر انہیں جیسے مجاہدین کی تحریک کے نتیجہ میں یہ ملک آزاد ہوا، ع

شامل ہے لہو میرا بھی گلستاں میں

جناب محمد شفیع بیرسٹر صاحبؒ کی سیاسی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی قائدانہ

طبیعت تھی جو انہیں اپنے معاصرین سے ممیّز وممتاز کرتی ہے، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

موضع یکہتہ کی ایک دوسری ممتاز شخصیت حضرت مولانا ممتاز علی مظاہری دامت برکاتہم کی ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ مولانا سے میرے تعلقات اس قدر گوناگوں ہیں کہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کو کہاں سے شروع کیا جائے، کیا کہا جائے، اور کیا چھوڑا جائے، میں نے مولانا کو سب سے پہلے ۹۷ء میں سوپول (دربھنگہ) کی جامع مسجد شیخ پورہ میں دیکھا، بلند وبالا قامت، خوبصورت داڑھی، سر پر سفید رومال، جدھر نکل جائیں آنکھیں اٹھ جائیں، وہیں کسی نے بتایا کہ یہی مولانا ممتاز علی مظاہری صاحب ہیں، پھر تو جی بھر کر دیکھا۔

جب ۱۹۸۱ء میں مدرسہ رحمانیہ سوپول (دربھنگہ) میں داخل ہوا تو اساتذہ کرام سے ان کا ذکر خیر سنتا رہا، پھر وقفہ وقفہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور ہر ملاقات میں تعلقات کی تجدید ہوتی رہی، اس کے بعد جب ۹۱ء میں امارت شرعیہ سے وابستہ ہوا تو ان روابط میں استحکام پیدا ہوتا رہا، اس احقر پر ان کی بے پناہ شفقتیں اور عنایتیں رہیں جو کہ تادم تحریر قائم ہیں، ان کے اخلاقی فضائل میں وضعداری کی صفت بڑی نمایاں رہی ہے، جس سے جتنا ملتے ہیں عمر بھر اسی طرح ملتے ہیں اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مجلس میں کبھی کسی کی برائی یا عیب جوئی نہیں ہوتی ہے، میں اکثر دیکھا کہ مولانا بڑوں کے قصے، حالات اور حکایتیں اس قدر ذوق وشوق اور لطف سے مجلس میں بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ بلبل ہزار داستاں معلوم ہوتے ہیں۔

گرچہ مولانا میرے باضابطہ استاذ نہیں ہیں، مگر ہمارے اساتذہ کرام کے استاذ ضرور ہیں، اس حیثیت سے ان سے ہمارا روحانی اور قلبی رشتہ قائم ہوا، اور اسی نسبت سے مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے سایۂ شفقت کو تادیر ملت اسلامیہ پر قائم رکھے اور ان کے فیوض وبرکات کو عام وتام فرمائے۔

این دعا از من وجملہ جہاں آمین آباد

استاذ محترم کی زندگی کے چند نقوش

پروفیسر یٰسین انصاری
(سابق صدر شعبہ اردو آر کے کالج، مدھوبنی)

مولانا محترم معروف عالم دین اور کئی حیثیتوں سے منفرد شخصیت کے حامل ہیں، شمالی بہار اور بطور خاص ہندو نیپال کے سرحدی اضلاع میں دینی بیداری، دعوت اور تعلیم کے میدان میں آپ ایک اہم مقام رکھتے ہیں، تعلیم کی ترویج واشاعت میں آپ نے بڑی جدوجہد کی اور صعوبتیں برداشت کیں، آج یکہتہ اور اس کے اطراف واکناف میں تعلیم کی طرف جو رجحان بنا ہے ان میں بڑا دخل مولانا کی ذات کو حاصل ہے، ہندوستان کے متعدد اکابر علماء، بزرگان دین اور ملی قائدین سے آپ کا گہرا رشتہ ہے، آپ کی شخصیت گوناں گوں صفات وکمالات کی حامل ہے، آپ نے سرکار ہند سے نیشنل ایوارڈ بھی اپنی تعلیمی خدمات کی بناء پر حاصل کیا ہے۔

حضرت نہ صرف میرے استاد ہیں بلکہ آپ استاد الاساتذہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یکہتہ ہی نہیں بلکہ علاقہ ومضافات، ضلع وبیرون ضلع میں ایک منفرد جید عالم دین اور بزرگ شمار کئے جاتے ہیں، انہوں نے زندگی بھر دعوت وتبلیغ اور علم دین کی اشاعت وترویج میں بھرپور حصہ لیا اور لے رہے ہیں، چنانچہ ابھی آپ عمر کے جس مرحلہ میں قدم رکھ چکے ہیں اس عمر میں اکثر وبیشتر اشخاص اپنی باقی ماندہ زندگی آرام وسکون میں گزارنے کی سعی بلیغ کرتے ہیں، مگر حضرت مولانا اپنے آرام وسکون کو چھوڑ کر تعلیمی ودینی بیداری اور اصلاح معاشرہ کے لئے رات دن مصروف عمل نظر آتے ہیں، چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک ادارہ ''معہد

البنات یعقوبیہ'' کے نام سے سرزمین یکہتہ میں رٹائرمنٹ کے بعد قائم کر کے تعلیم نسواں کو فروغ دے رہے ہیں، یہ ادارہ اپنے آپ میں منفرد ہے، اور صرف اور صرف حضرت مولانا ہی کا کارنامہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا درس عالیہ کے تحت آج کل کے مدارس کے نظام تعلیم سے مطمئن نہیں، اسی لئے غالباً مدرسۃ البنات کے رہتے ہوئے بھی آپ نے ''معہد البنات یقوبیہ'' کی بنیاد ڈال کر تعلیم وتربیت کا ایک منفرد ادارہ کھولا ہے، یا یہ کہ یکہتہ کی سرزمین پر آبادی کے لحاظ سے صرف ایک مدرسۃ البنات کافی نہیں، جو بھی ہو، مولانا کی یہ علمی خدمت قابل قدر اور لائق صد آفریں ہے۔

حضرت مولانا سے پڑھنے کا اتفاق مجھے تقریباً چار پانچ سال ملا، درس نظامیہ کے تحت بھی اور درس عالیہ کے تحت بھی، ان دونوں نظام تعلیم میں آپ ہی صدر مدرس اور پرنسپل تھے، مولانا کا طریق تعلیم بہت ہی سخت گیر تھا، ابتداء میں آپ بڑے سخت قسم کے استاد تھے، اور بچوں کو خوب پیٹتے تھے، ممکن ہے کہ مولانا موصوف اس تھیوری کے قائل ہوں'' Spare the stick spoile tht child'' (چھڑی چھوڑ دو، بچے خراب ہو جائیں گے) جسمانی سزا اگرچہ ممنوع، نامسعود اور خراب سمجھی جاتی ہے، لیکن مار کے ڈر سے بچے ہر فن کی کتاب تقریباً زبانی رٹ جاتے تھے، چنانچہ ہم لوگ صرف ونحو کے علاوہ منطق وفلسفہ اور تاریخ وجغرافیہ بھی زبانی رٹ گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ باوجود درس عالیہ سے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے کسی بھی بڑے سے بڑے ادارے کے نظامی طالب علم سے نہ تو اپنے کو کم سمجھتے تھے اور نہ مرعوب ہوتے تھے، یہی وجہ ہے کہ امتحانات میں ہمیشہ اچھے نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے، ہمارے تمام ساتھیوں میں مولانا ممدوح کی مار سے کوئی بھی نہیں بچا، الا مولانا محمد اسرافیل شاہ مرحوم، محمد اسرافیل شاہ مرحوم کو آپ نے کبھی نہیں مارا، لیکن لفظی مار انہیں کافی پڑی، آپ صرف یہ کہتے تھے کہ ان کو کیا ماریں؟ اپنی قوم فقیر میں سرخروئی حاصل کرنے اور مرغ کی ٹانگ توڑنے کے لائق تعلیم انہوں نے حاصل کر لی ہے، یہ زیادہ عمر دراز ہیں، اسلئے انہیں مارنا ٹھیک نہیں۔

آپ کا خوف طالب علمی کے زمانہ میں ہم طالب علموں پر اتنا تھا کہ اکثر وبیشتر آمنے سامنے ہونے سے گریز کرتے تھے، تعلیم پوری کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے مدرسہ رحمانیہ ہی میں پڑھانے کا موقعہ ملا، مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا، مگر ہمت نہیں ہوئی، اور میں ٹیبل یا بینچ پر بیٹھا، مگر بعد میں یہ ساری بندشیں ٹوٹ گئیں، اور سارا ڈر اور خوف جاتا رہا۔

شام کو حاجی عبدالرؤف صاحب مرحوم کے بیٹا اور پوتا زخمی اور مطیع الرحمٰن کے پڑھانے پر مامور تھا، تو کبھی کبھی حضرت استاذ محترم بغل میں بیٹھ جاتے، میں پڑھاتا رہتا اور حضرت سنتے رہتے، اور کچھ نہ بولتے، مگر بعد میں کسی دوسری جگہ غائبانہ میری علمی صلاحیت کی خوب خوب تعریف کرتے، غرض کہ آپ علم دوست اور اہل علم کے قدردان تھے، اور چاہتے تھے کہ بچے خوب پڑھیں لکھیں، اور نام پیدا کریں، اسی لئے طالب علمی کے زمانہ کی مار اور سخت گیری میں غالباً یہی مصلحت پنہاں تھی، کاش میں مدرسہ رحمانیہ میں دینی کتب پڑھاتا رہتا! مگر کچھ ہی دنوں کے بعد میں ہائی اسکول کوئلکھ میں ملازم ہو گیا، اور مدرسہ رحمانیہ چھوڑنا پڑا، اسکول کی ملازمت کے بعد کالج کی ملازمت سے منسلک ہو گیا، اور مدرسہ رحمانیہ سے قریب رہتے ہوئے بھی دور ہوتا چلا گیا۔

میرے زمانہ طالب علمی میں مدرسہ رحمانیہ دو کھپر پوش عمارت اور ایک پھونس کے مکان پر مشتمل جامع مسجد کے بغل میں سڑک کے پورب اور پچھم واقع تھا، حضرت مولانا دامت برکاتہم کے علاوہ جن اساتذہ سے میں نے تعلیم حاصل کی ان میں چند کے نام کچھ اسطرح یاد آتے ہیں:

حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب، مولانا محبّ رسول صاحب، سوپول کے علاقہ کے ایک ماسٹر صاحب جن کا نام اب یاد نہیں رہا، اور ماسٹر محمد قاسم صاحب وغیرہم، جہاں تک ان اساتذہ کے تعارف کا سوال ہے تو مولانا ممتاز صاحب یکہتہ کے رہنے والے ہیں، دیگر اساتذہ چونکہ وقفہ وقفہ سے آتے جاتے رہے اسلئے صحیح طور پر کماحقہ سکونت بتلانے سے قاصر ہوں، مولانا عبدالوہاب صاحب غالباً مظفرپور کے تھے، اور مولانا محبّ رسول یہاں کے بعد

مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ میں صدر مدرس ہوئے، وہ غالباً دربھنگہ ہی کے تھے، سوپول کے ایک ماسٹر صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں، البتہ کچھ دنوں کے بعد دوسرے ماسٹر محمد قاسم صاحب بحثیت ماسٹر ہم لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، جو آج کل تصوف کے میدان کے ایک برگزیدہ شخصیت مانے جاتے ہیں، تمام اساتذہ کے پڑھانے کا انداز مختلف اور متفرق تھا، اور تمام طلباء سے ان حضرات اساتذہ کو کافی انسیت تھی۔

اساتذہ کے ساتھ مولانا موصوف کا تعلق کے بارے میں محض اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری طالب علمی کے زمانہ میں متعدد اساتذہ آئے اور گئے، کوئی بھی جم کر نہیں رہ سکے، اس کی وجہ ممکن ہے کہ حضرت مولانا کے اصول وضوابط کی پابندی اور نظام الاوقات کی سختی اور مولانا کی نوجوانی کی مزاجی گرمی، سختی وکرختگی کو بیرونی اساتذہ برداشت نہ کر سکے ہوں، اور راہ گزیر اختیار کرتے ہوں، یا پھر دوسرے اسباب ہوں، ہم طالب علموں کو اتنی فرصت کہاں تھی جو ان باتوں پر دھیان دیتے، طلبہ کی تعلیم وتربیت میں مولانا ہمیشہ کوشاں رہتے، مدرسہ رحمانیہ کی ترقی وترویج اشاعت میں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، انہوں نے ایک چھوٹے سے مدرسہ کو بام عروج تک پہونچایا، مولانا ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ سرزمین یکہتہ کے طلبہ وطالبات تعلیمی میدان میں اسی طرح آگے بڑھیں جس طرح بیرونی لڑکے، ان کی یہ شکایت رہتی تھی کہ بیرونی طلبہ یہاں آکر پڑھ لکھ کر نکلتے ہیں مگر مقامی لڑکے محنت سے گریز کرتے ہیں، تاہم یہ مولانا ہی کی کوشش وسعی کا ثمرہ ہے کہ حکیم محمد خورشید، مولوی نوراللہ، مولوی محبّ الحسن، مولوی وجیہ الحسن، منت اللہ وغیرہم اور اس وقت کے دیگر طلبہ جن کے نام میرے ذہن میں اب محفوظ نہیں رہے، وہ سب تعلیم سے بہرور ہو کر آگے کی تعلیم جاری رکھی، اور امروز مختلف جگہوں اور عہدوں پر مامور ہو کر اپنے فرائض منصبی کو ادا کر رہے ہیں۔

ایک ممتاز ہستی کی کہانی، یادوں کی زبانی

محمد شفیع الرحمٰن شفیع

(ایم.اے.اے. سینیر سکنڈری اسکول، پٹنہ سیٹی)

ریاست بہار کا وہ شمالی خطہ جو اپنی سرسبزی وشادابی کے سبب ہمیشہ پر بہار رہتا ہے، اور متھلانچل کے نام سے چمکتا اور دمکتا ہے، وہ نیپال کی سرحد سے بھی وابستہ ہے، یہاں میتھلی زبان، دہی چوڑے کی دکان، کیلی، بیڑی، پان، کھیتوں میں گیہوں یا دھان، مکئی کی رکھوالی کے لیے مچان، تالابوں میں دوشیزاؤں اور ہر عمر کی صنف نازک کا وقت فجر اشنان، مویشیوں کے لیے گھروں سے متصل یا باہر بتھان، بانس اور پھوس کے مکانوں کی اپنی انوکھی شان ہے۔ مندروں میں سنکھ کا ہیجان، مسجدوں میں اذان، دلوں میں قربت کے امکان کی پہچان ہیں۔ تیوہاروں، بازاروں اور سبزہ زاروں میں اشتراک، ہمہ آہنگوں میں ہم آہنگی، ہمہ رنگوں میں ہم رنگی کے سبب ایک دوسرے سے بے باک، لوگوں کے لیے دھان اور گیہوں کی بالیاں، فصلوں کی ہریالیاں، جھروکوں اور دروازوں پر جالیاں، کھانے پینے کے لیے گوناگوں قسموں کی تھالیاں، ندیوں کے نام پر برسات کی سیلابی نالیاں، آم کے پیڑوں کی ڈالیاں، مکئی یا دوسری فصلوں کے کھیتوں کی بے جان مجسموں کے ذریعہ رکھوالیاں، اکثر گھروں میں نہ تالے نہ تالیاں، بدلتے عالمی مناظر سے لاابالیاں اور طرح طرح کی بدحالیاں بھی بہ شکل خوش حالیاں ہیں۔

اس کہانی کے مناظر مدھوبنی ضلع کے تین بلاکوں میں سے صرف ان علاقوں میں محدود ہیں جہاں برسات کے موسم میں اکثر آفات اور کبھی کبھی سوغات لانے والے دو دریا، کملا بلان

اور بھتی بلان لوگوں کو محصور کرنے کے باجود ہر سال انھیں مقہور و مجبور بناتے آرہے ہیں، کہانی کے آغاز سے آج تک تقریباً نصف صدی کی طویل مدت ہے، جس میں جغرافیائی تغیرات کی حیرت، معاشراتی تبدلات کی بوالعجبیت، انسانی اقدار میں گرمجوشی کی جگہ سردمہری کی مداخلت، رشتہ داروں، دوستوں، شناساؤں کے خون میں حرارت کی جگہ برف جیسی برودت، سہولتوں کی کثرت میں یگانگت کی قلت اور روحانی عظمت وعزت کی جگہ نفسانی قعرِ مذلت کی طرف زوال کی راہ میں لے جانے والی شدت بھی ہے۔

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی بات ہے، میں گرمی کی فرصت میں اپنے گاؤں میں تھا۔ عمر دس سال کے آس پاس۔ معلوم ہوا کہ مغربی محلے کی مسجد میں مغربی بنگال سے تبلیغی جماعت آئی ہے۔ پہلے پہل تبلیغی جماعت کا نام سنا اور بنگالیوں کو دیکھنے کے شوق میں بزرگوں سے قبل وہاں جا پہنچا اور مغرب کی نماز میں شریک ہوگیا۔ بنگالی عالم 'نعمت' کا تلفظ 'نیامت' کر رہے تھے، مگر ان کی تقریر کا مجھ پر وہ اثر ہوا کہ صبح سویرے ایک ہفتہ کے لیے اس جماعت میں نکل پڑا۔ کچھ لوگ آس پاس کے گاؤں کے بھی تھے۔ میں نے یقین کرنے میں کسی طرح کے شک کو دل میں گھسنے نہیں دیا کہ اب میرے لیے تبلیغی جماعت میں شرکت ہی جنت کی ضمانت ہے اور میں اللہ تعالی کے مخصوص بندوں میں شامل ہو چکا ہوں۔

چند گاؤں، قصبوں اور بازاروں ہوتا ہوا اپنے علاقے کے اس قصبے میں داخل ہوا جہاں سانس روکنے اور جذبات پر قابو پانے کی ضرورت پڑی۔ اس قصبے کا صرف ایک ہاتھ ہے۔ وجہ تسمیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی زمانے میں تمام لوگوں نے صرف ایک ہاتھ پر بیعت کی ہو۔ فارسی اور اردو/ ہندی کی آمیزش سے اسی معنی میں اس قصبے کا نام ہے، اگرچہ انگریزی زبان اپنی نالائقی کے ثبوت میں یہاں بھی 'ک' کو 'کھ' میں بدلنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔

اس جماعت میں نکلنا جہاد تھا اور جہاد کا ثواب ملنا تھا۔ میں بھی ننھے منے مقرر کی حیثیت سے تقریر کرنے لگا اور لوگوں کو جہاد میں شرکت کی ترغیب بزرگوں کی طرح دینے لگا۔ ایک اجتماع میں اس قصبے کے سب سے بڑے مولانا کی شرکت ہوئی۔ میں بالکل خائف نہ ہوا اور

تذبذب سے پاک تقریر کرڈالی۔ مولانا خوش ہوئے اور دعائیں دے کر مطمئن کر دیا۔ ان کو چاہیے تھا کہ انعام کے طور پر چند روپیوں سے نوازتے، مگر علماء ایسا کسی مصلحت کی بنا پر کرنا پسند نہیں کرتے ہوں گے۔ میری مدت جہاد اس قصبے سے نکلتے ہی پوری ہوگئی اور اپنے گاؤں لے جانے والے راستے کے قریب آکر تمام جہادیوں سے رخصت مانگی اور گھر پہنچ گیا۔

ایک سال بعد میں ایک بازار کے مدرسے میں طالب علم کی حیثیت سے اپنا دوسرا سال مکمل کر چکا تھا، جس میں ایک چوتھائی معلم اور تین چوتھائی طالب علم کی حیثیت تھی۔ صاحبِ مدرسہ کے منجھلے بیٹے ہم جماعت سے زیادہ جگری دوست بن چکے تھے، اس لیے گھر کے تمام لوگ مجھے اس گھر میں اور اپنے اپنے دل میں بھی جگہ دینے لگے۔ جماعت اسلامی کا ایک چھوٹا سا وفد ضلعی دفتر سے آیا۔ اعلان ہوا کہ وفد اب ایک ہاتھ والے قصبے کی طرف کوچ کرے گا۔ صاحب مدرسہ (عبدالحیٔ پیامیؔ) نے وفد میں اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانے کی خوش خبری سنادی۔ بیل گاڑی سے چند گھنٹوں کے سفر میں ان بزرگوں کی گفتگو سے جس قدر سمجھ سکا وہ بڑی کارآمد باتیں تھیں۔ صرف علمی گفتگو ہوتی رہی۔ واپسی میں بڑے مولانا بھی شریک رہے اور معلوم ہوا کہ B.O.L کی ڈگری بھی مولانا کے پاس ہے یا آنے ہی والی ہے۔ یہ ڈگری میرے ذہن ودماغ پر مولانا کے رعب کا بھوت بن کر کئی برسوں تک سوار رہی۔

ایک سال اور بیت گیا۔ میں اب اس بازار والے مدرسے کی آخری جماعت میں بھی اول آچکا تھا اور اب کسی دوسری جگہ جانے کی مجبوری سامنے آکھڑی ہوئی۔ کسی بڑی درسگاہ میں جانے کا نہ تو راستہ معلوم تھا اور نہ معاشی استطاعت تھی۔ مہتمم مدرسہ ایک حافظ وشاعر مدرس (جناب معین عاجزؔ) تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ ایک اچھی جگہ تجھے بھیج دوں گا، جہاں اگر محنت سے علم حاصل کروگے تو بڑی اچھی تعلیم پاؤگے۔ یقین کرنا ہی تھا۔ اس زمانے میں استاد یا استاد جیسے کسی بزرگ کی بات پر شک کرنا گناہ کا ارتکاب تھا۔ مدرسہ بند ہوگیا۔ رمضان آگیا۔ میں وہیں حسب سابق مقیم رہا۔ ایک رات مسجد میں سب سے بڑے مولانا موصوف کو دیکھا۔ سلام کیا اور جواب پر آسودہ ہوگیا۔ تراویح کے بعد شاعر مدرس نے مجھے طلب کیا۔ اساتذہ والے

کمرے کی طرف جاتے ہوئے ہوئے دل میں عجب خدشات وارد ہو رہے تھے۔تبلیغی جماعت کا ثواب تو مرنے کے بعد ملے گا۔ رمضان میں ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا جس سے کسی انعام کی توقع ہو۔روزے رکھے ہیں اور کبھی کوئی ایسی شرارت نہیں کی کہ سزا واجب ہو جائے۔تراویح کے بعد سونے کے وقت آخر کس لیے طلب کیا گیا ہے! کوئی وجہ سمجھ سے باہر رہی اور میں کمرے میں ادب سے داخل ہو گیا۔سلام کیا اور حکم پا کر ایک گوشے میں دوزانو بیٹھ گیا۔مولانا موصوف جلوہ افروز تھے۔شاعر و حافظ مدرس نے فرمایا: یہی وہ طالب علم ہے، مولانا نے جواباً فرمایا: میں اس کی تقریر سن چکا ہوں۔شوال میں بھیج دیجیے۔ان شاء اللہ تعالی داخلہ اور طعام و قیام کا نظم ہو جائے گا۔آپ تھے، اور ہیں ماشاءاللہ! اور بہت دنوں تک ان شاء اللہ! رہیں گے حضرت مولانا محمد ممتاز علی المظاہری مدظلہ العالی!

میرا ایک ساتھی صاحب اولاد تھا۔بازار والے مدرسے میں اسے بھائی صاحب کہنا لازمی بنا دیا گیا تھا، وہ کسی دن آ دھمکا اور بولا کہ میں بھی تمھارے ساتھ وہاں پڑھنے جاؤں گا۔ سب کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے اور ساتھی کے ساتھ ہمدردی نہیں تو ساتھ کیسا! شوال میں ہم دونوں مولانا کے گھر دوپہر میں پہنچ کر درویش ہو گئے۔خود نہیں تھے، مگر نہایت ہی شفیق بزرگ نے ہمیں شیریں آواز میں باہر والے کمرے کے اندر آنے کی اجازت دی۔سلام کا جواب دیا اور بتایا کہ مولانا کہیں باہر گئے ہیں۔دو تین دنوں کے بعد آوَ گے تو ملاقات ہو جائے گی۔اس کے بعد ہم لوگ مایوس واپسی پر آمادہ ہوئے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: تم لوگ ہمارے مہمان ہو اور آج تو تم لوگوں کی میزبانی مفت میرے ہاتھ آئی ہے۔کھانے کے بعد جانے کی سوچو گے۔ایک گھنٹے کے بعد اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ایک کشادہ دروازے تک گلیوں کی راہ لے گئے۔وہاں جم غفیر تھی۔ایک دالان میں سب کے ساتھ صف میں بیٹھ گئے۔ بھوج تھا۔(اس دروازہ کے کئی مالکوں میں سے ایک کا بیٹا بعد میں مدرسہ رحمانیہ کا سکریٹری بھی ہوا)۔خوب کھایا اور واپس ہو گئے۔

دو تین دنوں بعد پھر ہم لوگ حاضر ہوئے۔اس بار سیدھے مدرسے میں مولانا سے ملنے

کی جرأت جٹائی۔یہی وہ مدرسہ رحمانیہ ہے جس کا پتا اس وقت مقام و پوسٹ یکہتہ براہ پھلپراس، ضلع دربھنگہ تھا۔اب براہ کی جگہ کھٹونا اور ضلع کی جگہ مدھوبنی ہے۔ہانپتے کانپتے دلوں کے ساتھ ہماری پیشی مولانا کی خدمت میں ہوئی۔مولانا نے فوراً سوال کا بوجھ سر پر ڈال دیا: ایک کی جگہ دو کیسے ہو گئے؟ میں نے تو تمھارے بارے میں وعدہ کیا تھا۔المؤمن اذا وعد وفـــی۔ میں اپنا وعدہ پورا کروں گا، مگر اس دوسرے مرد کے لیے گنجائش نہیں ہے۔مولانا نے میرے دل کے ٹوٹنے کی آواز اونچا سننے کے باوجود سن لی۔میں نے عرض کی: یہ بہت نادار پسر ہیں اور تعلیم کا بے حد شوق ہے۔دیر سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا، اس لیے عمر زیادہ ہے۔ انھوں نے فرمایا: متبادل صورت تھی۔ایک مسجد میں موذن کی ذمہ داری نبھانے پر محلے والوں کی جانب سے طعام کا نظم ہو سکتا ہے۔قیام مدرسے کے دارالاقامہ میں ہو جائے گا، مگر دقت یہ ہے کہ گھر گھر خود جا کر اپنی دعوت کی خبر دینی ہے اور اندر جا کر کھانا کھانا ہے۔اس مرد کو اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی ہے۔میں نے عرض کی: مجھے اس کی جگہ بھیج دیجیے اور میری جگہ اسے دے دیجیے۔مولانا نے پھر دعائیں دیں اور خوش نظر آئے۔

تھوڑی دیر بعد داخلے کی رسم پوری ہوئی۔جس مولانا کی کہانی یادوں کی زبانی سنانے نہیں لکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اب وہ باقاعدہ محترم استاد، معلم، مدرس، آخوند و اتالیق بن گئے۔ روزانہ درس، تفاعل، ملاقات اور بار بار نئے تجربات، تجدید تجربات، تکرار تجربات کی روشنی میں منتج جذبات کی داستان کا بھرپور زمانہ پانچ چھ سال کے لیے ملا اور وقتاً فوقتاً آج تک جاری ہے۔

وسطانیہ سوم کی درسی کتابیں دیکھتے ہی دن میں تارے نظر آنے لگے۔میں عربی کے نام پر صرف منہاج العربیہ اول تا سوم، عربی کا معلم اول و دوم اور فارسی کے نام پر اس کی پہلی، دوسری کے اولین ابواب، گلستاں سے باب ہشتم اول باب اول و دوم، بوستاں سے صرف ابتدائی اوراق کا درس یافتہ تھا۔یہاں تیسواں پارۂ قرآن شریف مکمل کا ترجمہ وتفسیر، فقہ میں نور الایضاح (مکمل کتاب عربی میں) کتاب النحو (مکمل کتاب عربی میں) عربی زبان وادب کی کتابوں کے علاوہ۔فارسی میں اخلاق محسنی جیسی کتابوں کا بار گراں کمزور کاندھوں پر آ گیا۔اردو

میں البتہ 'شکوہ جواب شکوہ' کو حسب ذوق قرار دیا جا سکتا تھا۔ تمام مضامین کے لیے الگ الگ مولانا کے حجرۂ درس میں جانا اور خالی گھنٹی میں برآمدے پر اگلے درس کی تیاری یا پچھلے درس کے تکرار میں گزارنا تھا۔ حضرت مولانا کے یہاں ترجمتین کی گھنٹی تھی۔ خیریت کی بات یہی تھی کہ یہ پرچہ عربی کا معلم حل کر لینے کی وجہ سے زیادہ دشوار کن نہیں تھا۔ حضرت کی نظر میں ذلت سے بچنے کا سامان تو قدرت کی طرف سے ہو چکا تھا، البتہ باقی مضامین کے لیے چھوٹے چھوٹے مولانا حضرات سے توقع تھی کہ وہ میری خامیوں سے فوراً واقف نہیں ہو پائیں گے اور دھیرے دھیرے میں محنت کر کے اپنے عیوب چھپانے میں جلد کامیاب ہو جاؤں گا۔

آخر حضرت مولانا موصوف کے درس میں شامل ہونے کا دن بھی آ ہی گیا۔ ایک ایک کر کے وہ سب سے پہلے زبانی اور پھر باضابطہ تحریری ترجمہ کراتے تھے۔ مجھ سے سوال کیا گیا۔ میں جواب جانتا تھا، مگر غیر معمولی تاخیر ہوگئی اور حضرت کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب پانچ ہاتھ والی چھڑی پر ان کا دایاں ہاتھ جانے ہی والا تھا۔ شاید انھوں نے میرے لبوں کی جنبش میں چھپی سچائی کو صاف صاف پڑھ لیا تھا اور اسی وجہ سے ہاتھ چھڑی پر جا کر بھی بے حرکت ہوگئی۔ میں نے بھی اتنے میں جواب دے دیا، مگر اس وقت تک میری باری ختم ہو چکی تھی۔ حضرت کے چہرے سے غضب کی لکیریں ماند پڑنے لگیں اور شفقت کے خطوط ابھرنے لگے۔ انھوں نے فرمایا: روزانہ فجر کی نماز کے بعد قرآن شریف تلاوت کیا کرو اور چالیس بار " رب اشرح لی صدری و یسر لی امری واحلل عقدةً من لسانی " پڑھ لیا کرو۔ ان شاءاللہ تعالیٰ! یہ لکنت دور ہو جائے گی۔ میں نے ایسا ہی کیا اور ان کو پہنچا ہوا ولی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا، کیوں کہ چند دنوں کے بعد جو لکنت غائب ہوئی وہ آج تک لوٹ کر نہیں آئی۔ اگر سالانہ امتحان تک باقی رہ جاتی تو شاید میں بورڈ امتحان کے لیے سینٹ اپ ہونے سے بھی محروم ہو جاتا۔

ششماہی امتحان ہوا اور میں اپنی جماعت میں ہمیشہ کی طرح یہاں بھی پہلی بار اول آیا۔ اساتذہ کی نظر میں مقبول، ساتھیوں کی نگاہوں میں مخدوم، پورے مدرسے میں منظور اور قصبے میں مشہور ہو گیا۔ حضرت مولانا کی مستور نگاہوں نے مجھے محصور رکھا ورنہ میں خود اپنی نگاہوں

میں مغرور ہو جاتا۔ مجھے حضرت میں ولی نظر آتا جب کہ باقی طلبہ ان کو جن، بھوت، دیو، آندھی، طوفان یا قہر الٰہی سمجھا کرتے تھے۔ میں مؤذن ہونے کے سبب اللہ ﷻ سے اپنے آپ کو زیادہ قریب پانے لگا اور سہولتیں میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگیں۔

ایک دن ظہر کی اذاں سے پہلے مسجد کے پہلو والے مکان کے پہلو میں کھانا کھانے گیا۔ صبح میں جب اپنی دعوت پر رضا مندی حاصل کرنے گیا تو اس گھر کی بزرگ خاتون نے حقارت آمیز گفتگو کی تھی اور بادل نخواستہ میزبانی قبول کی تھی۔ بہر حال کھانے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی قربت تو کام آتی نہیں، اس لیے کھانے تو چلا گیا، مگر خود اپنی نگاہوں میں زمین میں گڑتا ہوا جا رہا تھا۔ احساس ہو رہا تھا کہ سب کو اس واردات کی خبر ہے اور کوئی قہقہہ لگا کر مجھے یاد نہ دلا دے کہ کہاں جا رہے ہو؟ اگر ایسا ہوتا تو میں یقیناً زمین سے کہتا: پھٹ جا تا کہ میں تجھ میں سما جاؤں۔ مگر کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ مسجد واپس آیا۔ ظہر وعصر کے اوقات کے لیے میں نے مسجد کے صحن میں نشان لگا دیے تھے اور سائے کی مدد سے بالکل وقت پر میری اذاں ہوا کرتی تھی۔ ظہر کی اذان دی اور اذاں کی دعا کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مخاطب کیا اور کہا: آج جو ذلت ہوئی ہے اس سے مجھے نجات چاہیے۔ پھر نماز ہوئی اور میں مدرسے آ گیا۔ درس میں تمام باتیں بھول گیا۔ فرصت ہوتے ہی عصر کی اذان کا خیال آیا اور ساتھ ہی وہ پوری داستان دماغ میں گونجنے لگی۔ میں نے یقین کر لیا تھا کہ خدا ضرور میری بات سنے گا، مگر اس قدر جلد سنے گا، اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ جیسے ہی میں مسجد کی طرف بڑھنے کے لیے آمادہ ہوا تھا کہ معنوی طور پر مدرسے کے مہتمم، ایک چھوٹے مولانا جناب محبّ الحسن صاحب نے مجھے بلا لیا۔ فرمایا: اب تم مسجد میں اذان نہیں دیا کرو گے۔ تم سے بورڈ امتحان میں اچھے نتائج کی امید ہے۔ اس لیے آج سے مدرسے کے دار الاقامہ میں تمھارا قیام رہے گا۔ محنت سے تیاری کرو اور ہم لوگوں کی امید پر کھرا اترنے کی کوشش میں لگ جاؤ۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور آج بھی جب وہ واقعہ یاد آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے میری وہ قربت کہاں کھو گئی! آج اتنی دوری کیوں ہو گئی کہ کوئی دعا اس طرح قبول نہیں

ہوتی؟ جواب بھی میں خود جانتا ہوں۔ان دنوں گناہوں سے دور تھا اور آج گناہوں کے سوا کوئی نیکی کہاں ہو پاتی ہے!

ظاہر ہے یہ حضرت مولانا کے حکم سے ہی ہوا ہوگا۔امتحان کے دن آ گئے۔ مدھوبنی کے واٹسن ہائی اسکول میں پورے سب ڈویژن کے طلبہ کا مرکز تھا،مگر صرف دو ہال میں تمام طلبہ سما جاتے تھے۔اسکول کے دو مولوی نما حضرات گارڈنگ میں آتے تھے۔ شناخت کرانے وہی مولانا محبّ الحسن صاحب تشریف لائے تھے۔ پہلے دن کے امتحان کے بعد مولانا نے فرمایا کہ دو دو روپے ہر ایک طالب علم کو دینا ہے۔ یہ پیسہ گارڈنگ کرنے والوں کو دیا جائے گا۔وہ بڑی سہولت دیں گے اور خود بھی جواب بتا دیں گے۔سب لڑکے بہت خوش ہوئے اور دو دو روپے پیش کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔انجام سے مجھے آگاہ کرایا گیا۔ابھی اللہ تعالی سے میری قربت باقی تھی۔ میں نے چیلینج قبول کیا۔دوسرے دن گارڈنگ کرنے والے ایک حضرت میرے سامنے کرسی پر جم گئے۔جب تھک جاتے تو تھوڑی دیر گھوم پھر لیتے۔وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی موقع ملے اور مجھے اکسپیل کر دیں۔آدھے سے زیادہ پرچے گذر گئے۔ایک دن انھوں نے مجھے بڑی شفقت سے کہا: مان گیا کہ تمھاری تیاری بڑی اچھی ہے۔پھر بھی یہ امتحان ہے۔اگر کوئی دقت ہو تو مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔میں نے جواب دیا: اللہ تعالی سے پوچھ لیتا ہوں۔آپ سے پوچھوں گا تو وہ خفا ہو جائے گا۔موصوف جھنجھلا گئے۔آخری دن خاص طور سے ملے اور شاباشی کے ساتھ بہت ساری دعائیں دیں۔

یہ واقعہ ہماری واپسی سے قبل قصبے میں مشہور ہو چکا تھا۔چند دنوں کے بعد فرصت گزارنے گھر آ گیا۔چند ماہ بعد میں قریب کے ایک بازار کچھ سامان لانے اور کچھ تفریح کی غرض سے گیا۔ایک بزرگ دو غیر مسلم کے ساتھ میرے پاس آئے اور ایک زبان ہو کر کہا: مبارک ہو! میں نے کہا: میں سمجھا نہیں۔انھوں نے کہا: امتحان کے نتائج شائع ہو چکے ہیں۔تم فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہو چکے ہو۔آؤ تمھیں ہم لوگ مٹھائی کھلاتے ہیں۔ایک ہفتہ پہلے ہی نتیجہ اخبار میں شائع ہوا تھا اور تمھارا نام فرسٹ ڈویژن میں دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی تھی۔

میں دوڑا ہوا گھر واپس آیا۔والدہ محترمہ (اللہ تعالی انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے!) کو خوش خبری دی۔ایک پاؤ چینی دکان سے خریدی اور محلے کے تمام لوگوں میں مٹھائی کے نام پر تقسیم کر دی۔

دوسرے دن مدرسے آیا۔گاؤں میں داخل ہوتے ہی گلیوں میں ہر طرف سے مبارکباد کی بھلی آواز سنتا ہوا مدرسہ پہنچ گیا۔اساتذہ اور طلبہ سے ملاقات ہوئی۔سب کی طرف سے والہانہ مبارک باد کے تحفوں سے میں بہت امیر بن گیا۔ایک ماہ بعد معلوم ہوا کہ پوری ریاست میں میری چوتھی پوزیشن تھی۔قصبے کی زبان میں میں اسٹوڈ ہوا تھا۔حضرت مولانا نے مدرسے کے تمام طلبہ سے اس کا ذکر کیا اور سب کو میری تقلید کی تلقین کرتے رہے۔بار بار وہ اس واقعہ کو دہراتے اور آج بھی وہ اس واقعے کا ذکر موقع نکال کر کرتے ہیں۔

تب سے آج تک میں نے جو محسوس کیا ہے وہ ایک ارتقائی عروج ہے۔پہلے میں ان کی پاک نگاہوں میں ایک عام طالب علم سے اوپر آ کر ان کا خاص طالب علم بن گیا تھا۔پھر میں ان کا شاگرد عزیز بنا۔اس کے بعد وہ مواقع بھی آئے کہ میں اور اوپر آ کر ان کا شاگرد رشید بن گیا۔اب تو مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے جب ان کے سلوک سے مجھے لگتا ہے کہ میں سب سے اوپر آ کر ان کا شاگرد محترم بن چکا ہوں۔میں ان کو برجستہ مشورے بھی دیتا ہوں اور اپنے یار غار، حضرت مولانا کے بڑے صاحب زادے، مولانا محمد مختار علی سلمہ! کے جذبات میں شریک ہو کر ان کو بار بار سفر پر نکلنے سے سختی سے منع کرنے میں بھی دریغ محسوس نہیں کرتا ہوں۔مولانا تبسم زیر لب ہاں، ہوں کر کے رہ جاتے ہیں۔

مدرسہ پھر سے شروع ہوا۔اب میں وسط سے فوق میں آ گیا۔ایک دانا بزرگ نے حضرت مولانا کی موجودگی میں پیش کش کی کہ میں مغرب کے بعد عشا تک ان کے گھر جا کر ان کے بچوں کو پڑھا دیا کروں اور اس کے عوض ان کے گھر تینوں شام کھانا کھا لیا کروں۔حضرت نے بھی اشارہ فرمایا۔مجھے خوشی ہوئی کہ زیر تعلیم رہ کر خود کفیل بننے کی عمدہ صورت نکل آئی ہے۔ اللہ تعالی کا شکر ادا کیا اور نیا مشغلہ شروع ہو گیا۔پیش کش کرنے والے مرحوم محمود عالم، انچل مٹو

کے عرف سے مشہور تھے۔ بڑے خوش وضع اور خوش پوشاک تھے۔ ملنے ملانے والے بھی تھے اور سیاست کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے، سیاسی عہدوں سے دور رہتے، مگر ہم نواؤں کی تائید و نصرت میں دریغ نہیں کرتے۔ کھانے کھلانے کا بھی عمدہ ذوق تھا۔ ان کی شریک حیات ماں کی صفات سے بھرپور تھیں۔ اپنے بچوں کے استاد کا مجھے درجہ دیتیں، لیکن شفقت دکھانے میں ماں کا کردار زیادہ ادا کرتیں۔ اکثر خود بیٹھ کر کھانا کھلاتیں۔ مشغولیت کے وقت میرے شاگردوں میں سے کسی ایک کو یہ خدمت سپرد کی جاتی۔

مدرسے میں روایتی طرز تعلیم کا رواج تھا۔ کسی مدرس کی کوئی تربیت نہ کبھی ہوتی تھی نہ اس کا کوئی تصور تھا۔ انتظامیہ کو بھی اس کا کوئی احساس نہیں تھا کہ بہتر تعلیم و تدریس کے لیے اگر باضابطہ تربیت نہ تو کم از کم خود اساتذہ آپس میں ہفتہ وار/ ماہوار/ سہ ماہی/ ششماہی/ سالانہ کسی طرح کا تدریسی مذاکرہ و محاضرہ منعقد کریں اور اپنے تجربات کی بنا پر اپنے ادارے کے لیے عمدہ طرز تعلیم و تدریس کی صورتیں نکالیں۔ افسوس کا مقام اس وقت بھی تھا اور آج بھی کہ ہر مدرس کا اپنا اپنا طریقۂ تعلیم تھا۔ جس میں جو نقص تھا وہ باقی رہتا اور اصلاح کی کوئی صورت کبھی نہیں نکل پاتی۔ ہر مدرس اس طرح اپنے غلط طریقۂ تدریس کو درست سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا رہا کرتا ہے۔

بہرحال! انتظامیہ کی طرف سے نگرانی کا طریقہ مستحسن تھا۔ پتا نہیں آج وہ طریقہ رائج ہے یا ختم ہو گیا۔ مغرب بعد دارالاقامہ میں مقیم طلبہ کے علاوہ اونچی جماعتوں کے طلبہ قصبہ سے بھی آ جایا کرتے تھے۔ ہر ماہ ایک مدرس کی نگرانی ہوتی تھی۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد سے عشا کی اذان کے وقت تک اس پر نظر رکھتے تھے کہ تمام طلبہ آموختہ، تکرار یا اگلے درس کی تیاری میں مشغول رہیں۔ اگر کہیں کوئی نزاع در آئے تو منصف کا کام بھی انجام دیں۔ یہ طریقہ یقیناً حضرت مولانا نے نافذ کیا تھا اور خود ان کی بھی باری آتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کی باری برسات کے ایسے موسم میں آئی تھی جب کھیتی کا کام بڑے زور و شور سے چل رہا تھا۔ حضرت کے آنے میں دیر ہو گئی۔ طلبہ نے سمجھ لیا کہ اب تشریف نہیں لائیں گے۔ غافل ہو گئے یا ادھر ادھر گشت

کرنے لگے۔ اندھیری رات میں پھسلنے والی راہوں سے ہوتے ہوئے ایک لاٹھی کے سہارے آدھمکے۔ نل پر جا کر پاؤں دھوئے اور اندھیرے ہی میں دارالاقاموں کے برآمدوں کا جائزہ لے لیا۔ انتشار اور افراتفری دیکھتے ہی پارا چڑھا۔ اندھا دھند لاٹھی بھانجنا شروع کیا۔ کوئی زمین پر گرا، کوئی رو رو کر فریاد میں مشغول ہوا، کوئی چالاکی دکھاتے ہوئے نظر سے اوجھل ہوا اور تیزی سے مدرسے سے باہر ہوا۔ اس کے بعد سر پر پاؤں رکھا اور نو دو گیارہ ہو گیا۔ حضرت کو پتہ بھی نہیں چلا۔ ایک دن کی سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک ان کی باری رہی کسی نے کوئی غفلت نہیں برتی، کیوں کہ یقین ہو گیا تھا کہ گھات لگا کر آ جائیں گے اور ان کے مقابلے میں ملک الموت سے تو تھوڑی مہلت مل سکتی ہے، مگر حضرت تو سانس لینے کا بھی موقع نہیں دیتے، چہ جائے کہ کسی کو صفائی پیش کرنے کی مہلت دیں۔

خواہ مخواہ پھر اپنی تعریف کا ایک موقع آ گیا۔ میں تو مغرب سے عشا تک خود دوسری جگہ استاد کے فرائض میں مشغول رہا کرتا تھا، مگر چند ماہ مدرسے میں قیام کی مدت رہی۔ مجھے بھی مغرب تا عشا درس کی تیاری میں برآمدے پر اپنے ساتھیوں کے درمیان موجود رہنا تھا۔ میں تکرار کے مشہور تھا اور میرے تمام ساتھی سعادت مند شاگرد کی طرح میرے گرد جمع ہوتے۔ بڑا لطف آتا تھا۔ نچلی جماعتوں کے طلبہ بھی اپنے مسائل حل کراتے اور اس کام میں ایک گونہ اطمینان حاصل ہوتا۔ عزت تو ہاتھ آتی ہی تھی۔ خدا خدا کر کے مولانا محبّ الحسن صاحب کی باری آ گئی۔ میں ان سے بے تکلف تھا۔ میری سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ درس میں ہی سبق یاد ہو جاتا تھا۔ مغرب بعد اسے دہرانا ایک فعل عبث معلوم ہوتا تھا۔ اگر تکرار کی نوبت ختم ہو گئی تو میں اونگھنے لگتا تھا یا بیٹھے بیٹھے سو جاتا تھا۔ مولانا نے مجھے اسی حال میں پکڑ لیا۔ پہلے تو تلقین کی اس کے بعد طنز بھی کیا۔ میں نے کہا کہ جس مقصد کے لیے اس وقت مطالعہ ضروری ہے وہ میں انجام دے چکا ہوں۔ آپ مجھے کل اپنی جماعت میں پڑھاتے وقت آزما لیجیے گا۔ اگر غلطی ہو گی تو جو سزا چاہیے گا دیجیے گا۔ میں جان بوجھ کر تو اونگھ نہیں رہا ہوں۔ مولانا کو بڑا غصہ آیا۔ ضبط کرتے ہوئے چلے گئے۔ کل ہو کر کلاس میں جانچنا شروع کیا اور میں ہر سوال کا جواب ان کی

توقع سے زیادہ دیتا چلا گیا۔ مولانا نے فرمایا: اس کے باوجود تمھارا اونگھنا ایک جرم تھا، کیوں کہ دوسرے طلبہ اسے مثال بنالیں گے۔

ہندوستان میں گروکل ایک طرز تعلیم تھا جہاں طلبہ اور اساتذہ لغوی طور پر دنیا سے بے نیاز ہوکر آبادی سے دور تعلم و تعلیم میں مشغول رہتے۔ فرصت کے اوقات میں اساتذہ دھیان میں لگ جاتے اور طلبہ میں سے کچھ جنگل سے پھل اور لکڑیاں چن لاتے اور کچھ آبادی میں جا کر بھیک مانگ لاتے۔ اسی آمدنی سے اساتذہ، ان کے خاندان اور طلبہ کے لیے خورد و نوش کا انتظام ہوتا تھا۔ مدارس میں حالت مختلف رہی۔ طلبہ آرام سے کھاتے پیتے اور خود اساتذہ ان کے لیے بھیک مانگ کر لاتے۔ طلبہ فرصت کے اوقات میں، البتہ، اساتذہ کے گھر کے کام سے بچ نہیں پاتے۔ مدرسہ رحمانیہ میں ایک تیسری صورت سامنے آئی۔ اساتذہ اور انتظامیہ کی ذمہ داری فنڈ کی فراہمی ہے۔ طلبہ، جو مستحق، مطبخ میں کھائیں، دارالاقامہ میں رہیں اور تعلیم حاصل کریں۔ یہ عام بات تھی۔

اس زمانے میں جامع مسجد سے متصل چند کمروں کا ایک پختہ مکان تھا۔ راستے سے پورب ایک کھپڑیل ہال درجہ حفظ کے لیے تھا، جس کے سامنے دو دھان کی بکھاریاں تھیں۔ سب سے پورب دو کھپڑیل کمروں کا دارالاقامہ تھا۔ اطفال کے لیے چند مکان کے بعد جنوب میں ایک پھوس کی درس گاہ تھی۔ اب وقت آ گیا کہ اس پھوس کو پختہ عمارت میں بدل دیا جائے۔ پہلے شمال کی جانب کام شروع ہوا۔ زمین کو ہموار کرنے کے لیے بہت مٹی کی ضرورت تھی۔ مزدوری اور ڈھونے پر کافی پیسے خرچ ہوتے۔ حضرت کا حکم ہوا کہ خالی گھنٹیوں میں طلبہ ہی یہ کام انجام دیں گے۔ آبادی سے دور کھیتوں سے مٹی سر پر ڈھو کر مدرسے کی زمین تک لانے کا کام بشمول ناچیز طلبہ نے ہی کیا۔ اس کے بعد اینٹ کو بھٹے میں پکانے کی رات آئی۔ عشا کی نماز کے بعد جاڑے کی سرد رات میں آبادی سے باہر کوئیلے کو آتشیں شعلوں میں بدل کر کچی اینٹوں کو پختہ سرخ اینٹوں میں بدلنے کی محنت تھی۔ اسے ایک مہم کی شکل دی گئی۔ بڑا مجمع لگا۔ جامع مسجد کے امام سے لے کر قصبہ کے کئی معزز حضرات تشریف لائے۔ حضرت مولانا بھی

تشریف فرما ہوئے۔ اللہ تعالی کو دعاؤں سے منایا گیا۔ جنوں اور بھوتوں کو بھگایا گیا۔ بدروحوں کے اندراج پر پابندی لگائی گئی۔ بسم اللہ کی مدد سے آگ سلگائی گئی۔ بھٹے کی نچلی سطح میں کئی خانوں میں لکڑیاں بھڑک اٹھیں۔ بہت دیر تک منظر کا معائنہ کیا گیا۔ اس کے بعد یقین ہو گیا کہ اب کوئیلے تک آگ اس طرح پہنچ چکی ہے کہ اسے بھڑکائے بغیر واپس نہیں ہو سکتی تو معزز حضرات کی ٹیم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئی۔ باشعور طلبہ، جن میں میرا ہونا یقینی تھا، اور چند اساتذہ رات بھر کی نگرانی کے لیے شب بیداری پر مامور رہے۔ مولانا محبّ الحسن صاحب کی رضائی میرے کام آئی۔ رات میں کئی بار چائے پینے کا موقع ملا۔ فجر کے بعد طلبہ واپس آ گئے۔ چند روز کے بعد اینٹ مکمل طور پر تیار تھی۔ اب راج مستری نے طلبہ کو تعلیم پر توجہ دینے کے لیے آزاد کر دیا۔ جب چھت کی ڈھلائی کا کام شروع کیا گیا تو سرخی کو پیٹ پیٹ کر مسطح بنانے کا کام بھی طلبہ نے ہی انجام دیا۔ آنکھ پر پٹی باندھ کر یہ کام انجام دینے کی تصویر آج بھی محفوظ ہے۔ شرارتیں بھی ہوتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی استاذ نگرانی کرتے، مگر شرارت روکنا کسی مدرس کے بس سے باہر ہے۔ طالب علم بڑی اونچی اور ماہرانہ شرارت کر سکتا ہے اور کسی کو پتا تک نہیں لگ سکتا ہے کہ کدھر سے کون سی چیز کس نے کس پر دے ماری۔

عمارت دونوں طرف سے بن کر تیار ہو گئی۔ اب درس گاہ یہاں منتقل ہو گئی۔ جامع مسجد سے متصل عمارت دارالاقامہ میں بدل گئی۔ جس کمرے میں حضرت کی پرنسپل والی آفس تھی میں نے اسی پر قبضہ جمایا۔ میرے ساتھ دوسرا طالب علم وہی اس کمرے میں رہ سکتا تھا جسے میں اجازت دیتا۔ نئی عمارت کے بنتے ہی اسے درس گاہ بنا دیا گیا۔ پہلے شمال کی جانب، پھر جنوب کی عمارت بنی تو اس میں ایک کمرے کو درس گاہ بنایا گیا اور دوسرے کمرے کو دارالاقامہ کا حصہ تسلیم کیا گیا۔ یہ کمرہ مجھے خوب پسند آیا اور میں اسی میں منتقل ہو گیا۔ دوست احباب ایسے جو باہر کالجوں میں زیر تعلیم تھے وہ بھی اب فرصت کے ایام میں یہاں آ جاتے اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ بارش کا موسم آیا اور پانی کے بہاؤ کا نظم پہلے سے نہیں تھا، اس لیے باہر کے راستے پر، جسے اس قصبہ کے اعتبار سے شاہراہ کہہ سکتے ہیں، پانی نے دور دور تک کیچڑ کی

پیداوار سے آمدورفت کو مسدود کر دیا۔ سامنے جس کا مکان تھا وہ مزاجاً سخت اور تقریباً ناخواندہ تھا۔ اس کی زبان بہت تیز چلتی تھی۔ ایک دن مدرسہ کے آغاز پر اس نے حضرت سے تو تو میں میں شروع کر دیا۔ تمام طلبہ شمالی عمارت میں کھڑے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ حضرت صحن مدرسہ میں تنہا اس سے محوِ گفتگو تھے۔ بیچ میں ایک بانس کی بتیوں والی ٹٹی تھی اور دونوں طرف سے گرمیِ گفتار کے اظہار میں منہمک تھے۔ اس شخص کی گستاخیاں حد سے بڑھنے لگیں۔ میں نے تمام طلبہ کو للکارا کہ ہماری موجودگی میں ہمارے شیخ کی توہین ہو رہی ہے اور ہم تمام لوگ تماشائی بنے کھڑے ہیں۔ چلو سب میدان میں اترو۔ سب کے سب میدان میں آ گئے۔ گفتگو کی قیادت میں نے سنبھال لی۔ حضرت سے عرض کی کہ اپنے حجرے میں تشریف لے جائیں۔ اس نے ہمیں بچے سمجھ کر دھمکیاں دینی شروع کیں۔ ہم لوگ اس علاقے کے اعتبار سے ودیارتھی تھے جن پر کسی طرح کی پابندی نہیں ہو سکتی تھی اور نہ حکومت کی طرف سے تعزیراتِ ہند کی دفعات کے نفاذ کا خطرہ تھا۔ میں نے طلبہ کو اشارہ کر دیا۔ اب کیا تھا! جسے جو ملا اس کے گھر کے پار کرتے ہوئے اس کے آنگن میں پھینکنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مدرسہ سے باہر نکل کر اس کے گھر پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بال بچوں سمیت گلی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر بہت سارے لوگ آ گئے اور طلبہ کو درجات میں بھیج دیا گیا۔ وہ آدمی اس کے بعد سے کسی طالب علم کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ممکن ہو سکا کہ حضرت نے مجھے طلبہ کے ساتھ اس سے نبرد آزما ہونے کی اجازت دے دی۔

حضرت مولانا پر ایک سیاسی معاملے میں گفتگو کے دوران میں نے ان کی شان میں گستاخانہ انداز سے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ ایک صاحب جو حضرت کی دفاع میں لگے تھے، ان سے یہ برداشت نہ ہوا۔ وہ حضرت کے پاس رات میں کسی وقت، یقیناً کھانے کے وقت، تشریف لے گئے۔ ان سے شکایت کی۔ میں سویا ہوا تھا۔ پورا قصبہ سو چکا تھا۔ دروازے پر دستک نرم سے شدید تر ہوتی گئی۔ بالآخر میری نیند ٹوٹی۔ دروازہ کھولتے ہی دیکھا کہ وہی صاحب حضرت کے شامل ہیں۔ حضرت کے ہاتھ میں لالٹین بھی تھی، جس کی مدد سے راستہ

طے کیا تھا۔ تینوں آرام سے بیٹھے۔ حضرت نے گفتگو میں بیتی باتوں کی صداقت مجھ سے معلوم کی۔ میں نے تصدیق کی اور جہاں ترمیم کی ضرورت تھی ترمیم بھی کی۔ حضرت نے صرف اتنا فرمایا: اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا۔ نہ کوئی دھمکی، نہ کوئی وارننگ، نہ کوئی ڈانٹ، نہ کوئی پھٹکار۔ یہ تھا حضرت مولانا کا کردار اس زمانے میں جب ان کا طوطی بولتا تھا۔

بچپن سے یہ بات ذہن نشیں کرادی گئی تھی کہ جب انصاف کی بات ہو تو بڑے سے بڑے مجمع میں بھی بڑے سے بڑے شخص کو ان کی غلطی بتا دینی چاہیے۔ ایک تعلیم یہ بھی دی گئی کہ بزرگوں کی غلطی ممکن ہے کہ غلطی ہی نہ ہو، صرف سمجھنے اور دیکھنے میں غلطی معلوم ہو سکتی ہے۔ اسی لیے مولانا روم کو یہ نصیحت کرنی پڑی:

کار پاکان را قیاس از خود مگیر   گرچہ باشد در نبشتن شیر شیر
شیر آن باشد کہ مردم می خورد   شیر آن باشد کہ مردم را درد

خود حضرت اکثر یہ مصرع دہرایا کرتے: ع   خطائے بزرگان گرفتن خطاست

یادوں کا سلسلہ سیلاب کی طرح موجیں مار رہا ہے۔ بر سبیل تذکرہ بھی بہت سی باتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔ فوقانیہ کے امتحان کا وقت آ گیا۔ مرکز امتحان کے سلسلے میں ایک تذبذب بنا ہوا تھا۔ مجھے حضرت نے بورڈ آفس کے دفتر، پٹنہ بھیجا۔ میں نے پہلے پہل تنہا لمبا سفر کیا اور تمام امیدواروں کے ایڈمٹ کارڈ لے کر مرکز امتحان پر پہنچا۔ ان دنوں ٹیلیفون کی بھی عام سہولت حاصل نہیں تھی۔ سب کچھ صواب دید پر منحصر تھا اور درست ہوا۔ اگر میں مرکز امتحان کے بدلے قصبے آتا تو خود میرا امتحان چھوٹ جاتا۔ اس بار بھی شناخت کرانے مولانا محبّ الحسن صاحب تشریف لائے تھے۔ اس بار فی امیدوار بیس بیس روپے جمع کرنے کی بات سامنے آئی ۔ میں اپنی روش پر قائم رہا۔ اس امتحان میں پوری ریاست میں میرا تیسرا مقام رہا۔ ایک درجہ اوپر آنے کی وجہ سے مولانا کو اطمینان ہوا کہ میں اپنی راہ پر گامزن ہوں۔

اب میں مولوی جماعت کا طالب علم بن گیا۔ شعر و شاعری کا بھی اللہ تعالیٰ نے ذوق عطا کر دیا تھا۔ شادیوں کے مواقع پر سہرا لکھنے اور پڑھنے میں میری شہرت ہوئی۔ اس وجہ سے

میں ہر شادی میں مہمان بننے لگا۔ خود حضرت مولانا اور دوسرے حضرات کی حج پر روانگی اور سعادت مبرور حاصل کرنے کے بعد کی واپسی پر تہنیتی نظمیں لکھنا اور ساتھیوں کو ہم نوا بنا کر ان کے ساتھ ساتھ پڑھنے میں بھی مشہور ہوا۔ دھنک لال منڈل اور بیلٹ پاسوان کے لیے بھی تہنیتی نظمیں میں نے لکھیں اور پیش کیں۔ مولانا نے اس بری عادت پر کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ عید کا دن گزار کر رات میں اکثر مشاعرہ یا متشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی طرح بھی دی جاتی تھی۔ ان سب میں میری شرکت یقینی ہوتی تھی۔ حضرت مولانا بھی کبھی کبھی کسی کسی مشاعرے میں شریک ہو جایا کرتے تھے اور داد دیا کرتے تھے۔ اس طرح نام و نمود اور عزت و شہرت میں میں ایک طالب علم ہو کر بھی بہت آگے گیا تھا۔ لوگوں میں میرے تئیں جو پیار کا جذبہ تھا وہ سرمایۂ حیات بن کر آج تک میرے پاس ہے۔

ایک دوسرے بزرگ جناب محی الدین صاحب مرحوم جو سرپنچ تھے اور مسہرو بابو کے نام سے مشہور تھے، انھوں نے اپنے گھر بچوں کو پڑھانے اور عوض میں تینوں شام کھانے کی پیش کش کی۔ ان کے یہاں چند ماہ کے بعد یہ صورت ہوئی کہ میں دالان کے برآمدے پر رات میں سونے بھی لگا تھا۔ بڑے اچھے دن تھے اور سب کچھ آرام اور اطمینان سے گذر رہا تھا۔ مسہرو بابو کا مزاج بلڈ پریشر کی وجہ سے ہمیشہ گرم رہتا تھا۔ گھر کے لوگ ہمیشہ اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ ان کا انداز رہائش بھی دوسروں سے بالکل جداگانہ تھا۔ پنچایت کے سرپنچ تھے۔ پنچوں کے درمیان بڑے مقبول تھے۔ مقدمات کی مثل رکھی جاتی اور طریقۂ کار بالکل قانونی ہوتا۔ گواہوں کے بیانات لکھے جاتے اور ثبوت بھی مثل میں رکھے جاتے تھے۔ جب لکھا پڑھی کی بات ہوتی، میری ضرورت سب کو کسی نہ کسی شکل میں نظر پڑتے ہی محسوس ہو جاتی۔ مسہرو بابو نے بھی مجھے خدمت کا موقع دیا۔ اب کیا تھا! ان کا مزاج میرے لیے اس قدر نرم تھا کہ کبھی میرے سامنے وہ دوسروں کو بھی اپنی سخت کلامی کا شکار نہیں بناتے۔

رمضان شریف میں ہم لوگ مدرسے کے صحن میں بعد نماز عصر والی بال کھیلا کرتے تھے۔ افطار سے چند منٹ قبل تک کھیل جاری رہتا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کی جانب

افطار کے لیے دوڑ پڑتے۔ ایک شام جب میں تیزی سے افطار کے لیے ان کے گھر پہنچا تو افطار کا دسترخوان سجا ہوا تھا۔ ان کے بچے اس کے گرد بیٹھے تھے۔ وہ گھر سے نکلے۔ دہلیز ہی پر تھے کہ افطار کی گھنٹی بج گئی۔ جامع مسجد کے اذان خانے کی اونچائی سے گھنٹی کی آواز ہر جگہ پہنچ جاتی تھی۔ یہی اس قصبے کا رواج تھا۔ سحری کھانے کے لیے بھی گھنٹی کی آواز پر لوگ جاگ جاتے اور سحری سے فارغ ہوتے تھے۔ دہلیز سے اترتے ہوئے انھوں نے فرمایا: ڈاکٹر قدوس کو ذرا بھی صبر نہیں ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے گھنٹی بجوا دیتے ہیں۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ وقت ہو چکا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ وقت ہو گیا ہے تو تم افطار کر لو۔ ہم اپنا روزہ خراب نہیں کریں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ غصے میں دسترخوان کی طرف بڑھتے رہے۔ جب پہنچ گئے تو بولے: اب وقت ہوا ہے۔ پھر فوراً افطار کیا۔ میں تو اس شام کافی گھبرا گیا تھا کہ پتا نہیں وہ اپنا غصہ کس طرح مجھ پر برسائیں گے۔ دسترخوان پر آتے ہی وہ بالکل نارمل ہو گئے۔ آئیٹمس بڑے پیار سے میری طرف بڑھاتے رہے اور میں ڈر سے کھاتا رہا۔ ساتھ ہی مسجد بھی گئے اور نماز بھی ادا کی۔ چائے کے بعد میں سمجھا کہ اب اطمینان ہو چکا ہے اور میری خبر لیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور نہ کبھی پھر انھوں نے اس کا ذکر ہی کیا۔

بہر حال! میں اس کے بعد پٹنہ آ گیا۔ جب فرصت میں جاتا تو وہیں جا کر ٹھہرتا۔ اسی درمیان میری والدہ ماجدہ اللہ تعالی کو پیاری ہو گئیں۔ میں ایک مہینے تک غم سے نڈھال رہا۔ اس غم سے نکالنے میں مسہرو بابو کی زوجۂ محترمہ کا بڑا ہاتھ رہا۔ میں نے بھی اس کے بعد سے ان کو ماں ہی تصور کیا۔ ایک مدت کے بعد وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے اور شوہر نامدار کے ساتھ راجگیر تشریف لائیں۔ اپنے داماد سے کہلا بھیجا کہ میں راجگیر آ جاؤں۔ میں بخوشی وہاں گیا اور ایک ہفتہ تک ان کے ساتھ رہا۔ اب انھوں نے پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ سلسلہ صرف سفر بھر قائم رہا۔ قصبہ جانے پر میں نے دیکھا کہ پھر پردہ شروع ہو گیا۔ اللہ تعالی ان کو بھی جنت میں اعلی مقام عطا کرے!

حضرت مولانا کا یہی محلّہ تھا۔ ایک نئی مسجد بنی اور چند ماہ بعد مجھے اس مسجد کی امامت

سونپ دی گئی۔ مولانا مقتدی ہوتے۔ نماز کے بعد درس میں بھی شریک ہوتے۔ کبھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے مرعوب کر رہے ہوں یا میری خامیاں نکال کر اپنا مقام اونچا دکھا رہے ہوں۔ ایک روز درس ذرا طویل ہو رہا تھا۔ حضرت نے آہستہ سے فرمایا: **السرعة!** میں سمجھ گیا اور مولانا بھی بشاش نظر آئے۔ ایک دن غالباً حضرت کو کوئی جلدی تھی۔ وہ جا سکتے تھے۔ درس کی اہمیت لوگوں کے ذہن میں برقرار رہے، اس کے لیے وہ اس میں شرکت کے بعد ہی جانا چاہتے تھے۔ شروع کرنے سے پہلے انھوں نے فرمایا: **العجلة!** میں سمجھ گیا۔ دونوں بار ایک بھی مقتدی کو ایسا محسوس نہ ہوا کہ درس میں تخفیف کی گئی ہے یا جلد بازی سے کام لیا گیا ہے۔ ان دونوں واقعات کا ذکر لازمی تھا۔ اگر اساتذۂ کرام یہ سلوک اپنے شاگردوں کے ساتھ روا رکھیں تو شاگرد کبھی مغرور نہیں ہو سکتا ہے، اور استاد کی عظمت میں اضافہ ہوگا۔

حضرت نے مولوی جماعت میں مشکوٰۃ شریف کا درس دینا شروع کیا۔ ھدایہ اولین بھی آپ ہی پڑھاتے تھے۔ دونوں کتابوں کے درس کا پہلے خوب مطالعہ کرتے تھے۔ عینی شرح ھدایہ کا ایک نیا سیٹ ڈاک سے منگوایا گیا تھا۔ پورا سیٹ ان کے کمرے میں موجود رہتا۔ جب بھی فارغ ہوتے مطالعہ میں مشغول نظر آتے۔ طلبہ کو پہلے عبارت کی خواندگی کرنی پڑتی تھی۔ یہ فریضہ میں یا کبھی کبھی عزیز محترم مختار علی سلمہ ادا کرتے تھے۔ دوسرے طلبہ ہمت نہیں کرتے اور حضرت بھی کسی دوسرے کو حکم نہیں دیتے۔ ان دنوں حضرت کے گھر سے ایک کیتلی چائے بھر کر آتی۔ ساتھ میں ایک فنجان بھی ہوتا۔ تنہا پوری کیتلی چائے پی جاتے الا یہ کہ کوئی بزرگ اسی وقت آ جائیں اور سادی چائے پی سکیں۔ ناشتہ کے وقت پھر چائے آتی۔ اکثر عزیزی مشتاق سلمہ گھر سے آتے اور حضرت کے ساتھ کھاتے۔ حضرت اس بچے سے بہت پیار کرتے تھے۔ مجھے بڑا غصہ آتا کہ مختار سلمہ کے ساتھ یہ رعایت کیوں نہیں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مختار سلمہ جس عمر میں آ گئے تھے اس میں ایسا پیار نہیں ملتا۔ مشتاق سلمہ کی عمر میں وہ ایسا پیار پا چکے تھے۔ مشتاق سلمہ کی بسم اللہ تو ہو چکی تھی، مگر کبھی کبھی ننھی منی عارفہ بھی آ جاتی۔ میں نے آخر مختار سلمہ اور ان کی سگی بہن نور بی سے دریافت کیا کہ دونوں کو مولانا دوسری نظر سے تو نہیں دیکھتے۔ یقین

دلایا گیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جس کا جو حق ہے اسے وہ مل رہا ہے۔ پھر جب گھر کے اندر جانے آنے کا سلسلہ شروع ہوا تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سوتیلی ماں سے دونوں گھلے ملے تھے اور ایسا لگتا ہی نہیں تھا سلوک میں کسی طرح کا سوتیلا پن بھی ہے۔

اس کے بعد میں پٹنہ چلا آیا۔ یہاں سے جب بھی گھر جاتا تو یکہتہ ارادتاً جاتا اور حضرت سے ملاقات ضرور کرتا۔ اکثر کھانے کی دعوت دیتے اور مجھے شریک ہونا پڑتا۔ میں، پتا نہیں کیوں، مولانا سے قریب ہونے میں برابر دقت محسوس کرتا تھا۔ ممکن ہے تحت الشعور میں میرا مولانا سے مرعوب ہونے کی نفسیات شامل ہو یا یہ کہ عمر کا بڑا تفاوت مانع ہو جاتا ہو۔ لیکن مولانا کو بھی یاد ہوگا اور بہت سے چشم دید گواہ بھی مل جائیں گے کہ میں مولانا سے مرعوب ہونا تو درکنار، اکثر گستاخانہ جسارت سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ ان کے گھر کے تمام افراد سے میرا ہمیشہ اپنا پن بنا رہا۔ جب بھی میں پہنچتا حضرت کی زوجۂ ثانیہ کو ایک گونہ خوشی ہوتی اور اپنے بیٹے کے ہم درس کو کھلانے پلانے میں فخر محسوس کرتیں۔ پتا نہیں اس میں مولانا کی تربیت شامل تھی یا یہ ان کی اپنی فطرت تھی۔ بڑے پیار سے اور بڑی تفصیل سے گفتگو کرتیں۔ جب مختار کی اپنی ماں سے ملاقات ہوتی تو وہ بھی اپنا پن دل سے ظاہر کرتیں۔

اس ضمن میں جناب مولانا محبّ الحسن صاحب کا گھر میرے لیے بڑا بے تکلف گھر تھا۔ پورے اعتماد اور اختیار کے ساتھ میں وہاں جاتا۔ مولانا محترم استاد کے علاوہ مختار کی وجہ سے سالا بہنوئی کے رشتے پر بھی اتر آتے۔ مختار کی بڑی بہن، صالحہ (اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے!) میری اپنی بڑی بہن کی طرح تھیں۔ مولانا میرے امین بھی تھے۔ اسکالرشپ کی رقم میں ان کے پاس ہی رکھتا تھا۔ جب ضرورت ہوئی ان سے لے لی۔ مولانا کا حساب و کتاب بڑا پختہ تھا۔ کبھی کسی طرح کا شک بھی کہیں سے نہیں گذرا۔ آج کے زمانے میں، خود مجھے بعد میں، کئی نیک حضرات سے کافی تلخ تجربات حاصل ہوئے۔ امانت کی رقم اپنے استعمال میں لوگ لے آتے ہیں اور جس کی رقم ہوتی ہے، اسے وقت پر رقم نہیں مل پاتی ہے۔ مولانا تو بالکل بینک کی طرح جمع اور نکاسی کا حساب رکھتے تھے اور فوراً جتنی رقم درکار ہوتی ادا کر

دیتے۔ کبھی ٹال مٹول کی نوبت نہیں آتی۔

حضرت مولانا سے پوری بستی کے لوگوں کی عقیدت بھی تھی اور گہرے مراسم بھی تھے۔ ان کی خدمت میں جب حاضر رہتا تو ان لوگوں سے بھی تفاعل کا موقع مل جاتا اور ان کے برتاؤ سے مولانا کی عظمت اور واضح ہو جاتی۔ مولانا کی ذات اور شخصیت کا جب ذکر ہوتا تو لوگ ان میں ایک کمی عام طور پر لوگ بیان کرتے کہ وہ امیروں سے زیادہ قریب اور مرعوب بھی ہیں۔ اگر امیر کے یہاں دعوت ہوتی ہے اور خلاف شرع مظاہرہ ہوتا ہے تو خاموش رہتے ہیں، لیکن غریبوں کے یہاں دعوت میں شرکت سے پہلے واضح کر دیتے ہیں کہ اگر خلاف شرع کوئی بات نظر آئی تو میں شرکت نہیں کروں گا، یا اگر شریک ہو بھی گیا تو بغیر کھائے واپس آجاؤں گا۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں حضرت کی مجبوری صرف مدرسہ رحمانیہ تھا۔ اس کے لیے ان کو امیروں کی ضرورت تھی اور اکثر تسامح سے کام لینا پڑتا تھا۔ بذات خود حضرت ہمیشہ مالی اعتبار سے مستحکم حالت میں تھے۔ اپنی کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی کہ کسی سے مرعوب ہوتے۔ البتہ حضرت کی طرف سے امیروں کے احترام کو لوگ امیروں کا رعب سمجھ لیتے تو اس کا کیا علاج ہوتا! میں نے ان کے اندر اپنے لیے خاکساری اور دوسروں کے تئیں ذرہ نوازی کا غیر محتاط رویہ ضرور دیکھا۔ جناب محبّ الحسن بھولا بابو، حاجی منیر الدین، حاجی عبدالرؤف، عبدالرحمٰن تھتو، ڈاکٹر عبدالقدوس، انصار الحق کمپونڈر، وجیہ الحسن ٹھیٹھر بابو اور مولوی محمد نور الحسن صاحبان (اللہ تعالی ان تمام حضرات کو غریق جنت کرے!) کی حضرت خاطر خواہ عزت کیا کرتے تھے۔ جناب انیس احمد صاحب تو اکثر مدرسے کے سکریٹری ہوا کرتے، اس لیے ان سے ماتحت کا رشتہ ہو جانا فطری امر تھا۔ اسی طرح بھولا بابو بھی لمبی مدت تک سکریٹری رہے اور یہی اعزاز ان کو بھی حاصل تھا۔ عبدالغفار بابو کا بھی کچھ اسی طرح کا حال تھا کہ وہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے معزز تھے۔ ان لوگوں سے میں بھی کسی نہ کسی حد تک قریب ہوا اور محسوس کیا کہ مولانا ان کی عزت کرنے میں حق بجانب تھے اور یوں بھی بنی آدم کا اکرام لازم ہے۔ یہ لوگ تو بنی آدم میں اپنے علاقے کے اعتبار سے انتخاب تھے۔

اسی ضمن میں چند ناموں سے اپنے تعلقات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ مجھے انگریزی پڑھنے کا شوق اس لیے پیدا ہو گیا کہ مدرسے کے نصاب سے میری ضرورت پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ مدرسے میں کوئی ایسے مدرس بھی نہیں تھے جن سے میں اپنی اس پیاس کے لیے پانی مانگتا۔ طے ہوا کہ عبدالغفار بابو کی انگریزی بہت اچھی ہے، اس لیے ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔ میں ان کے عالیشان دربار میں جھانکنے سے بھی ڈرتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے ایک دن پہنچ گیا۔ بڑے شوق سے ملے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں تو دن بھر بے کار ہی رہتا ہوں۔ اگر تم انگریزی سیکھنے آجاؤ گے تو میری بھی طبیعت لگے گی۔ اب اس سے زیادہ سہولت کیا ہوسکتی تھی! انگریزی سیکھنے کا آسان اور رائج طریقہ یہ تھا کہ روز ایک مشق اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا جائے اور اصلاح لی جائے۔ سلسلہ شروع ہو گیا۔ گاڑی چلتی رہی۔ اسی درمیان دھنک لال منڈل کے اسپیکر ہو جانے کے بعد مدرسے میں ان کو دعوت دی گئی۔ میں نے فوراً استقبال کے لیے ایک نظم تیار کر لی، اساتذہ نے سن لینے کے بعد اجازت دے دی۔ اس کے بعد قریہ کے معزز ہستیوں نے بھی سن کر اجازت دے دی، میں نے عبدالغفار بابو سے اس بات کا ذکر کیا کہ میں انگریزی میں تقریر بھی کروں گا۔ ایک تقریر لکھی اور ان کے سامنے اصلاح کے لیے پیش کی۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ اس کی اصلاح تم انیس احمد سے لو۔ جناب انیس احمد صاحب بڑے مشغول نیم سیاسی آدمی تھے۔ ان کے پاس ہمیشہ لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ بہر حال شوق کو دبایا نہیں جاسکتا تھا۔ بادل نخواستہ ان کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ موصوف نہ صرف یہ کہ بہت خوش ہوئے بلکہ فوراً اصلاح شروع کر دی۔ شروع کا پیراگراف تو انھوں نے اس طرح سے سجایا کہ میں بھی اس پر نازاں ہونے لگا۔ اس طرح شاید جناب انیس احمد صاحب کو یاد بھی نہ ہو، میں ان کا بھی شاگرد بن گیا۔ عبدالغفار بابو کے مشورے پر ان سے مزید گزارش کی کہ اب وہ ٹرانسلیشن کی اصلاح بھی کر دیا کریں، کیوں کہ عبدالغفار بابو نے فرما دیا تھا کہ اب تم میرے برابر انگریزی سیکھ چکے۔ انیس احمد صاحب نے ایک یا دو دن کے بعد استاذ الاساتذہ جناب ماسٹر عقیل احمد صاحب یعنی اپنے والد محترم سے ملایا۔ میری طرف سے ان سے

درخواست کی کہ وہ میرے ترجمے کی اصلاح کر دیا کریں۔انھوں نے بھی شوق سے قبول فرمایا۔ غالباً عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت دیا۔وہ کہیں جاتے آتے نہیں تھے۔مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے سبک دوش ہو جانے کے بہت زمانہ بعد کا مرحلہ تھا۔جسمانی طور پر بھی لاغر اور کمزور ہو چکے تھے۔ان کے سکھانے کا انداز بہت پسند آیا۔وہ پہلے میرے جملے پر تبصرہ فرماتے۔اسے کئی طرح سے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔اس کے بعد اپنی طرف سے کئی جملے بولتے یا لکھتے۔ان سب میں سب سے بہتر جملے کی نشاندہی کرتے۔ایک بار غالباً یہ جملہ آیا: کیا تم گھڑی میں وقت پہچانتے ہو؟ اس پر وہ توقف فرما گئے۔حکم ہوا کہ انتظار کرو۔میں بھی اس کی صحیح انگریزی نہیں جانتا ہوں۔شمسی (ڈاکٹر منظور احمد شمسی، جو قریہ میں اس وقت تنہا ایم. بی. ایس. تھے۔) چند دنوں میں آنے والے ہیں۔میں ان سے پوچھ کر رکھوں گا۔ایک دن بڑے خوش نظر آئے۔فرمایا۔شمسی نے بتایا کہ یہاں read کا استعمال ہوگا۔اس کے بعد وہ بے تکلف سے ہو گئے۔ایک دن انھوں نے فرمایا: ادھر میز پر دیکھو۔تمباکو اور چونا ہے۔دونوں سے کھینی بناؤ۔کبھی لگائے ہو یا نہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔انھوں نے زبانی طریقہ بتایا اور کھینی تیار کرنے کا حکم دیا۔میں نے ڈرتے ڈرتے اس حکم کی تعمیل کی۔وہ بہت خوش ہوئے اور بولے کہ پہلی کوشش میں ہی تم نے تجربہ کار اور ماہر کھینی خور کی طرح اسے عمدہ بنا یا ہے۔ان کے انتقال پر مدرسہ میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی تھی۔میں نے ایک قطعہ کہا تھا جو اب نہ تو یاد ہے نہ محفوظ۔ان کے ناتیوں اور پوتوں کے علاوہ کئی افراد نے بعد میں مجھ سے وہ قطعہ لیا تھا۔

جب دھنک لال منڈل کو استقبالیہ دیا گیا تو خاص اہتمام ہوا۔عبدالحق بابو مرحوم کے مکان پر کھانا بنانے کا انتظام کیا گیا۔جناب عبدالرحمٰن تھو مرحوم ہیڈ بٹلر کی شکل میں موجود تھے۔ چونکہ طلبہ میں میرا مقام خاص تھا، اس لیے میں بڑی بے تکلفی سے ہر جگہ جا آ سکتا تھا۔وہاں میں نے دیکھا کہ انھوں نے بڑے مزے سے پیشہ ور باورچی کا کارنامہ انجام دیا۔مختلف قسموں کے آئیٹمس بنائے گئے جن میں مرغ مسلم کا خاص اہتمام ہوا تھا۔انھوں نے خود

اپنے ہاتھوں سے مرغ مسلم تیار کیا اور بڑے فخر سے اسے آنچ دی۔مہارت کی نظر سے ایک رنگ کے فرق کو دکھاتے رہے۔اللہ مرحوم کو جنت نصیب کرے! حضرت سے ان کے مراسم بھی بہت اچھے تھے۔

ایک نام فوراً اپنا ذکر چاہتا ہے۔قد میں پورے قصبہ میں سب سے چھوٹے مگر اقدار میں ان کے برابر دس سے زیادہ نہیں ہوں گے۔وہ طالبات کے مکتب میں سرکاری ٹیچر تھے۔ان کی وجہ سے بہت ساری لڑکیوں نے اپنے آپ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، اگرچہ ابتدائی تعلیم ہی کیوں نہ ہو۔دیر سے تعلیم شروع کرنے والی بڑی لڑکیوں کے لیے بھی ان کا مکتب بہت مناسب تھا۔معاشی اعتبار سے بڑے اور اچھے گھروں کی لڑکیاں اطمینان سے وہاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔وہ اپنے اقدار کے سبب کافی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔تنخواہ لانے یا کسی طرح کی رپورٹ پیش کرنے وہ اپنی بیل گاڑی سے کھٹونا جایا کرتے تھے۔غالباً مدرسہ رحمانیہ کی مجلس عاملہ کے صدر بھی رہ چکے تھے۔حضرت ان کی عزت خوب کیا کرتے تھے۔

ایک بہت ہی اہم نام ڈاکٹر عبدالقدوس مرحوم کا ہے۔آپ جامع مسجد کے امام تھے۔ حضرت سے تقریباً روزانہ مسجد کے علاوہ مدرسے میں بھی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔جامع مسجد کی تعمیر کے حساب و کتاب کی پوری ذمہ داری انھوں نے سنبھال رکھی تھی اور تمام لوگوں کا اعتماد بھی ان کو حاصل تھا۔ان کا گھر بھی میرے لیے بڑا بے تکلف گھر تھا۔انھوں نے مجھے اس قدر پیار دیا اور میری بہتری کے لیے سچے سرپرست کا کردار نبھاتے ہوئے ایسی ایسی کوشش کی کہ میں بار بار ان کو یاد کرنے پر مجبور ہوں اور دعا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔اللھم ادخلہ دار السلام! مزاج کے اعتبار سے سیماب تھے۔برف سے زیادہ سفید۔ہلکی سی مخالف تمازت پر پگھلنے لگتے۔تھوڑی سی برودت پر جمنے لگتے۔رمضان شریف میں ہر وقت تلاوت میں مشغول نظر آتے، مگر تراویح میں اسی قدر بار بار تشابہ کے شکار ہوتے۔جب تشابہ دور کرنے کی کوشش کرتے تو پیچھے سے بہت تیز پڑھنا شروع کرتے۔کبھی کامیاب ہو جاتے اور کبھی رکوع و سجود کے لیے کسی دوسری چھوٹی سورہ کا سہارا لیتے اور قرآن مجید دیکھ کر تشابہ سے باہر نکل

پاتے۔ مجھے ٹانسل کی اکثر شکایت ہوجاتی اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ فجر کی نماز کے بعد ایک لال رنگ کا جما ہوا مادہ لکڑی کے سہارے میرے منہ میں ڈالتے اور ٹانسل کی جگہ پر رگڑتے جاتے۔ جلد ہی افاقہ ہوجاتا۔

ایک صبح معلوم ہوا کہ پوسٹ ماسٹر صاحب کے یہاں چوری ہوگئی۔ ڈاک گھر کے پیسے چور لے گیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کو چوروں نے رسے سے باندھ کر یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ دوپہر بعد تھانے سے لوہا سنگھ داروغہ تفتیش کے لیے آیا۔ دور سے ہی لوگ اس داروغہ کو دیکھا کرتے تھے۔ نزدیک جانے والے کی شامت آجاتی۔ کسی بھی طرح کی بے ڈھنگی دیکھتے ہی وہ سزا دے دیتا۔ پورے علاقے میں شہریوں کو سکون ملا تھا اور چوروں کو علاقہ خالی کرنا پڑا تھا۔ اس کی تفتیش سے کیا ثابت ہوا یہ تو مجھے یاد نہیں، البتہ ڈاک۔تار والے حکام نے ان سے ڈاک گھر چھین کر ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب کے حوالے کردی۔ اب وہ ڈاک بابو بھی بن گئے۔ پھر لکھنے پڑھنے میں میری ضرورت وہاں ہوئی۔ مدد کے علاوہ ان کے غائبانے میں پورا کام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ ڈاک کا کام وہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ پہلے حساب لکھتے۔ غلے (بٹوے) میں موجود پیسہ گنتے۔ اگر حساب کے مطابق پیسہ ہوتا تو اطمینان ہوتا ورنہ بار بار حساب کرتے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر غلے میں پیسہ زیادہ یا کم ہے تو حساب غلط ہوسکتا، مگر غلے میں نہ تو باہر کا پیسہ شامل ہوسکتا ہے نہ اس سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دیانت داری نبھائی جاسکتی ہے۔ جب بیمار پڑتے تو ڈاک گھر کے ساتھ مسجد میں امامت کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپ دیتے، حالانکہ ایک سے ایک بزرگ ہستی خود نمازیوں میں موجود تھی۔ میری عمر کے ساتھ یہ بڑی زیادتی تھی۔ ایک بار جمعہ کی نماز تک مجھے پڑھانی پڑی۔ جناب شمشاد احمد صاحب جو مجھ سے بہت سینیر تھے اور آڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کے بعد اب سبک دوشی کی زندگی گاؤں میں ہی گزار رہے ہیں، انھوں نے مجھے مشورہ بھی دیا کہ خطبہ تم ان لوگوں کے انداز پر مت پڑھنا، بلکہ معلوم ہو کہ عربی میں تقریر کر رہے ہو۔

ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے گھر کی ہر تقریب میں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ضرور شامل

کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک دعوت میں ان کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر بدیع الزماں میرے ہی بغل میں بیٹھے تھے۔ بے تکلف تو تھے ہی، اور پٹنہ میں بھی ساتھ رہنے اور کھانے پینے کی ایک مدت گذری تھی۔ انھوں نے مرغ کے پیالے سے مجھے پارچہ دینے کی کوشش کی۔ بڑی کوشش کے باوجود وہ ایک آدھ گھٹیا قسم کے پارچے دے سکے اور کہا کہ تمھاری قسمت ہی خراب ہے۔ چمچے پر کوئی اچھا پارچہ آ ہی نہیں رہا ہے۔ ان کے پلیٹ میں ران پہلے سے موجود تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور ران اپنے پلیٹ میں ڈال لیا۔ جواباً کہا کہ میری قسمت آپ کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ مجھے اپنی قسمت خود بنانی تھی، سو بنالی۔ اب آپ اپنی قسمت آزمائی کیجیے۔

حضرت مولانا علمائے کرام کا ہمیشہ سے احترام کرتے ہیں۔ ایک جلسے میں مہمان علمائے کرام کے خود سے پانی بھر کر بالٹین اٹھا کر لے جاتے میں نے دیکھا۔ میں نے ان سے لینے کی کوشش کی تو انھوں نے فرمایا کہ تم کمزور ہو۔ یہ بڑی بالٹین تم سے نہیں اٹھنے کی ہے۔ مہمانوں کی خدمت کا مجھے بھی تو موقع ملنا چاہیے۔ جامع مسجد کی نئی تعمیر سے پہلے طے ہوا کہ سنگ بنیاد حضرت مولانا فصیح احمد استھانوی کے مبارک ہاتھوں سے رکھا جائے۔ حضرت کے لیے بیل گاڑی کی سواری گھوگھرڈیہا اسٹیشن پر بھیج دی گئی تھی۔ حضرت کی ٹرین رات میں پہنچی تھی اور بیل گاڑی کے ساتھ جانے والے ان کو کھوجتے رہ گئے، مگر پتا نہ چل سکا۔ حضرت نے کسی کا انتظار تک نہیں کیا اور پیدل راتوں رات روانہ ہوگئے۔ فجر کی نماز میں آپ جامع مسجد میں موجود تھے۔ انھوں نے ہی نماز کی امامت کی اور اس میں دعائے قنوت کا اہتمام کیا۔ سنگ بنیاد رکھا گیا اور ہلکا پھلکا خطاب بھی ہوا۔

ایک بڑے جلسے میں حضرت مولانا قریش باروی مدعو کیے گئے تھے۔ حضرت مولانا نے مجھ سے ان کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ جب آپ تقریر کریں گے، تم کاغذ قلم لے کر کسی اطمینان کی جگہ پر بیٹھ جانا اور پوری تقریر لکھ لینا۔ حضرت کا حکم کیسے ٹالا جاسکتا تھا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا کام تھا اور میں شارٹ ہینڈ سے بالکل ناواقف تھا۔ کبھی کا ایسا تجربہ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالی کی مدد کے سہارے اس کام کو بھی انجام دیا۔ میری یادداشت ان دنوں بڑی اچھی تھی۔ اس

لیے اشاروں سے کام لیا اور بعد میں تقریر مکمل کر لی۔ حضرت نے کبھی اس تقریر کا مطالبہ نہیں کیا، میں نے البتہ اس تقریر سے بہت فائدہ اٹھایا۔ آج تک جب اچانک بغیر موضوع کے اسلامیات پر تقریر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں تو حضرت مولانا قریش رحمہ اللہ کے تمہیدی کلمات سے بات شروع کر دیتا ہوں اور محسوس ہوتا ہے کہ سامعین کو میری باتیں پسند آ گئیں۔ شاید حضرت نے اسی وجہ سے مجھے تقریر نوٹ کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ بعد میں میرے ہی کام آئے۔

حضرت مولانا عبادات کے معاملے میں اتنے سخت تھے کہ کسی طرح کی رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ مدارس میں ملازمت کرنے والوں کے لیے نماز باجماعت کی پابندی ہوتی ہے تاکہ طلبہ کی بھی تربیت آسانی سے کی جا سکے۔ جہاں تک اساتذہ کے لیے ضروری بات ہے وہ تو بس اس حد تک ہے کہ وہ اپنے مضامین میں اختصاص کا درجہ رکھتے ہوں، تدریس کا عمدہ ہنر ان کے پاس ہو، طلبہ ان کو سمجھ پاتے ہوں اور زیادہ سے زیادہ ان کے درس میں شامل ہونے کے مشتاق ہوں، وہ طلبہ کو اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل مطمئن کرنے پر قدرت رکھتے ہوں اور عملی زندگی میں اس مضمون سے متعلق مواقع کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی طرف طلبہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ عبادات میں کوتاہی کا حساب وکتاب تو اللہ تعالی کے مقررہ قوانین کے اعتبار سے لازمی ہے ہی، مگر عبادات کو تدریسی استعداد پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ہے۔ مدرسے کے دو اساتذہ: حساب پڑھانے والے ماسٹر عطاء اللہ صاحب اور فارسی پڑھانے والے مولوی احمد اللہ صاحب نماز باجماعت میں غفلت برتنے کے جرم میں مدرسے سے ایسے وقت میں برخاست کر دیے گئے جب بورڈ کے امتحانات منعقد ہونے والے تھے۔ طلبہ میں کافی بے چینی پیدا ہو گئی۔ میرے بیچ کے لیے پہلا سال تھا۔ دوسرے سال کے طلبہ زیادہ پریشان تھے۔ اونچی جماعتوں کے طلبہ ان دونوں اساتذہ سے اب بے نیاز ہو چکے تھے، کیوں کہ ان دونوں کی ضرورت فوقانیہ تک ہی تھی۔ طلبہ نے مجھے اپنی شکایتوں کی نمائندگی کے لیے آمادہ کیا۔ چند بزرگ مقامی اور بیرونی دونوں طرح کے طلبہ نے بھرپور حمایت کا عہد کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ناکامی رکھی ہے کیوں کہ اساتذہ سے تو گفتگو کی جا سکتی

تھی، مگر حضرت مولانا کے سامنے تو اساتذہ کی زبان بھی نہیں کھل سکتی تھی، طلبہ کی کیا مجال! بہر حال! میں نے قیادت شروع کر دی۔ پورے ادب اور تہذیب کے دائرے میں حضرت کے سامنے مسئلہ پیش کیا۔ آپ نے عبادات کے سلسلے میں ذرہ برابر لوچ کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی۔ بعد میں نے گزارش کی کہ متبادل نظم کر دیا جائے۔ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ اس قدر جلد کیسے ہو سکتا ہے، میں نے کہا: تو برخاست کرنے میں اس قدر عجلت کی کیا ضرورت تھی؟ اس جملے بعد اکثر طلبہ بھاگنے کی راہ تلاش کرنے لگے۔ شرم سے سب نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اگر حضرت دوسری طرف دیکھتے تو ایک ایک کر کے سب نکل جاتے اور میں تنہا وہاں موجود رہ جاتا۔ حضرت ایسے موقع پر مضبوط سے مضبوط چھڑی سے ہماری تہذیب اور تادیب کرنے کے عادی تھے۔ اس دن لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ انھوں نے سوچ کر فرمایا: اچھا تم لوگ اپنی اپنی جماعتوں میں جاؤ۔ جلد کوئی نظم کیا جائے گا۔ چند دنوں بعد اسی قصبے کے دو حضرات عارضی طور پر بحال کر دیے گئے۔ ایک تو اپنی طویل فرصت گزار رہے تھے، اور ایک کہیں تدریسی ملازمت ایسے مدرسے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دو تین دن مشکل سے بیتے ہوں گے کہ طلبہ نے ان دونوں کی نقلیں اتارنی شروع کر دیں۔ یعنی دونوں طلبہ کو اپنی تدریسی لیاقت کے جال میں پھنسانے میں ناکام رہے۔ ہر طرف مذاق ہونے لگا۔ مذاق ہی مذاق میں یہ ایک سنجیدہ اور سنگین مسئلہ بن گیا۔ اہل قصبہ میں سے بھی ایک اچھی خاصی تعداد، جو کسی نہ کسی وجہ سے طلبہ کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کر سکتے تھے، ہماری پذیرائی اور حوصلہ افزائی میں دلچسپی لینے لگے۔ ایک بڑا سا ہنگامی جلسہ بھی مدرسے میں منعقد ہو گیا۔ طلبہ کو ان لوگوں نے ہر طرح کی حمایت کا یقین دلایا۔ اب کیا تھا! کل ہو کر ایک لمبی چوڑی عرضداشت صدر مدرس یعنی حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کر دی گئی کہ اگر ایک ہفتے کے اندر دونوں نااہل اساتذہ کو ہٹا کر اہل اساتذہ کی بحالی نہ کی گئی تو طلبہ اسٹرائیک پر چلے جائیں گے۔

یہ عرضداشت اس مدرسے اور قصبے کی تاریخ میں تعجب خیز تھی، بلکہ تصور سے بھی پرے تھی۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ کچھ نہ ہوا۔ میں نے طلبہ کی میٹنگ بلائی۔ سب اسٹرائیک پر آمادہ تھے،

لیکن یہ ہمت کسی میں نہیں تھی کہ مدرسے میں موجود رہ کر ایک ساتھ سب ہڑتال پر بیٹھ جائیں۔ سب کو حضرت مولانا کی لاٹھی اور دیگر اساتذہ کی چھڑیاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے آبرو بچانے کے لیے تجویز پیش کی کہ سب مدرسے سے غیر حاضر رہیں گے اور گاؤں کے مشرق میں دور تک پھیلے باغوں میں جمع ہو کر آئندہ کے بارے میں سوچیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ کچھ طلبہ نے تو اپنے گھروں میں اپنے اپنے والدین سے ذکر کر دیا۔ کچھ والدین اپنے اپنے بچوں کو زبردستی مدرسہ پہنچا گئے اور حضرت سے کہا کہ اسٹرائیک پر جانے والوں کو ایسی سزا دی جائے کہ وہ اسٹرائیک لفظ ہی کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیں۔ کچھ والدین نے اپنے اپنے بچوں کو کسی کام پر لگا دیا۔ نہ مدرسہ بھیجا نہ طلبہ کے پاس جانے دیا۔ اونچی جماعتوں کے وہی طلبہ جو ہوش مند کہے جا سکتے تھے مقررہ مقام پر آ گئے۔ ملا جلا کر اسٹرائیک پورے طور پر کامیاب قرار دیا گیا اور پورے گاؤں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔

مدرسے کی طرف سے یہ اقدام کیا گیا کہ مطبخ میں کھانے والوں کا کھانا بند کر دیا گیا تا کہ بھوک ہر طرح کا سبق پڑھا دے گی۔ چند طلبہ میری طرح کسی نہ کسی کے گھر ان کے بچوں کو پڑھانے کے عوض کھانا کھاتے تھے۔ ان گھروں کے مالکان کو بلایا گیا اور کہا گیا کہ کھانا بند کر دیں۔ باغ میں چند خیر خواہ بھی پہنچے تھے۔ فوراً ان کی حمایت کا وقت آ گیا تھا۔ ان سے میں نے کہا ابھی تو فوراً سب کے کھانے کا نظم کیجیے۔ یہ کام اس گاؤں کے لیے بڑا آسان تھا۔ مہمان نوازی میں وہ لوگ بہت آگے تھے۔ ایک ایک کے لیے کھانے کا نظم ہو گیا۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ کون کس کے گھر کھانے جائے گا۔ ایک دو کے گھر سے خبر آئی کہ ہم تو اپنے بچوں کو پڑھانے کے عوض کھانا کھلاتے ہیں، اس لیے مدرسے کے منتظمین کے کہنے پر ہم کھانا اپنے بچوں کے اساتذہ کا بند نہیں کر سکتے ہیں۔ میں جہاں تھا وہاں سے کسی طرح کی خبر نہیں آ سکی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں سے بھی مدرسہ والوں کی اپیل واپس آ گئی ہو گی۔ میں دندناتا ہوا کھانے چلا گیا۔ اندر بلایا گیا۔ کھانا لگایا گیا۔ بچوں کی والدہ نے، جن میں میں نے ماں کی ساری خوبیاں بتائی تھیں، ہنستے ہوئے اسی گاؤں کی بولی میں پوچھا: تم لوگوں نے آج کیا کیا ہے؟ مولانا ممتاز

علی صاحب نے ان کو بلایا تھا اور کہا کہ کھانا بند کر دیجیے۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ تم مجھے سمجھاؤ۔ میں نے ان کی باتیں سن لیں اور فوراً دسترخوان پر آئی نعمت کو سلام کیا اور چلتا بنا۔ بیچاری سمجھاتی رہ گئیں اور اپنے آپ کو کوسنے لگیں کہ کھانے کے بعد پوچھنا چاہیے تھا۔ میں پہلے پوچھ کر غلطی کی۔ میں کب رک سکتا تھا۔ جیسے ہی گھر سے باہر نکلا نتھو خلیفہ کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ ان کا ایک دروازہ ادھر بھی کھلتا تھا جدھر سے میں آ رہا تھا۔ انھوں نے پاس بلایا۔ مجھ سے کہا کہ تم تو ابھی کھانے گئے تھے۔ اس قدر جلد واپس آ گئے۔ میں سمجھ گیا۔ آؤ میں نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ دونوں ساتھ کھاتے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا جب تک تم چاہو میرے یہاں مہمان بن سکتے ہو۔ اگر تم میرے بچوں کو پڑھانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو جب تک اس مدرسے میں ہو میرے ہی یہاں کھانا کھاؤ۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ میں نے وہیں کھانا کھایا اور باقی طلبہ کا حال دریافت کرنے نکل گیا۔ سب نے کھانا کھا لیا تھا۔

دوسرے دن اسٹرائیک ختم کر دی گئی۔ طلبہ جماعتوں میں کم آئے، لیکن تیسرے دن سے مدرسہ معمول پر آ گیا۔ دس پندرہ دنوں کے بعد تادیبی کارروائی شروع ہوئی۔ مجلس منتظمہ کی میٹنگ ہوئی۔ اسی میں مجرم قرار دیے گئے طلبہ کو بلا کر ان کی سرزنش کرنے کی بات چل رہی تھی۔ صرف پانچ سات طلبہ کو مجرم قرار دیا گیا اور مجھے سب کا قائد قرار دیا گیا تھا۔ میٹنگ مغرب کی نماز کے بعد عبدالغفار بابو کی بلڈنگ کے باہری حصے میں ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے مار کھانے سے بچنا بھی تھا۔ ہم لوگ چھپے رہے۔ لمحہ لمحہ خطرہ ہوتا کہ اب پکڑے گئے۔ بہرو جو مدرسے کے ملازم تھے اور پہلوان بھی تھے وہی ہمیں ہر ممکنہ جگہ پر کھوج رہے تھے۔ بار بار کھانسی تک روکنے کی نوبت آئی۔ بہر حال! اب چند دنوں یا ہمیشہ کے لیے اس گاؤں کو چھوڑ دینا ہی مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ ایک پہلوان سے بات کی گئی وہ کم از کم دو طلبہ کو یعنی ایک مجھے اور ایک حافظ مظہر الحق کو گھوگھرڈیہا پہنچا دیں۔ پہلوان بالکل جوان تھا، اس نے ڈھارس بندھائی۔ لوگوں کے سو جانے کے بعد بیل گاڑی روانہ ہوئی۔ دو میل تک ہر پل ڈر لگا رہا، لگتا تھا کہ بہرو چند لوگوں کے ساتھ پکڑنے آ رہے ہیں۔ بہر حال! زیادہ نفسیاتی ڈر تھا۔ ہم لوگ گھوگھرڈیہا

پہنچ گئے اور ٹرین سے روانہ بھی ہو گئے۔ حافظ مظہر الحق تو تموریا میں اتر گئے اور پھر کبھی، ہماری یادداشت کے مطابق، اس گاؤں میں نظر نہیں آئے۔

میں پہلے مدرسہ رحمانیہ سوپول گیا تاکہ وہاں اپنے علاوہ اور چند طلبہ کے لیے تعلیم مع طعام و قیام کا نظم کرا سکوں۔ وہاں تھوڑی سی امید تو ہوئی، مگر میں کل ہو کر وہاں سے دربھنگہ چلا آیا۔ وہاں مسٹر منت اللہ کے لاج میں مہمان بن گیا۔ مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ میں دس کے لیے انتظام کرانے میں کامیابی ملی۔ وہاں سے اب مدرسہ آ کر ٹی.سی. حاصل کرنے کا مرحلہ تھا۔ بارش اس قدر زوردار ہوئی تھی کہ گھوگھورڈیہا سے یکہتہ جانا کارے داشت۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی اور راستہ ہر جگہ جل تھل تھا۔ نلوں سے پانی خود بخود بہہ رہا تھا، کیوں کہ اردگرد کے دریاؤں میں سطح آب کافی بلند ہو چکی تھی اور ان نلوں سے تو بہت بلند ہو چکی تھی۔ سویرے ہمت کر کے بھیگتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ ساتھ میں ایک لنگڑا ساتھی بھی تھا۔ جب سسوار سے پہلے پورب کی طرف روڈ تک پہنچے تو اس پر سیلاب کا منظر تھا۔ کئی بار بہتے بہتے بچے تھے۔ لنگڑے کو بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ مغرب کے آس پاس گاؤں پہنچ پائے۔ مولوی طاہر صاحب کے دالان میں ٹھہرے۔ ان کے ہی مہمان بن گئے۔ بخار آ گیا۔ درست بھی جلد ہی ہو گئے۔ مدرسے کے وقت میں مدرسہ گیا۔ حضرت مولانا جامع مسجد کے ٹوٹے ہوئے صحن میں درس دے رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کیا۔ اجازت ملی تو بیٹھ گیا۔ حضرت بالکل خاموش رہے۔ میں نے دبی زبان میں پہل کی: ہم لوگوں کا کیا ہوا؟ کیا ہونا تھا؟ جو تم نے چاہا سو ہوا۔ یہ ان کا جواب تھا۔ میں نے پھر ہمت کر کے پوچھا: ہم نے جو چاہا وہ تو کچھ نہیں ہوا۔

میں حضرت کی پیشانی کو آنکھوں سے پڑھتا رہا۔ اچانک میرے اندر ایک بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ میں نے پھر عرض کیا: اور میں نے تو اپنے لیے کچھ نہیں چاہا تھا۔ اس کو سن کر حضرت جو چیں بجبیں تھے اب خندہ پیشانی کے ساتھ بحرِ بے کراں کی طرح بالکل خاموش نظر آنے لگے۔ میں نے اپنے ارادے سے ٹی.سی. کے مطالبے کو غائب پایا۔ حضرت اسی طرح خاموش رہے۔ مجھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ عرض کی: میرے لیے کیا حکم ہے؟ جواب ملا: میں حکم دینے والا

کون ہوتا ہوں؟ حکم تو تم دیتے ہو۔ ویسے تمام طلبہ کی طرح تم پڑھنا لکھنا چاہتے ہو تو کل سے شامل درس ہو جاؤ۔ میں بالکل مطمئن ہو کر سلام کرتے ہوئے رخصت کی راہ لی اور حسب ہدایت اگلے دن سے مدرسہ حاضر ہو گیا۔ حسب سابق نظام الاوقات کے مطابق سارے کام ہونے لگے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ماضی کی تمام باتیں فراموش کر دی گئیں ہیں۔ میں اس اطمینان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور حصول علم میں مشغول ہو گیا۔ اب قیام کے ساتھ طعام بھی مطبخ سے جاری ہو گیا۔

میں نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی اور ایسا لگا کہ سب کچھ نارمل چل رہا ہے۔ دو ہفتوں کے بعد جامع مسجد سے متصل دارالاقامہ کے صحن میں بعد نماز مغرب مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی، مجھے اس میں طلب کیا گیا۔ میں حاضر ہوا۔ مجھ سے بہت سارے سوالات پوچھے گئے۔ کہا گیا: کئی طلبہ نے تحریری بیان دیا ہے کہ اسٹرائیک پر جانے کے لیے تم نے حکم دیا اور ان کو مجبور کیا، اس لیے پوری ذمہ داری تم پر عائد کی گئی ہے۔ میں نے عرض کی: میں تنہا تو نہیں تھا۔ عبدالغفار بابو بولے: تم ہی رنگ لیڈر تھے۔ میں نے مزید کسی طرح کی بحث سے گریز کیا اور فیصلے کا انتظار کیا۔ فیصلہ سنا دیا گیا: تم ٹی.سی. لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے بسر و چشم قبول کر لیا۔

دوسرے دن میں شامل درس نہ ہو کر مدرسہ کھلتے ہی حضرت مولانا کے دفتر کے برآمدہ پر چسپاں بیٹھ گیا۔ اگر میں معافی کا طلبگار ہو جاتا اور آئندہ کسی قسم کی اسٹرائیک سے باز رہنے کا تحریری عہد کر لیتا تو کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا نہ تو عندیہ دیا گیا اور نہ میں نے جاننے کی زحمت کی، کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ میں ایسا نہیں کر پاتا۔ حضرت مولانا دفتر آنے سے گریز کرتے ہوئے درس گاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ جب میری طرف سے مکمل خاموشی برتی گئی تو دفتر تشریف لائے۔ میں نے کھڑے ہو کر سلام پیش کیا۔ پوچھا گیا: کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا: ٹی.سی.....۔ پھر حضرت کمرے کے اندر اور میں باہر۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز آئی: ادھر آؤ، میں اندر گیا کہ ٹی.سی. تیار ہو چکی ہے۔ چل کر لے لیا جائے۔ اندر داخل ہوا تو حضرت نے فرمایا: ایک درخواست دے دو کہ کسی وجہ سے اب یہاں پڑھنا نہیں چاہتے ہو، اس لیے ٹی.سی.

چاہیے۔ میں نے عرض کیا: ٹی.سی. تو آپ حضرات جبراً دے رہے ہیں، میں کیوں کچھ لکھوں؟ انھوں نے فرمایا: اگر اس بنیاد پر ٹی.سی. دوں گا تو پھر تم کہیں پڑھ نہیں پاؤ گے۔ تمھارے جرم کا جب اندراج ہوگا تو کوئی ادارہ تمھیں داخلہ نہیں دے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ جیسا کہا ہے اسی طرح لکھ کر اپنی زندگی بچالو۔ اندازِ تخاطب مصلحانہ ومشفقانہ تھا۔ میں نے فوراً لکھ کر دے دیا۔ پھر باہر آ کر بیٹھ گیا۔ گھنٹے گذر گئے، مگر مجھے طلب نہیں کیا گیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی سے سمیع بابو لپکتے ہوئے، بلکہ دوڑتے ہوئے اس جانب آ رہے ہیں۔ دراصل ان دنوں وہ اعزازی طور پر ہم لوگوں کا کلاس لیا کرتے تھے۔ جماعت میں مجھے نہ پا کر انھوں نے میرے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ شفیع کہاں ہے۔ ان کو حال سنا دیا گیا۔ اسی وجہ سے وہ بے تحاشا دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ بڑے جلال میں تھے۔ مجھے گھورا اور میرے سلام کا جواب بھی انھوں نے اسی حال میں دیا اور دفتر میں داخل ہوتے ہوئے مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ حضرت مولانا سے بڑی حیرت آمیز لہجے میں زور سے پوچھا: کیا کر رہے ہیں؟ حضرت نے جواب دیا: ٹی.سی.....۔ پھر پوچھا: کیوں؟ جواب میں میری درخواست بڑھا دی گئی۔ سمیع بابو نے ٹی.سی. والی کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور میری درخواست کے پرزے بناتے ہوئے گویا ہوئے: یہ سب نہیں چلے گا۔ یہ لڑکا اسی مدرسے میں پڑھے گا۔ مجھ سے فرمایا: اگر جانے کے بارے میں پھر کبھی سوچا تو ٹانگ توڑ دی جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد طوفان دب گیا اور سنجیدہ گفتگو شروع ہوگئی۔ سمیع بابو مجھ سے مخاطب ہوئے: ٹی.سی. نہیں ملے گی۔ تم یہیں پڑھو گے، البتہ ایک مسئلہ رہ جاتا ہے کہ کھاؤ گے پیو گے کہاں؟ کیا پھر انچل مٹو کے یہاں جاؤ گے؟ اچھا ایسا کرو کہ جب تک کوئی صورت نہیں نکلتی میرے یہاں کھاؤ پیو۔ میں نے جواب دیا: کہیں کسی کے یہاں نہیں جاؤں گا۔ مطبخ میں کھاؤں گا۔ پھر پوچھا گیا: یہاں سے تم کو کھانا کس طرح ملے گا؟ میں نے بتایا: میں ہمیشہ کے لیے مطبخ میں اپنی جگہ مخصوص ومحفوظ کرا چکا ہوں۔ میری اپنی پسند پر ہے کہ یہاں کھاؤں یا کسی دوسری جگہ۔ حضرت نے اس کی تصدیق فرمائی۔ سمیع بابو مجھے اپنی جماعت میں پڑھانے لے گئے اور

یہ باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

ایک بار حضرت میرے گاؤں بسہا تشریف لائے۔ ایک محلے کے دو مسلم فریقوں میں سخت مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری تھا۔ نماز کے بعد مسجد کے سامنے آپ نے دونوں فریقوں میں صلح کرانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ ایک چارپائی لائی گئی۔ اس پر آپ جلوہ افروز ہوئے۔ سامعین اور دونوں فریقوں کے لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔ آپ نے بیانات سنے۔ تلخیاں جھیلیں۔ آخر میں آپ نے ایک مختصر سی تقریر قرآن وحدیث کی روشنی میں کی۔ دونوں فریقوں پر اچھا اثر پڑا اور مقدمہ ختم کرنے کا یقین دلایا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب اردو بولنے کے شوق میں اپنے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال کرتے اور میں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی دبا پاتا۔

حضرت حج کا فریضہ ادا کرنے جب پہلی بار تشریف لے گئے تو طلبہ کی ایک بڑی جماعت گھوگھرڈیہا اسٹیشن تک الوداع کہنے گئی۔ ٹرین کے آنے سے دو گھنٹے قبل پلیٹ فارم پر ایک اچھا خاصا جلسہ منعقد ہوگیا۔ حضرت ایک ایک سے بلا امتیاز گلے ملے اور اپنے ساتھ دعا کے لیے سب کی درخواست ساتھ لے گئے۔ واپسی پر بھی ایک بڑی جماعت بیل گاڑیوں میں گھوگھرڈیہا گئی اور اسی قدر طلبہ گاڑیوں کے آگے، پیچھے اور درمیان میں پیدل استقبال کے لیے جا رہے تھے۔ رات میں ٹرین آئی۔ حضرت سب سے گلے ملے اور کھجور کے ساتھ زمزم کا تحفہ سب کو دیا گیا۔ رات ہی میں روانگی ہوگئی۔ تقریباً رات بھر کا سفر کہا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ پیدل تھے اور مولانا مختار علی کو بھی پیدل چلنے پر مجبور کیا تھا۔ رات بھر ایک بیل گاڑی سے کیلوں کی خوشبو آتی رہی، مگر شکل نظر نہیں آئی۔ طلبہ پر حضرت کا رعب اپنی جگہ، لیکن ان کے دلوں میں ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اسی کا اظہار حج کے لیے روانگی اور حجِ مبرور سے واپسی پر کیا گیا۔ اتنی دور پیدل جانے اور واپس آنے میں بھی ایک خاص خوشی اور ناز کا احساس سب کے دلوں میں موجود تھا۔

حضرت کے واسطے سے ایک بات کا ذکر نہ کرنا شاید مناسب نہیں ہے۔ ان کے ہم نام سعودیہ میں تھے۔ ان کی ایک زوجہ یکہتہ میں تھیں۔ ان کی ایک بیٹی مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھی، غالباً

وسطانیہ دوم میں۔اس بچی پر دوران درس کئی بار جن کے سوار ہونے کا حادثہ ہوا۔ پھر روز کا
معمول ہوگیا تو مجبوراً اس کا مدرسہ آنا بند کردیا گیا۔ایک دو ماہ کے بعد حضرت نے مجھے طلب
فرمایا۔ارشاد ہوا: میرے ہم نام دوست سعودیہ میں ہیں۔جن والا معاملہ ان کی ہی بیٹی کے
ساتھ ہوا ہے۔انھوں نے بضد ہو کر مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کے گھر جا کر اسے تعلیم دوں۔
اب تم ہی بتاؤ مجھ سے یہ کام کیسے ہو پائے گا اور میں کہاں سے وقت نکال پاؤں گا۔تم ایسا کرو
کہ میری جگہ وہاں جا کر تم اسے پڑھا دیا کرو۔تمھارے علاوہ مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا جو اس
کام کو انجام دے سکے۔سمع و طاعت کے علاوہ میں اور کر ہی کیا سکتا تھا۔تعلیم کا سلسلہ گھر پر بھی
چند ماہ سے آگے نہ بڑھ سکا، کیوں کہ وہاں بھی جن موصوف کا آنا جانا شروع ہوگیا۔میں نے
پرکھنے کی کوشش کی۔اس حال میں ایک روز میں نے اسے قلم اور کاغذ تھما دیا اور املا لکھانا شروع
کردیا۔میں حیرت زدہ رہ گیا۔جب اس نے لکھنا شروع کیا تو نظر کہیں اور تھی اور کاغذ پر قلم
چل رہا تھا اور تحریر ابھر رہی تھی۔حد تو یہ ہے کہ تحریر بھی اس لڑکی سے جدا گانہ تھی۔تعلیم روکنی پڑی،
حضرت اپنے دوستوں کی خاطر داری میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے تھے۔

حضرت مولانا ممتاز علی مظاہری مدظلہ العالی کی پوری زندگی تعلیم وتعلم میں گذری۔مدرسہ
رحمانیہ کو انھوں نے اس قدر فروغ دیا کہ دور دور سے تشنگان علم وہاں آتے رہے اور اس چشمۂ
فیضان سے اپنی تشنگی بجھاتے رہے۔جائے وقوع کے اعتبار سے یہ مدرسہ بین الاقوامی حیثیت کا
حامل تھا، کیوں کہ قریب میں ملک نیپال کی سرحد ہے۔وہاں درجۂ حفظ کی اپنی ایک شناخت تھی،
کہا جاتا تھا کہ بکھیتہ گاؤں کی مرغی بھی حافظ ہوتی ہے۔رمضان شریف میں وہاں کے حفاظ دور
دراز کے علاقوں میں تراویح کے لیے پھیل جاتے۔آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، مگر پہلے کی
طرح نہیں۔

ایک حافظ صاحب کا نام میرے ذہن سے فی الحال غائب ہو چکا ہے، ان کو لوگ حافظ
ریل کہا کرتے تھے۔ان کے بیٹے اور پوتے بھی حافظ وقاری۔تو حافظ ریل پر اللہ تعالی کی
رحمتوں کی بارش ہو! ان کے پیچھے نرھیا میں چند سال تراویح کا موقع ملا۔ان کے تمام دانت

ٹوٹ چکے تھے۔جاڑے کا موسم تھا۔دن میں صحن مسجد میں ان کے ساتھ بیٹھتا تو وہ طرح طرح
کے قصے سناتے۔میں قرآن مجید کے صفحات پر نظر رکھتا اور وہ زبانی پڑھتے جاتے۔اسی عمل میں
میں نے ان سے کہا: میں کہیں سے کوئی آیت پڑھوں گا اور آپ کو بتانا ہوگا کہ کس سورہ میں
ہے۔انھوں نے کہا کہ نقل نظامی والا نسخہ سامنے رکھو۔میں سورہ کا نام، صفحہ نمبر، آیت نمبر سب
بتادوں گا اور صفحہ میرے سامنے رکھو گے تو آنکھ بند کر کے اس جگہ پر انگلی رکھ دوں گا جہاں سے تم
نے آیت پڑھی ہوگی۔میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بار بار میں نے کئی روز ایسا کیا اور وہ
حرف بحرف حسب دعوی سب کچھ بتاتے رہے۔

ایک بار کا واقعہ انھوں نے بتایا کہ شکری میں شبینہ کا اہتمام ہوا۔وہ اس وقت بالکل
نوجوان حافظ تھے اور شوق سے وہاں چلے گئے۔نماز عشا کے بعد ضد کی کہ ان کو بھی قرآن مجید
سنانے کا موقع دیا جائے۔بزرگ حفاظ کرام نے سمجھایا کہ بابو تم سے پار نہیں لگے گا، کیوں کہ
پیچھے درجنوں حفاظ ہوں گے اور تم گھبرا جاؤ گے۔وہ پھر بھی بضد رہے۔مجبوراً ان کو یہ سمجھ کر موقع
دیا گیا کہ پہلی رکعت میں چند منٹ کے بعد اتنے لقمے پڑیں گے کہ خود پیچھے آجائے گا۔انھوں
نے امامت سنبھالی اور پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد جو پڑھنا شروع کیا تو انتیس پارے
پڑھ ڈالے اور ایک لقمہ بھی کسی نے نہیں دیا۔دوسری رکعت میں تیسویں پارے کو آخر تک پہنچایا
اور ختم قرآن کا پہاڑا پورا کردیا۔دراصل ان کو ڈر تھا کہ اگر کم پڑھا تو دو رکعت کے بعد حسب
قاعدہ پیچھے آنا ہوگا اور کوئی دوسرا امام بنے گا۔

یہ واقعہ تو ضمناً آ گیا جسے بیان کرنا ضروری معلوم ہوا۔مدرسہ رحمانیہ کو مولانا نے وسطانیہ
پھر فوقانیہ اور اس کے بعد مولوی تک باری باری بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے الحاق دلوایا۔
یہاں تک تو میری موجودگی میں ہو چکا تھا۔اس کے بعد غالباً بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ
سے عالم اور فاضل کے لیے الحاق حاصل کیا۔گاؤں گاؤں بیل گاڑی سے دورے پر جاتے اور
نقد سے زیادہ دھان وصول کر کے لاتے۔جلسے منعقد کرواتے جن میں علاقے کے لوگوں کی
ایسی بھیڑ لگتی کہ گاؤں کے لوگ تنگ آجاتے۔ایسے مواقع پر بھی مدرسہ کے لیے تعاون حاصل

کرتے۔اس طرح انھوں نے اس مدرسے کی آبیاری کی اور دوسری جگہوں سے اچھی سے اچھی پیش کش پر بھی وہاں نہیں گئے۔

جب سبک دوش ہوگئے تو ’’چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی‘‘ کے مصداق انھوں نے اپنی مشغولیت کا رخ پھر مدرسہ کی طرف پھیر دیا۔اپنی زمین پر مدرسۃ البنات قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور قائم کر دیا۔لوگوں سے تعاون بھی لیا اور باقاعدہ عمارت بھی بنا ڈالی۔اس میں بچیوں کی تعلیم کا عمدہ نظم ہے۔میں نے ہنر اور دستکاری کی تربیت کے لیے بھی مشورہ دیا۔رجسٹریشن اور حکومت سے گرانٹ کی بھی بات چلی تھی۔میں نے بھی پچاس روپے ماہانہ کے حساب سے رکنیت کی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا اور کئی برسوں تک پابندی سے دیتا رہا۔پھر کبھی کوئی آیا ہی نہیں اور رقم ادا کرنے کا کسی طرف سے کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا گیا ہے،اللہ تعالی اس مدرسے کو قبول فرمائے تاکہ بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ حل ہوجائے۔یقیناً مولانا کا یہ بھی بڑا کارنامہ ہے۔

صحت مندی کے زمانے میں حضرت ہر سال رمضان مبارک سہارنپور میں گزارنے لگے کئی برسوں تک اپنے ساتھ میرے بہنوئی عبدالخالق مرحوم (اللہ تعالی ان کو جنت الفردوس میں اونچا مقام عطا فرمائے!) کو اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔میرے بہنوئی کے اندر بہت بڑا فرق آ گیا۔ان کا غصہ،ہمیشہ انا میں مبتلا رہنا،بات بات پر جھگڑا وغیرہ جیسی خرابیاں ہمیشہ کے لیے دور ہوگئیں۔ان کے انتقال (انا للہ وانا الیہ راجعون!) پر میں پٹنہ سے بھانپور گیا۔میرے انتظار میں جنازہ روک کر رکھا گیا تھا۔حضرت ایک جیپ بھر افراد کے ساتھ جنازے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔بھانجے کی بیٹی کے نکاح کے موقع پر تو کئی دن تک جلوہ افروز رہے۔اس طرح غم اور خوشی دونوں میں شریک ہونے کا رول حضرت خوب نبھایا کرتے تھے۔وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ان کے رتبے پر کیا اثر پڑے گا بلکہ یہ دیکھتے تھے کہ اگر تعلق میں فرق آ گیا تو گناہ ہوگا۔

بیسویں صدی میں ایک بار کبھی میرے یہاں پٹنہ سیٹی تشریف لائے۔رات میں جب وہ آرام فرمانے لگے تو میں اپنے کمرے میں آ گیا اور ریڈیو پر عربی نشریہ سننے لگا۔آواز بہت دھیمی

تھی پھر بھی ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔حضرت نے وہیں سے لیٹے لیٹے فرمایا:سو جایئے۔فجر کی نماز چھوٹ سکتی ہے۔سویرے سونا کئی اعتبار سے فائدہ مند بھی ہے۔اس کے کئی برسوں بعد تشریف فرما ہوئے تو میں دوسرے محلے میں قیام پذیر تھا۔چند روز قیام رہا۔میں نے ان کو کمپیوٹر سے روشناس کرایا اور اسلامیات سے متعلق کئی چیزیں دکھائیں۔بہت خوش ہوئے۔مجھے اطمینان ہوا کہ اب کمپیوٹر سے دور رہنے کی نصیحت نہیں فرمائیں گے۔اس کے بعد میں کسی اور جگہ منتقل ہو گیا جہاں آج بھی ہوں۔یہاں بھی انھوں نے میزبانی کی خدمت کا موقع دیا۔کمپیوٹر سے تلاوت سماعت فرمائی۔اپنے شناختی کارڈ کا مضمون بھی نکلوایا کہ ڈی.ای.او. سے دستخط کرا لیں گے۔میری شریک حیات،بیٹی اور داماد کو اپنے یہاں یکہتہ آنے کی دعوت دی۔ہمیشہ بیٹے،بیٹی اور یہاں مقیم کسی بھی رشتہ دار کو دیکھتے تو نماز کی تاکید ضرور فرماتے۔تبلیغ کا موقع جہاں مل جاتا وہیں دین کی کچھ باتیں ضرور پہنچا دیا کرتے۔

ایک بار میرے یہاں تشریف فرما تھے۔یکہتہ میں دارالقضا کے قیام کی خوش خبری دی اور مجھے حکم دیا کہ جلسے میں شرکت کرو۔اسی شام ان کے دو شاگرد ملنے بھی آ گئے۔ان دونوں نے مجھ سے دوسرے کمرے میں آ کر لمبی چوڑی گفتگو کی۔انھوں نے اپنی دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ دارالقضا کا قیام کھٹونا میں ہونا چاہیے۔مشرقی مدھوبنی میں ہر جگہ کے لوگ کھٹونا کو مرکز سمجھتے ہیں۔آپ مولانا سے کہیے کہ وہ یکہتہ نہ لے جانے پر رضامند ہوجائیں باقی کام ہم لوگ امارت شرعیہ سے کروا لیں گے۔میں نے ان دونوں کے مقابلے میں کھٹونا کو بسہا سے قریب تر پایا پھر بھی،تعصب ہی سہی،دل ہی دل میں یکہتہ پر اتفاق کیا اور حضرت سے کچھ نہیں کہا۔ان دونوں کی موجودگی میں گفتگو کا رخ دوسرے موضوع کی طرف پھیر دیا جس میں حضرت سے میں نے شدید اختلاف بھی کیا۔وہ دونوں بھی حیرت میں پڑ گئے کہ حضرت سے اس انداز میں بھی گفتگو کی جا سکتی ہے!مگر حضرت نہ تو ناراض ہوئے اور نہ ان کی پیشانی پر بل آیا۔اس موقع پر دوسرے دن حضرت نے مجھے مشورہ دیا کہ فلاں فلان کام کرو اور فلاں فلاں جگہ سے فارم لے کر بھر دو۔میری ہی طرح تم کو بھی صدر جمہوریہ کا ایوارڈ ملے گا۔میں نے

اس کان سے سنا اور اس کان سے نکال دیا۔

آخری ملاقاتوں میں میں نے کبھی التجا، کبھی نرم اور کبھی گرم لہجے میں حضرت سے مطالبہ کیا کہ وہ اب سفر سے بالکل گریز فرمائیں۔ وہ ہمیشہ خاموش رہ کر یا کچھ ٹال مٹول سے کام لیتے اور اگر بولتے تو کہتے: جب کوئی سواری سے لے جاتا ہے اور واپس پہنچا جاتا ہے تو انکار کیسے کیا جاسکتا ہے۔ کئی بار وہ سواری سے گر کر ہاتھ پانو (پاؤں) کی ہڈیوں کو ٹوٹنے کا بہترین موقع دے چکے ہیں۔ اب جسمانی ناتوانی ہے، اس کے باوجود باز نہیں آتے۔ مجھے اب مختار و مشتاق سے کہنا ہوگا کہ جب کبھی طبیعت زیادہ خراب ہوجائے تو چپکے سے ان کے کان میں کہ دیا جائے کہ فلاں جگہ آج شام جلسہ ہو رہا ہے جہاں آپ ہی کو صدارت کی دعوت دی گئی ہے۔ اب وقت بہت کم ہے۔ تیار ہوجایئے۔ یہ سنتے ہی وہ بالکل اچھے ہوجائیں گے اور فرمائیں گے: اور پہلے کیوں نہ جگا دیا تھا۔

پچھلے دنوں (اپریل 2012ء) مختار نے بتایا کہ ابا کی طبیعت بہت ناساز ہوگئی تھی۔ سب لوگ مختلف جگہوں سے آگئے تھے۔ میں بھی اندھرا اٹھاڑی سے گھر پہنچ گیا۔ سب لوگ ان سے مایوس ہو چکے تھے۔ علاج جاری رہا اور اللہ تعالی کے فضل سے اب تندرست ہیں۔ اللہ تعالی حضرت کو اور برسہا برس تک زندہ رکھے! ان کی ذات سے خیر ہی خیر کی امید ہے اور کہیں سے بھی کسی شر کا کوئی خطرہ نہیں دکھتا۔

ایک ممتاز شخصیت

مولانا احسان اختر ندوی مظاہری
(استاذ جامعہ اسلامیہ، مظفر پور، اعظم گڑھ، یوپی)

شمالی بہار کا ایک ضلع مدھوبنی ہے، یہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے، جن میں شیوخ برادری سے تعلق رکھنے والے مسلمان کثیر تعداد میں مختلف قصبات اور دیہاتوں میں آباد ہیں، ان میں دو نام بہت معروف ہیں، ایک ململ اور دوسرا یکہتہ، ان دونوں جگہوں کے مسلمانوں نے دینی اور تعلیمی دونوں میدانوں میں ایک مقام و مرتبہ حاصل کر رکھا ہے، دینی تعلیم کا بہت عمدہ انتظام ہے، عام لوگوں میں دینی رجحان غالب ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء وفضلاء اور حفاظ وقراء کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے، اور اس دینی رجحان اور تعلیمی شعور کا اثر دوسرے دیہاتوں پر بھی ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ اس علاقے میں بعض بڑی شخصیات بھی ابھر کر سامنے آتی رہی ہیں، اور ان کی دینداری، تقوی، اخلاص وللّٰہیت اور تدریسی وانتظامی مساعی سے علاقے کے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچا اور پہونچ رہا ہے، اور انہیں کی محنتوں کا ثمرہ ہے کہ نوجوانوں کی ایک تعداد ملک کے طول وعرض میں مختلف علمی ودینی خدمات انجام دے رہی ہے۔

ان بڑی شخصیات میں حضرت مولانا ممتاز علی صاحب مظاہری حفظہ اللہ ورعاہ کی بھی ذات گرامی ہے، آپ کا تعلق یکہتہ سے ہے، آپ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے فاضل ہیں، مولانا موصوف ایک بزرگ عالم دین ہونے کے ساتھ ہی ایک مدبر اور منتظم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں، مدرسہ رحمانیہ یکہتہ کے عہدہ ادارت کو ایک عرصہ تک سرفرازی بخشی ہے، اور

آپ کی ادارت میں اس ادارہ نے ترقی کے منازل بھی طے کیا ہے۔

راقم سطور نے بچپن سے ہی اپنے گھر اور قصبہ میں اپنے بڑوں کی زبانی مولانا کا ذکر خیر سن رکھا تھا، لیکن دید وملاقات کی سعادت اس وقت نصیب ہوئی جب کہ احقر جامعہ مظاہر علوم میں زیر تعلیم تھا، اور مولانا موصوف رمضان المبارک میں اعتکاف کی نیت سے حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں تشریف لائے، مولانا سے ملاقات ہوئی، ناچیز نے اپنا تعارف کرایا، والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالباقی (۱) صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کا نام لیا، مولانا بہت خوش ہوئے، انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا، والد صاحب سے اپنے گہرے روابط کا ذکر فرمایا، اس کے بعد مولانا کی شفقت ومحبت کی انتہا نہ رہی، ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے دیرینہ تعلقات ہیں اور ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی ہے، یہ مولانا کی خورد نوازی اور والد صاحب سے محبت وتعلق کا نتیجہ تھا۔

عرصہ سے مولانا کا معمول ہے کہ رمضان کا مکمل اعتکاف حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب مدظلہ العالی کے ساتھ جامعہ مظاہر علوم کی مسجد میں فرماتے ہیں، یہ مولانا کا عظیم مجاہدہ ہے، پیرانہ سالی، بُعد مسافت اور موسم کی برودت وتمازت کی پرواہ کئے بغیر پابندی سے ہر سال اعتکاف کی نیت سے سہارنپور تشریف لے جاتے ہیں، اور وہاں کی عبادت وریاضت، اذکار وظائف کی کیفیات کو بیان کرنے کیلئے ایک دفتر چاہیے، اس سے مولانا کے ارادہ کی قوت اور عزم و حوصلہ کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے، عیدالفطر کے بعد مولانا اپنے پیرومرشد کے ساتھ سہارنپور کے قرب وجوار علاقوں کا دورہ کرتے ہیں، مختلف بزرگوں کے مزارات پر تشریف لے جاتے ہیں، اور پھر گھر واپسی ہوتی ہے۔

اس پہلی ملاقات میں ہی مولانا کو قریب سے دیکھنے اور معمولی خدمت کا موقع ملا، گاہے بگاہے مولانا یاد فرماتے، اپنی طالب علمانہ زندگی کے مختلف واقعات سناتے، اور والد صاحب سے تعلقات کا اظہار فرماتے۔

جامعہ مظاہر علوم سے فراغت کے بعد احقر اعظم گڑھ آ گیا، یہاں جامعہ اسلامیہ مظفر پور

میں شعبہ تدریس وتحقیق سے منسلک ہوگیا، اس دوران کئی بار متحدہ عرب امارات کا بھی سفر ہوا اور وہاں طویل قیام بھی رہا، لیکن مولانا مختلف ذرائع سے میری خیریت معلوم کرتے رہے، ایک بار ململ کسی تقریب میں تشریف لائے، عصر کی نماز میرے محلّہ کی جامع مسجد میں ادا کی تاکہ احقر کو ملاقات کا شرف حاصل ہو، یہ مولانا کی تواضع وانکساری تھی، میرے ساتھ غریب خانہ پر تشریف لائے، والد صاحب مرحوم نے مولانا کا والہانہ استقبال کیا، اور مولانا کی اس آمد پر بہت زیادہ مسرت کا اظہار فرمایا، قیام کے لئے اصرار فرمایا، لیکن مولانا نے معذرت کی اور واپس یکہتہ تشریف لے گئے، والد صاحب عمر میں مولانا سے بڑے تھے۔

۲۰۰۷ء میں جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں ایک عظیم الشان مذاکرہ علمی اور جلسہ منعقد کیا گیا، احقر نے مولانا موصوف کو اس اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ارسال کیا، ضعف ونقاہت کے باوجود مولانا نے اس پروگرام میں شرکت کی، سفر کی صعوبتوں کو برداشت کیا، والد صاحب بھی اس موقع پر میرے ساتھ تھے، مولانا نے گھر آ کر والد صاحب سے ملاقات کی، بہت دیر بیٹھ کر دونوں بزرگوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی، اور خوش خوش مولانا اعظم گڑھ سے واپس گئے، اس ملاقات کے چند مہینوں کے بعد ہی والد صاحب کا سانحہ وفات پیش آ گیا، مولانا نے تعزیتی مکتوب کے ذریعہ اپنے صدمہ کا اظہار فرمایا۔

مولانا مدظلہ العالی ایک باعمل عالم دین ہیں، قوم وملت کی خدمت کا جذبۂ وافر آپ کو ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ مدرسہ رحمانیہ یکہتہ کی ادارت سے الگ ہونے کے بعد بھی قوم وملت کی خدمت میں اپنے کو مصروف رکھا ہے، جب کہ عموماً اس مرحلہ میں لوگ آرام راحت اور یکسوئی کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن مولانا نے آرام راحت کو تج کر کے خدمت خلق کو مرتے دم تک قائم رکھنے کا عزم محکم کیا ہے. اور معهد البنات اليعقوبية کے نام سے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا ہے، اور اس کی ترقی کے لئے بے حد کوشاں ہیں۔

مولانا کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہے، اور ان سے بیعت بھی ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث کے خلیفہ وجانشیں حضرت

مولانا محمد طلحہ صاحب مدظلہ العالی نے اجازت وخلافت سے بھی نوازا ہے، جید عالم دین جانشیں امیر شریعت رابع حضرت مولانا محمد ولی رحمانی دامت برکاتہ سے بھی گہرے روابط ہیں، خانقاہ رحمانیہ مونگیر بہار کی نورانی وعرفانی مجالس میں بھی اہتمام سے شرکت فرماتے ہیں، اور تزکیہ واحسان کی منزلوں کو طے کرنے کی سعی کرتے ہیں، اس طرح مولانا نے اپنی ذات کو بھی سنوارا ہے، اور قوم وملت کو بھی سنوارنے کی سعی پیہم کررہے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالی مولانا مدظلہ العالی کی حیات دراز فرمائے، ان کے سایہ کو ہم لوگوں پر تادیر قائم رکھے، ان کے مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

(۱) حضرت مولانا عبدالباقی صاحب ماضی قریب میں ململ کے ایک بزرگ اور جید عالم دین تھے، ۸۳ سال کی عمر میں ۱۹ اپریل ۲۰۰۷ء کو بنارس میں آپ کا انتقال ہوگیا، نعش ململ لائی گئی اور ۲۰ اپریل بعد نماز جمعہ تدفین عمل میں آئی۔

شفقتاں تیری......

محمد علی اختر ندوی

(ریسرچ اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی)

کاکل شب شانۂ دوجہاں پر ابھی بھی بکھری ہے مگر اس کی سیاہی میں بڑی حد تک سپیدئ سحر کے اجالے کی آمیزش ہے، نسیم صبح کی مہربان تھپکیاں......نیند کی دیوی کی دلآویز لوریاں ......اور خوابوں کی حسین وادیاں......علی ......علی......علی بابو!......کوئی مجھے آواز دے رہا ہے؟ ......اس حسین وادی میں مجھے کون پکار رہا ہے؟؟......علی بابو......اٹھیے!......اذان ہوگئی ہے ......ارے یہ تو داداجان کی آواز ہے......اتنی جلدی صبح ہوگئی!!......ابھی تو آدھی نیند بھی پوری نہیں ہوئی......اس سحر خیز طلسم سے باہر آنا کس قدر مشکل ہے، آنکھیں جانتی ہے۔

جب سے ہوش کی آنکھیں کھولیں، داداجان کا یہی معمول پایا......صبح صادق سے پہلے (جب تک جسم وذہن نے ساتھ دیا) بلاناغہ اور بغیر کسی الارم کے نہ جانے کتنی رات گئے بیدار ہونا، معمول کے وظائف واوراد میں مشغول رہنا اور پھر بعد اذان فرداً فرداً ہر چھوٹے بڑے کو نماز کے لئے بیدار کرنے کے بعد ہی مسجد کے لئے نکلنا......

کہتے ہیں کہ دادا کو پوتے سے خاص انسیت بلکہ والد سے بھی زیادہ محبت ہوتی ہے، مجھے اس پر فخر ہے، داداجان کو مجھ سے بہت زیادہ انسیت، اور مجھے ان کی بے پناہ شفقتیں حاصل رہیں، تعلیم کا جو بھی ادنی سا ذرہ میرے دامن میں ہے وہ انہی کی محبتیں، دعائیں اور شفقتیں ہیں۔

بلکہ آج یکہتہ اور علاقہ میں علم کی جو صبح روشن ہے اور تعلیم کی جو مشعلیں اور قندیلیں علم و معرفت کی کرنیں پھیلا رہی ہیں، ان سب میں ان کا ہی لہو شامل ہے، اس گلستاں میں علوم و

معرفت کے گل ولالہ کی جو بھینی خوشبو اور اس علاقہ کا جو علمی وقار ہے وہ انہی کی جگر کاویوں اور بے لوث کوششوں کا ثمرہ ہیں، ان کی ہی دینی دردمندی اور تڑپ تھی کہ یکھتہ کو کتنی بار وقت کے بزرگانِ دین، اولیاء اللہ اور بڑے علماء کرام کی قدمبوسی کی سعادت حاصل ہوئی اور روحانیت کا انعام حاصل ہوا۔

ان کی یہی دردمندیاں ہیں کہ آج بھی پیرانہ سالی اور ضعف قویٰ کے باوجود، وہ ہر دعوت خیر کے لئے تیار اور آمادہ ہیں، کسی مسجد کی سنگ بنیاد ہو یا پھر کسی مدرسہ کی تاسیس، کوئی دینی جلسہ ہو یا کوئی ملی اجتماع، وہ سفر کی مشقت برداشت کرنے کو راضی، چاہے سردی کی کپکپا دینے والی رات ہو یا چلچلاتی دھوپ۔

ان کی بے لوثی اور دینی جذبہ ہی ہے کہ انہوں نے شفیع مسلم ہائی اسکول کی نوکری پر مدرسہ رحمانیہ کی خدمت اور دینی علوم کی نشرواشاعت کو ترجیح دی اور پھر اس کے لئے اپنی پوری زندگی وقف اور اپنی ساری کوششیں صرف کردیں، ان کی بے لوثی اور اخلاص اگر نہ ہوتا تو شاید مدرسہ رحمانیہ کی شاندار عمارت اور اس سے بھی اہم اس کی علمی شہرت اور خدمات کی جگہ، مولانا ممتاز علی صاحب کے پاس شاندار محل نما گھر اور زندگی کی ساری آسائشیں مہیا ہوتیں۔

مگر......ان کی پوری زندگی اور ساری جگر کاویوں کا جو صلہ انہیں ملا وہ جفا کار تاریخ کا ہمیشہ سے طرہ امتیاز رہا ہے، گرچہ بہت سے لوگوں کو اس کا احساس بھی نہ ہوا......وہ چمن زار جس کے پھولوں کی ہر ہر پتی میں ان کے خون جگر کی خوشبو، اور ہر ہر بوٹہ میں ان کی عمر ہائے دراز کی جگر کاویوں کی تپش شامل ہے، ان سے بیگانہ ہو گیا، طوطا چشمی پر اتر آیا ع

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

داداجان کو اس کی نہیں، اس کو داداجان کی ضرورت تھی، مگر شاید خلوص کی کوئی قیمت نہیں، یا ان کے سخت انداز، ڈسپلن اور تعلیم وتربیت کے طریقۂ کار کو برداشت کرنے کا آزادی پسند لوگوں میں یارانہ رہا ہو، انہیں بڑے احترام کے ساتھ ان کی سبکدوشی کی سوغات کے ساتھ

الوداع کہہ دیا گیا، ان کا کیا فائدہ اور نقصان ہوا یہ سب پر عیاں ہے۔

دادا محترم ہمیشہ سے ڈسپلن کے معاملہ میں بہت سخت رہے، دوران تدریس ان کی سختی اور سخت تربیتی انداز کے واقعات سننے میں آتے رہے، لیکن میرے لئے وہ ہمیشہ ہی مشفق ومہربان رہے۔

حصول علم کے لئے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ان کی دعائیں اور شفقتانہ نصیحتیں......' 'بسلامت روی وبازآئی'......''بسفر رفتن مبارکباد''''نماز کی پابندی کیجئے گا''''روزانہ صبح دو پارے قرآن کا معمول رکھئے گا'' اور ''اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہئے گا''

سفر سے واپسی پر والہانہ استقبال اور دعائیں......موقع بہ موقع ان کی محبتانہ سرزنش، فہمائش، ہدایتیں، اور نصیحتیں، خاص طور سے بار بار درج ذیل اشعار پڑھنا اور پھر ان کی روشنی میں نصیحتیں کرنا:

شکوت الی وکیع سوء حفظی
فاوصانی بترک المعاصی
فان العلم نورمن الہ
ونور اللہ لا یاتی لعاصی

اور

لیس الجمال باثواب تزیننا
ان الجمال جمال العلم والادب

یہ اشعار میں نے کہیں پڑھے نہیں بلکہ انہیں سے سنتے سنتے مجھے یاد ہو گئے۔

ان کی دعائیں، محبتیں، پدرانہ شفقتیں، مشفقانہ نصیحتیں، مخلصانہ سرزنش، اور ہدایتیں ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ اور میرے دل ودماغ میں خوشبو کی طرح بسی، اور میرے لئے تاعمر حرز جان رہیں گی، اللہ سبحانہ تعالیٰ تادیر ان کی محبتوں، شفقتوں اور دعاؤں کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔ آمین!

تعلیمی وتدریسی خدمات ،علوم ومعارف کی نشرواشاعت ،خلوص وللّٰہیت اور بے لوثی
وبے نفسی کے حوالے سے آج جونام وعزت،علاقے میں اور علمی حلقوں میں داداجان کی
شخصیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے،عزت واحترام کے اس مقام پر پہونچنے
میں یقیناًان کی بہت سی خصوصیات کارفرما ہوں گی،مگرمیری نظرمیں ان کی سب سے بڑی
خصوصیت ان کی قوت ارادی ہے،ایک بارداداجان جب کسی چیز کا فیصلہ کرلیتے ہیں تو ان کو
روک پانا بہت ناممکن ہی ہوتا ہے،میں نے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کی مضبوط
قوت ارادی کو بہت اچھی طرح محسوس کیا ہے،ورنہ شاید ناممکن ہی ہوتا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد
کسی مدرسہ کی بنیاد ڈالنے کی بات سوچتے،ان کی مضبوط قوت ارادی ہی ہے کہ انہوں نے نہ
صرف ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی بلکہ اسے ایک جیتی جاگتی حقیقت کی شکل میں کھڑا بھی کردیا جو
ان کی پیرانہ سالی اور ناتوانی کے باوجود ترقی کی جانب گامزن ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مدرسہ رحمانیہ کے شاندار ماضی کی تشکیل اور شہرت کی تعمیر میں بھی ان کی
قوت ارادی کی مضبوطی شامل رہی ہوگی،ورنہ مخالفتوں اورریشہ دوانیو ں کی یلغار میں
سراٹھانا تو دور سر چھپانا بھی مشکل ہوتا ہے،چہ جائیکہ نہ صرف خود سراٹھا کر چلنا بلکہ پورے علاقہ
کا سرفخر سے بلند کردینا۔

ان کی یہ قوت ارادی ان کی معاشرتی یا گھریلو زندگی کا بھی اٹوٹ حصہ پہلو رہا،کئی باران
کے کچھ فیصلے گھروالوں کیئے لئے پسندیدہ نہ رہے ہوں اوران کے سامنے ناپسندیدگی کا
اظہار بھی ہوا ہو،لیکن ان کی قوت ارادی کسی بھی ناپسندیدگی سے بالاتر ہی رہی،اوراسی قوت
ارادی کے ساتھ انہوں نے اپنی تمام اولاد کے گھر بھی بسائے۔

داداجان کا ہمیشہ سے عداوت پسندی اور کینہ توزی سے خالی رہا،بدخواہی اور حسد سے وہ
کوسوں دور رہے،میں نے کبھی انہیں کسی کی عیب جوئی کرتے نہیں سنا،کسی کے ساتھ ذاتی
مفاد کے لئے بحث وتکرار کرتے بھی نہیں پایا،دشمنی میں کسی کو برا بھلا کہتے نہیں دیکھا،تیرالزام،
سنگ دشنام اپنے دل پر سہا مگر کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔

گھروالوں کوان سے یہ شکایت رہی کہ ان کے گھر والے اور بچوں کو ان کی زیادہ توجہ نہیں
ملی،حقیقت یہی ہے کہ ان کی زندگی کے بیشتر اورگراں قدر اوقات مدرسہ رحمانیہ کی تعمیر وترقی
یا پھر علاقے کی تعلیمی واصلاحی خدمات میں گزرے،اور شاید گھر میں وہ اتنا وقت دے پائے،
گھروالوں کی جتنی ضرورت تھی،مگر اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ انہوں نے گھر یا اپنی
اولاد کی تعلیم وتربیت سے غفلت برتی،انہوں نے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی اتنے ہی وقت میں
جتنا وہ اپنی علمی،تدریسی اوراصلاحی مصروفیات سے نکال پاتے ہیں،ان کی اچھی تعلیم وتربیت کا
انتظار کریں اورزندگی میں انہیں ایسے مقام تک پہونچادیں جہاں وہ کسی کے دست نگر نہ
ہوں،اس کے باوجود کبھی کبھی وہ رو پڑتے ہیں اور نہ صرف اپنے بیٹے بیٹیوں بلکہ اپنے پوتے
اور پوتیوں سے کہنے لگتے ہیں معاف کردینا تاکہ اللہ کے یہاں میری پکڑ نہ ہو،نہ صرف اپنی
اولاد بلکہ اپنی اولاد کی اولاد اوران کی بھی اولاد کی فکر کرنا اوران کی خبر لیتے رہنا ان کے جذبہ
ہمدردی اور رقیق القلبی کا عکاس ہے۔

اللہ نے انہیں کثیر العیال بنایا ہے،ان کی صلب سے تین بیٹے اور پانچ بیٹیوں سے سات
پوتے،بارہ پوتیاں،دس نواسے اور بارہ نواسیاں ابھی باحیات ہیں،اور چونکہ اللہ داداجان کو
عمر دراز کی نعمت دی ہے،ان کی پوتیوں اور نواسیوں کی اولاد ہی نہیں نواسیوں کی اولاد کی اولاد
بھی اس دنیا میں آچکی ہیں،اس طرح گویا انہوں نے اپنے بعد کی چار پشتیں دیکھیں ہیں،ابھی
بھی جبکہ ان کی یادداشت بہت حد تک کمزور ہوچکی ہے،وہ سبھی کو پہچانتے ہیں یا تھوڑی سی یاد
دہانی سے پہچان جاتے ہیں،اورخبرگیری کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالی تادیران کا سایہ ہم پر فگن رکھے۔آمین!

منظوم خراج عقیدت

شفیع الرحمٰن شفیع

عالم ، فاضل ، دانشور مولانا ممتاز علی　　ملت کے قائد ، رہبر مولانا ممتاز علی

روشن و واضح شخصیت ، سیدھی سادی ذہنیت　　اسلامی کردار کے پیکر مولانا ممتاز علی

تعلیم و تدریس کا پیشہ ، تحریک وتبلیغ ہمیشہ　　رات میں چاندتو دن میں نیر مولانا ممتاز علی

قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں ،شہروں شہروں ،ملکوں ملکوں　　شہرت ہر جا،عزت ہر گھر مولانا ممتاز علی

اہلِ سنت میں حنفی ، فکرِ دین میں دیوبندی　　تبلیغی تحریک میں اخگر مولانا ممتاز علی

دردر درِ ملت میں، گھر گھر دین کی خدمت میں　　آتے جاتے رہتے اکثر مولانا ممتاز علی

رحمانیہ دل کی دھڑکن ، علم کا گہوارا گلشن　　خونِ جگر سے کیا تناور مولانا ممتاز علی

قرآن وسنت کا چرچا کرتے رہتے ایں جا آں جا　　عمر گزاری گھر اور باہر مولانا ممتاز علی

گھر میں بھی خوش حالی تھی، کھیتوں میں ہریالی تھی　　بہتوں سے حالت میں بہتر مولانا ممتاز علی

دنیا کھیتی جنت کی ،زندوں جیسی محنت کی　　وقت پہ حاضر رب کے گھر مولانا ممتاز علی

ہر بچی ہر گھر کی پڑھ لے،علم سے اپنا دامن بھر لے　　اس مشکل کو کر ڈالا سر مولانا ممتاز علی

یعقوبیہ مدرسہ کھولا علم کا رس کانوں میں گھولا　　نعرۂ تکبیر اللہ اکبر مولانا ممتاز علی

بچوں کی تربیت بھی کی،سب پر دل سے محنت بھی کی　　فخر سے سب کے اونچے ہیں سر مولانا ممتاز علی

شاگردوں کی گنتی مشکل،ان میں اب نسلیں ہیں شامل　　اتنے سہرے ، تنہا سر مولانا ممتاز علی

جود وسخاوت میں آگے، مہر ومروت میں آگے　　خوبی ، نیکی دفتر مولانا ممتاز علی

آیتِ قرآں جستہ جستہ، رب کی یاد سے دل وابستہ　　پاک حدیثیں بھی تھیں ازبر مولانا ممتاز علی

حب رسول میں حب الٰہی، دل کوتھی پوری آگاہی　　تقویٰ کی خاطر آنکھیں تر مولانا ممتاز علی

ہو نہ کسی کی حق تلفی ، رب سے نہیں کچھ بھی مخفی　　اچھے مدرس، باپ اور شوہر مولانا ممتاز علی

قد پہلے سے اونچا تھا ، کافی لمبا سایہ تھا　　اب یہ سایہ اطول بڑھ کر مولانا ممتاز علی

غفلت بھی ہوتی ہوگی ، عجلت بھی ہوتی ہوگی　　رہتے اوسط راہوں پر مولانا ممتاز علی

چاہے یہ دنیا کھو جائے، رب ان سے راضی ہو جائے!　　درجہ ملے جنت میں برتر! مولانا ممتاز علی

علم و دانش کا گہوارہ۔ یکہتہ

منظوم تاثر

{جناب رفیق انجم صاحب دربھنگہ کے ادبی حلقہ میں ایک معروف و معتبر نام ہے، آپ شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں، آپ کی غزلوں کا مجموعہ 'ساحل بولتا ہے' جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے، پروفیسر سلطان احمد صاحب کے ذریعہ آپ کو اس کتاب کی خبر ملی تو آپ نے یکہتہ سے متعلق اپنے احساسات کو ایک نظم کی شکل دی، جسے ان کے شکریہ کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں}

گاؤں یکہتہ کہ جو اطراف میں مشہور ہے — فرد فرد اس گاؤں کا خوشحال ہے
علم و دانش کا وہ گہواہ ہمیشہ سے رہا — مایۂ تعلیم کا دلدادہ ہر چھوٹا بڑا
ڈاکٹر انجینئر اور عالم و فاضل ہوئے — اپنے اپنے علم و فن میں سب کے سب کامل ہوئے
حافظ و قاری، ادیب و شاعر و مضمون نگار — زندگی کے مختلف میدان میں ہیں بے شمار
ایک پر کیا منحصر دو ہیں مدارس گاؤں میں — علم کے طالب پڑھا کرتے ہیں جن کی چھاؤں میں
بچپنے میں ہم یہ سنتے تھے بزرگوں کا بیاں — حافظ قرآن ہوتی ہیں وہاں کی مرغیاں
ان کے علم و آگہی سے ہی بدلتا ہے سماج — اس لئے تعلیم نسواں کا ہے مدت سے رواج
اپنی تہذیبی روایت کو بھلا پاتی نہیں — ایک بھی عورت کوئی دن میں نظر آتی نہیں
دور حاضر میں تعجب خیز ہوگا انکشاف — یہ حقیقت پر مگر مبنی ہے کیجئے اعتراف
اتنا مستحکم ہے اب تک اتحاد باہمی — گاؤں میں داخل نہ ہو پاتی کوئی پولس کبھی

گاؤں کے افراد میں وقعت جہیزوں کی نہیں — شادیوں میں آج تک لعنت جہیزوں کی نہیں
وقت کے اہل نظر اس خاک سے پیدا ہوئے — ان گنت لعل و گہر اس خاک سے پیدا ہوئے
ہے مثال اک سامنے تصنیف کی دہلیز پر — نوجواں اہل قلم ندوی منور جلوہ گر
صفحۂ قرطاس پر تاریخ ندوہ آ گئی — ہے منور کی سراسر کاوشوں کی روشنی
عورتوں کے جب مسائل پر قلم ان کا اٹھا — خوب تر علمی بصیرت کا ثبوت اس سے ملا
گلستاں فکر میں غنچہ نیا کھلتا رہے — روز افزوں ہے دعا زور قلم بڑھتا رہے
تذکرہ جس شخصیت کا ہے میرے پیش نظر — آپ سے ان کا تعارف بھی کرا دوں مختصر
نام ہے سلطان احمد صورت مہتاب ہیں — جو اسی دھرتی کے پروردہ در نایاب ہیں
عبدغفار آپ کے والد کا ہے اسم شریف — کہتے ہیں اخلاق میں ان کا نہ تھا کوئی حریف
اور شائستہ کہ جن کو خلق کی کہیے دھنی — حضرت سلطان احمد کی شریک زندگی
ان کے نانا عبدالحق بڑے بارعب تھے — اس علاقے کی ہر اک بستی میں ان کے دبدبے
والدہ محمودہ سے کچھ تربیت ایسی ملی — کشتی عمر رواں ساحل کی جانب بڑھی
کالج اور اسکول کی جب ڈگریاں لے کر بڑھے — یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی ہوئے
شہر دربھنگہ کے اک کالج میں آپ استاد تھے — قصر اردو کے وہاں دروازۂ فولاد تھے
تا کہ اس شیریں زباں کی اور بھی تشہیر ہو — اپنی نگرانی میں کرایا پی ایچ ڈی تین کو
فکر و فن کے سلسلہ میں دو کتابیں بھی لکھیں — شہرتیں جن کی شبستان ادب میں خوب تھیں
جتنے لکھے ہیں مضامیں سب رسائل میں چھپے — حلقۂ احباب سے تحسین کے ہدیے ملے
بولتے ہیں جب دہن سے پھول کی خوشبو ملے — اور سننے والوں کو سرمایہ اردو ملے
اب سبکدوشی کی راحت ہے میسر آپ کو — تندرستی کی بھی نعمت ہے میسر آپ کو
رہتے ہیں تیار دادخواہی کے لئے — بیکس و مجبور کی حاجت روائی کے لئے
غمزدوں پر دیر تک سلطان کا سایہ رہے — تا کہ ان سے فیض کا یہ سلسلہ چلتا رہے

۱۔ میر انیس بحیثیت رباعی نگار ۲۔ فراق گھورکھپوری کی غزل گوئی

مصنف کتاب۔ مختصر تعارف

نام : منور سلطان

ولدیت : محمد بشیر احمد

پیدائش : ۱۰ر فروری ۱۹۷۹ء

مقام : بشنپور، یکہتہ، مدہوبنی

ابتدائی تعلیم : مدرسہ اسلامیہ طوفانپور، مدھوبنی، بہار

ثانوی تعلیم : مدرسہ چشمۂ فیض ململ، مدھوبنی، بہار

اعلیٰ تعلیم : دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

عالمیت: ۱۹۹۹ء، فضیلت (اختصاص فقہ) ۲۰۰۱ء

تربیت افتاء وقضاء : المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

موجودہ مشغولیت : رفیق علمی، دارالافتاء، دارالعلوم ندوہ العلماء، لکھنؤ

تصنیفات : ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابناء ندوہ کی فقہی خدمات

: خواتین کے شرعی مسائل، قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں

: فقہ اسلامی کے مصادر، مختصر تعارف

ترتیب وتحقیق : فتاوی ندوۃ العلماء (جلد اول)

ترتیب : تدوین فقہ اور چند اہم فقہی مباحث

(مضامین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

: فقہ اسلامی اور عصر حاضر (مضامین حضرت مولا سید محمد رابع حسنی ندوی)

: ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم (مضامین مولانا امین الدین شجاع الدینؒ)

: رسالہ 'مروہ' لکھنؤ (اکیسویں صدی میں مسلمانوں کا تعلیمی لائحہ عمل نمبر)

زیر طبع : روبرو (انٹرویوز کا مجموعہ، از: مولانا امین الدین شجاع الدینؒ)